حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں

عصمت اللہ شاہ

Scanned with CamScanner

حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں

عصمت اللہ شاہ

حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں

مرتب

عصمت اللہ شاہ

یکے از مطبوعات

ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ ملتان

کتاب: حفیظ خان کی تخلیقی جہتیں
مرتب: عصمت اللہ شاہ
اشاعت: مئی 2010ء
قیمت: 350روپے
ناشر: ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ ملتان
drawar_1@yahoo.com

انتساب

اُن دیوانوں کے نام

جو اپنا ''آج'' اِس دھرتی کے ''کل'' کے لیے

قربان کرتے چلے آ رہے ہیں

تقسیم کار

سانجھ پبلی کیشنز
سیکنڈ فلور، مفتی بلڈنگ 17/31 ٹمپل روڈ لاہور فون: 042-7355323,7323950
بیکن بکس
گل گشت کالونی ملتان فون: 061-6520790-6520791
ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ
62/B نئی سلطان کالونی، سورج میانی ملتان 061-8148484

یہ ایڈیشن محکمہ اطلاعات و ثقافت حکومت پنجاب کی معاونت سے شائع کیا جا رہا ہے

فہرست

حفیظ خان بحیثیت ڈراما نگار

اردو مضامین

سرائیکی مضامین

حفیظ خان بحیثیت شاعر

حفیظ خان بحیثیت کالم نگار

حفیظ خان بحیثیت نقاد

انٹرویوز

تاثرات

متفرقات

English Articles

بات گو ذرا سی ہے......

حفیظ خان ایسی ہمہ جہت شخصیت کے تخلیقی اوصاف اور اُن کی ادبی خدمات پر اب تک لکھے گئے مضامین، اُن کے انٹرویوز، نقد ونظر اور اُن کی کتب پر تبصروں کو یکجا صورت میں شائع کئے جانے کی ایک عرصہ سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ لیکن گذشتہ اڑتیس برسوں پر محیط اِس کام کو عملی شکل دینا کسی طور پر بھی سہل نہیں تھا، خاص طور پر جب ہمارے ہاں نہ تو اجتماعی لحاظ سے تحقیقی شعور اپنی بنیادیں قائم کر سکا ہو اور نہ ہی شخصیات اور اُن کے فکر وفن سے استفادے کا چلن پنپ سکا ہو۔ اِس نوع کے امور کی حساسیت اُس وقت کئی گنا بڑھ جاتی ہے کہ جب زیرِ بحث لائی گئی شخصیت نے اپنے کمالِ فکر وفن سے نہ صرف ایک سے زیادہ اصنافِ ادب کی کئی حوالوں سے آبیاری کی ہو بلکہ اپنی انفرادیت کے اعتبار سے منصۂ ادب پر انمٹ نقوش مرتب کرنے کا باعث بھی ہو۔

پیشے کے لحاظ سے بھی اگر چہ حفیظ خان نے کئی شعبے اختیار کئے؛ انہوں نے وکالت کی، ریڈیو پاکستان میں پروگرام پروڈیوسر رہے، یونیورسٹی میں قانون پڑھایا، سی ایس ایس کے بارھویں کامن کورس میں ملازمت کی پیشکش کو قبول نہ کیا اور پی سی ایس ایگزیکٹو کرنے کے بعد اکسائیز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر ہو گئے لیکن آخر کار عدلیہ میں منصفی کو ہی اپنی منزل بنایا مگر اِس دوران اُن کا معتبر حوالہ ادب، ادب اور صرف ادب ہی چلا آ رہا ہے۔ اپنی طبع کے پس منظر میں حفیظ خان کا فن کئی آہنگ رکھتا ہے۔ کالم نگاری، ڈراما نگاری، شاعری، فکشن، تحقیق وتنقید، ترجمہ اور تاریخ ان کے قابلِ ذکر حوالے ہیں۔ حفیظ خان کا شمار سرائیکی ڈرامے اور کہانی کے متقدمین میں ہوتا ہے۔ وہ ڈرامے اور کہانی کی روایت کو نئے پیراہن سے یوں مزین کرتے ہیں کہ ان کا لب ولہجہ زندگی سے قریب تر نظر آتا ہے۔

انتہائی درجے کا مشاہداتی شعور انہیں دیگر تخلیق کاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ان کے تخلیقی سفر کی طویل جدوجہد میں معاشرتی ناہمواری اور طبقاتی منافرت کے پس منظر میں عورت سے کی جانے والی ناانصافیوں کا بیان مقامیت سے فزوں تر ہو کر آفاقیت سے جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ان کی نثری اصناف میں زمیں زاد ہونے کا احساس، تجسس کی گیرائی اور واقعات کی بُنت کا فطری شعور ان کی ذہنی بیداری اور وطن پرستی کو واضح کرتا ہے۔اسی طرح اِن کے تنقیدی رویے شعور اور لاشعور کے تانوں بانوں سے تاریخ کی تفہیم کو احساس کی ایک نئی رداعطا کرتے ہیں۔

تحقیق کا بنیادی مقصد بڑے ادیبوں اور ان کی ادبی خدمات کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہوتا ہے جو پوری طرح سے ادبی منظر نامے میں جلوہ نما نہیں ہو پاتے۔میرے نزدیک حفیظ خان وہ تناور شجر ہیں جس کی شاخیں ادب کے مختلف دھاروں کی شکل میں موجود ہیں۔انہوں نے ادب کے حوالے سے بیدار مغزی کے ساتھ متنوع اور گرانقدر خدمات سرانجام دینے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے جہاں کامیابیاں اور کامرانیاں اُن کی منتظر رہتی ہیں مگر ایسی انفرادیت کے ساتھ جو شاذ ہی اہلِ علم کا نصیب بنتی ہیں۔میری یہ دیرینہ خواہش رہی کہ میں حفیظ خان کے فکری اور فنی پہلوؤں کو تنقید کے پیرا ہن میں ادب شناس اور ادب پرور حلقوں تک پہنچا سکوں۔یوں ان کی تخلیقات پر جتنا کام ہوا اور جو کچھ لکھا گیا، اُس میں سے دستیاب مواد کو مجتمع کر کے کتابی شکل میں ایک مرتب کی حیثیت سے پیش کرنا میرے لیے اعزاز تو ہے ہی، میری اُس خواہش کی عملی تعبیر بھی ہے۔اس حوالے سے جاوید اختر بھٹی، رفعت عباس، شمیم عارف قریشی، ڈاکٹر نواز کاوش اور عاصم ثقلین دُرانی نے جس محبت اور خلوص سے کتاب کے مختلف مراحل میں میری معاونت فرمائی اُس کا شکریہ مجھ پر لازم ہے۔

حفیظ خان جیسے بڑے تخلیق کار کے فنی سفر کی رنگ رنگ ساعتیں کئی جہتوں میں منعکس ہوتی ہیں اور یہ سفر یقیناً آنے والے دور کے ناقدین اور محققین کے لیے فکر وفن کے کئی در وا کرے گا۔مجھے امید ہے کہ حفیظ خان کے فکری سفر اور شخصی و تخلیقی جہتوں پر کام کرنے والے ہر محقق کے لیے یہ کتاب ایک سنگِ میل ثابت ہوگی۔

عصمت اللہ شاہ
لیکچرر شعبۂ سرائیکی
گورنمنٹ ایس۔ای۔کالج، بہاول پور
0300-6809357

حفیظ خان بحیثیت کہانی کار

(اردو مضامین)

حفیظ خان صاحب کا منفرد اسلوب و انداز میں تحریر کردہ افسانہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ اگر اِسے موجودہ اور گذشتہ ادوار کے نمائندہ افسانوں میں مِلا دیا جائے تو بھی ''منشا اور میاں منشا'' اپنے انگ، رنگ اور ڈھنگ سے فوراً پہچانا جائے۔ لگتا ہے مختصر افسانہ ابھی زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ رطب ویابس سے پاک، نپے تُلے اور انوکھے طرزِ فکر کا حامل افسانہ، جس کا انجام 'او ہنری' کی طرح چونکا دینے والے ایک زبردست مگر خوشگوار جھٹکے پے ہوتا ہے۔

(عزیز میرٹھی)

ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور/اپریل 2005ء

یہ جو عورت ہے......ایک تاثر

منشایاد

حفیظ خان ایک راست فکر اور حقیقت پسند کہانی کار ہیں اور ایک ایسے حقیقت نگار، جو اپنے مشاہدے اور تجربے کو کسی طرح کی ملاوٹ کے بغیر پوری سچائی اور جرات کے ساتھ پیش کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

پہلی کہانی پڑھ کر اس سونتی ہوئی تلوار ایسے کتاب کے عنوان کے لفظی تیوروں کو دیکھ کر مغالطہ ہو سکتا ہے کہ شاید وہ بھی عورت کو مرد کے مقابلے میں کم تر درجے کی مخلوق سمجھنے والوں میں شامل ہیں مگر ایسا نہیں ہے۔ انہوں نے کہانیوں میں بنت حوا کے رویوں بہروپوں کے تجزیاتی مطالعے ضرور پیش کیے مگر ساتھ ہی آدم کے بیٹوں کا اندر باہر بھی کھنگال ڈالا۔ دراصل انھوں نے زندگی اور انسان کو جیسا جیسا پایا ویسا ہی اپنی کہانیوں میں بیان کرتے رہے اور آپ جانتے ہوں گے انسان کے لیے کوئی ایک سانچا اور فارمولا نہیں بنایا جا سکتا۔ جتنے طرح طرح کے آدمی اتنے ہی متنوع انسانی رویے اور اتنی ہی رنگا رنگ کہانیاں۔ آیئے تھوڑی دیر کے لیے حفیظ خان کی کہانیوں کی ہری بھری فصلوں کے اندر سے ہو کر گزرتے اور ان کی خوشبو سونگھتے ہیں۔

بے شک پہلی کہانی ''کس کے ساتھ'' ایک ظالم اور بے وفا عورت ریحانہ کے گرد گھومتی ہے جو

شوہر سے اپنے آشنا کے قتل کا بدلہ لیتی ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے اس مجموعے میں ایسی بے وفا بیوی کوئی دوسری نہیں ہے اور ہماری سوسائٹی بھی ایسی عورتیں جن کی سرشت میں بدی، جرم اور بے وفائی ہو، بہت ہی کم ہیں۔ لیکن ریحانہ ''غیرت'' کے بھائی سے زیادہ کٹھور اور ظالم اور ''باری باری سرکار'' کے ڈاکٹر مرزا سے زیادہ بے غیرت اور بے وفا ہے۔ اور ''حاصل جمع'' کی شہلا میں تو بس اتنی سی خرابی نکلی کہ اس کا چائے بنانے کا بچگانہ طریقہ ذوق سلیم پر گراں گزرتا تھا مگر وقت نے اسے بھی بری کر دیا۔'' آٹے کی عورت'' کی رضیہ آپا اگر اپنی نسائیت کی حفاظت نہیں کر پاتی اور جذبات کے طوفان میں بہہ جاتی ہے تو ''بزدل'' میں اسی کردار کی ایکس ٹینشن یا بدلی ہوئی صورت شمسہ لوہے کی عورت ثابت ہوئی اور سارا دھونا دھو دیا۔

بے جوڑ شادی، بدصورتی اور بیوی کا عمر میں بڑی ہونا کئی ایک کہانیوں کا موضوع ہے۔ چندے آفتاب، چندے ماہتاب حسیناؤں سے اردو شعر و ادب پٹا پڑا ہے۔ حالانکہ عورتوں کی اکثریت بد صورت اور نا قابل قبول ہوتی ہے اور بعض دانشوروں نے عورتوں کی بدصورتی کو عذاب اور بدقسمتی قرار دیا ہے۔ مگر اس اہم اور دلچسپ موضوع پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ حفیظ خان نے اس موضوع پر کرداروں اور ماحول کی تبدیلی کے ساتھ کم از کم چار کہانیاں لکھی ہیں اور نہایت خوبی سے بتایا ہے کہ بد صورت عورتوں کے اپنے دل پر کیا گزرتی ہے اور ان شوہروں پر کیا بیتتی ہے جو کبھی ملازمت بچانے کی خاطر، کبھی خاندانی دباؤ میں آ کر اور کبھی تقدیر کا لکھا سمجھ کر گلے میں پڑا ڈھول بجانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان کے ایسے شوہروں میں ''حاصل جمع'' کا واحد متکلم، ''جنت حور قصور'' کا مولوی عبدالقدوس ''تن من سیس سریر'' کا جام مراد اور ''مائی بڑھیا کا گھوڑا'' کا مرکزی کردار شامل ہیں۔ (افسانوں کے عنوانات کا صوتی اور معنوی آہنگ قابل داد ہے) لیکن جام مراد اِن سب شوہروں میں سب سے زیادہ نامراد نکلا۔ جب کے وہی تعویز دھاگے جو وہ دوسروں کو سنگدل محبوب کو بلانے کے لیے دیتا تھا اپنی ادھیڑ عمر کی پلپلے جثے والی بیوی کو کالی بلا جان کر دفیعے کے لیے برتنے لگا۔ مگر دعا کی قبولیت سے بھی اس کے دلدر دور نہیں ہوئے بلکہ دکھوں اور محرومیوں میں اضافہ ہو گیا۔ اس کا ذہن بدصورتی کی آگ سے ایسا جھلس گیا تھا کہ آگ بجھ جانے اور ویمن ہوسٹل کی اپسراؤں کے دیدار و تصور کی نت نئی

برساتوں کے بعد بھی دوبارہ ہرانہ ہوسکا۔ محرومی نے اسے ندیدہ اور حریص بنادیا اور جب اس کے ہاتھ میں جنبش ہے نہ آنکھوں میں دم، وہ تب بھی ساغر و مینا کی طرف سے غافل نہیں۔ بھلا ہو کہانی کار کی دردمندی اور فنی شعور کا جس نے اس کو مزید کسی امتحان میں نہ ڈالا۔ اپنے کردار سے ایسی ہی ہمدردی ایک سچے فنکار کی نشانی ہے۔

'قابل' 'دھوپ دیوار' 'لاہور جان' 'غیرت' اور 'اُلو' بھی بظاہر عورت کی کہانیاں ہیں مگر دراصل یہ مردوں کا کچا چٹھا پیش کرتی ہیں۔ ''قابل'' کا تیلی پہلوان 'باری باری سرکار'' کی تبسم ہی کی ایک معکوس صورت ہے۔ دونوں بیمار ہیں۔ ایک جسمانی اور دوسرا ذہنی۔ 'دھوپ دیوار' کی ڈرامائی کہانی بھی آصفہ کی بجائے اس معاشرے پر طنز ہے جس کی اپنی آنکھ میں سور کا بال ہے۔ ''اُلو'' میں رقاصہ مدیحہ تو کٹھ پتلی ہے اصل لوگ تو وہ ہیں جن کے ہاتھ میں ڈوری ہے۔ جو ان کے اشاروں پر نہیں ناچ سکتا اسے منظر سے ہٹادیا جاتا ہے۔

لیکن میرے خیال میں اس مجموعے کی سب سے مؤثر کہانیاں 'لاہور جان' 'غیرت' اور 'یہ جو عورت ہے'...... ہیں اور خصوصی توجہ کی متقاضی۔ حیرت اور تعجب ہے کہ اکیسویں صدی کے اس روشن زمانے میں بھی ہمارے بعض علاقے ایسے ہیں جہاں عورتوں کی مثل پالتوں جانوروں کے خرید و فروخت ہوتی ہے۔ شادی کے نام پر بیٹیوں کو اجنبیوں کے ہاتھ بیچ دیا جاتا ہے اور اس کے بعد خریدار...... ان سے کیا سلوک کرتا ہے اور وہ کس حال میں ہیں، اس سے کچھ سروکار نہیں رکھا جاتا۔

لاہور جان ایسی ہی بدقسمت عورت ہے جو محنت مشقت کرتی ہے، بچے جنتی ہے اور ایک سے دوسرے بردہ فروش کے ہاتھ فروخت ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ سیدھی سادھی تھی اس نے حالات سے لڑنا سیکھا ہی نہ تھا مگر ظلم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ بالآخر اسے بیٹیوں کو بکنے سے بچانے کے لیے اپنے بیٹے کو قتل کرنا پڑتا ہے۔

''غیرت'' کی رکھی اس سے بھی سوا بدقسمت ہے۔ اس کا بھائی اسے گوشت کی بوٹی کھانے کے جرم میں ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ قلت آب کا شکار علاقہ ہے اور زندگی کا انحصار رودکوہیوں پر ہے۔ یہاں عوتیں گوشت پکاتی ضرور ہیں مگر کھانا ان کے لیے ممنوع اور جرم ہے کیونکہ ان کے مردوں کا خیال ہے کہ

عورت کے بدن میں پورا چاند، مردوں کو راغب کرنے والی گوشت کی بو آتی رہے گی۔ مرتے مرتے رکھی کسی دشمن سے بدلہ لینے کا موقع بھی فراہم کر جاتی ہے۔ غیرت کے نام پر دونوں قتل معاف۔ میرے خیال میں کسی علاقے یا معاشرے کے مہذب اور غیر مہذب ہونے کا اندازہ وہاں کی عورت کی حالت سے لگایا جانا چاہئے۔ اگر اسے تحفظ اور توقیر حاصل ہے تو یقیناً وہ معاشرہ شائستہ اور انسانوں کے رہنے کے قابل ہے ورنہ جنگل کا حصہ۔ مگر ایسا تو جنگل کے زمانے میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ جیسا رکھی کے ساتھ ہوا۔ کیا صدیوں کی محرومیوں اور زندگی کی سختیوں نے آدمی کو غیر آدمی بنا ڈالا!

کہانی، یہ جو عورت ہے،...... جس پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے، میں کوئی روایتی قصہ یا پلاٹ نہیں، انشائی اسلوب اس پر حاوی ہے۔ مگر عورت کے بارے میں مرد کا جو تاریخی اور مذہبی رویہ ہمیشہ سے رہا ہے اسے بہت عمدگی، دردمندی اور سچائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ کیسے اہل مذاہب نے ہر زمانے میں گناہ کے تصور کو عورت سے وابستہ کیے رکھا اور کس کس طریقہ سے اس کا جسمانی، ذہنی اور جذباتی استحصال کیا جاتا رہا۔ دراصل عورت کو پہلے دن سے ہی معتوب قرار دے دیا گیا تھا جب اس نے آدم کو جنت سے نکلوایا اور ہابیل اور قابیل کے درمیان رقابت اور تنازع کا سبب بنی تھی۔ اب کون ان تمثیلوں، علامتوں کو توجیحات کرے اور جانے کہ جنت کو تو اس کے پاؤں کے نیچے بتایا گیا ہے۔

اس کتاب کی کہانیاں فنی اور تکنیکی لحاظ سے مکمل اور بھرپور ہیں۔ ان میں ہماری تہذیب اور ثقافت (جیسی بھی ہے) جھلکتی ہے اور ان کی تہہ میں زندگی کو بہتر بنانے کی خواہش بڑی شدت سے موجود ہے۔ بعض مقامی الفاظ کا خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ جیسے ڈاگا (گبھرو) مونگر (کوزہ) اور بھمن (پراٹھا) وغیرہ۔ جو ایک طرف ادائیگی مفہوم میں مدومعاون ثابت ہوتے اور تحریر میں مٹی کی خوشبو پیدا کرتے ہیں اور دوسری طرف اردو کا دامن وسیع کرتے ہیں۔ بے تکلف اور برجستہ انداز بیان اور نادر تشبیہات نے تحریر میں دلچسپی سے پڑھے جانے کی خوبی اور خوبصورتی پیدا کر دی ہے اسلوب کے اعتبار سے یہ سیدھی اور سچی کہانیاں ہیں اور اپنا ایک الگ ذائقہ رکھتی ہیں۔

O

(مئی 2001ء۔ اسلام آباد)

حفیظ خان کے افسانوں میں بُنت اور معنویت

ڈاکٹر رؤف امیر

یہ جو حفیظ خان ہے...... ''یہ جو عورت ہے'' والا حفیظ خان،......اس سے میری ذاتی شناسائی کو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے، لیکن لگتا ہے صدیوں کا ساتھ ہو۔ بعض لوگوں سے ہم اکثر ملتے رہتے ہیں لیکن اجنبیت کی دیوار گرنے کا نام ہی نہیں لیتی، بعض ایسے ہوتے ہیں جن سے ملو تو فوراً قریب آ جاتے ہیں اور من وتو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ حفیظ خان ان دوسری طبع کے لوگوں میں سے ہے۔ صاف گو اور بے باک حفیظ خان کے ساتھ میری ایک طویل ملاقات آرڈیننس کلب واہ کینٹ میں ہوئی تھی۔ وہ کھانا کھائے بغیر جلد واپس جانا چاہتا تھا لیکن اگر ہم کسی کو نہ جانے دیں تو کیسے جا سکتا ہے اس کے لیے ابرِکرم کی منتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر کیا تھا، محفل میں حفیظ خان ہو اور پری وشوں کا ذکر......تو وقت گزرنے کا احساس کسے رہتا ہے۔

حفیظ خان کا نام سرائیکی ادب کے حوالے سے، اس سے ملنے سے بیشتر ہی میں نے سن رکھا تھا۔ اس کے اردو افسانوی مجموعے ''یہ جو عورت ہے'' کا تذکرہ بھی اپنے نام کی انفرادیت کی وجہ سے ہوتا رہتا تھا۔ اس کی اسلام آباد آمد پر حمید شاہد اور اصغر عابد نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور یہ ادبی گروہ جس کی پذیرائی کرلے سمجھیں، آدھا پاکستان اس کے زیرِنگین ہے۔

حفیظ خان سے میری پہلی ملاقات اسلم عابد کے گھر پر ہوئی تھی۔ میرے تحریر کردہ دیباچوں پر مشتمل کتاب ''[illegible] کے دیباچے'' کے حوالے سے گفتگو تھی۔ اس نے جم کر بات کی اور اس کا یہ تجزیہ مجھے بہت پسند آیا کہ میں براہ راست متن کو حوالہ بناتا ہوں۔

حفیظ خان کا افسانوی مجموعہ ''یہ جو عورت ہے'' ۱۹۹۷ء میں شائع ہو چکا ہے اگر چہ منو بھائی اور پروفیسر سعید ورشم صاحبہ کے فلیپ موجود ہیں اور جاوید اختر بھٹی نے دیباچہ لکھ رکھا ہے لیکن سچی بات یہ ہے مزہ نہیں آیا۔ مزہ تو اب آئے گا جب اپنے عصر کے حسن عسکری اور سلیم احمد کی آراء کے ساتھ کتاب شائع ہوگی۔ میرا اشارہ حمید شاہد اور اپنی طرف ہے۔ اب ہم میں حسن عسکری اور سلیم احمد کون ہے اس کا فیصلہ آپ خود کر لیں۔

اس وقت بابا رفیق خاور مرحوم مغفور میری رائٹنگ ٹیبل پر سو رہے ہیں۔ بٹالہ ضلع گورداسپور کے حوالے سے کاغذات بکھرے پڑے ہیں اور میں یہ حساب کتاب لگانے میں محو ہوں کہ اگر صرف تین صفحے روزانہ لکھوں تو دسمبر تک پی ایچ ڈی ڈاکٹر بن سکتا ہوں۔ آج کل ہر ملاقاتی زہر لگتا ہے۔ کرۂ ارض پر بکھری ہوئی درجنوں ٹیلیفونک محبوباؤں سے رابطہ منع ہے۔ بڑی غیر جمالیاتی فضا ہے۔ خشک تحقیقی قسم کی نثر لکھتے مزاج چڑچڑا ہو گیا ہے لیکن یہ جو عورت ہے نا یہ کس کو کب ٹھہرنے دیتی ہے لہٰذا پچھلے دنوں میں نے حفیظ خان کے افسانوں کو دوسری مرتبہ پڑھا، لکھنے کے نقطہ نظر سے، براہ راست متن پر بات کرنے کے زاویہ سے۔ اس کا موضوع ''عورت'' ہے۔ باوا آدم کو جنت سے نکلوانے والی۔ بادشاہوں کے تخت و تاج کو تاراج کرنے والی۔ حیلہ جو، فتنہ خو، مکار، عیار جانے کیا کیا القاب پانے والی۔ کبھی فلسفیوں نے جسے خراج تحسین پیش کیا اور کبھی جس کی چالاکیوں سے پناہ مانگی۔ عورت کی مخالفت و مدافعت میں اتنا کچھ لکھا گیا کہ ضخیم تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

یوں تو جملہ فنون لطیفہ کا مرکز و محور عورت ہے۔ اس تناظر میں اردو افسانہ بھی اس کے تذکرہ سے خالی نہ تھا لیکن حفیظ خان کے اس مجموعے کا اختصاص یہ ہے کہ اس کا ہر افسانہ عورت کے موضوع کے گرد گھومتا ہے بلکہ خود عورت کے گرد گھومتا ہے۔ اپنی موضوعاتی انفرادیت کے باعث اس مجموعے کو اردو افسانے کے ارتقاء میں زندہ رہنا چاہئے۔

یوں تو حفیظ خان نے عورت کے متنوع روپ دکھائے ہیں۔انو کھے نام والی لاہور جان ہے۔ سرحدی علاقے کی عورت صدیوں سے مرد کی بربریت کا شکار۔نسل در نسل غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی،مجبور،مقہور،معذور۔''یہ جو عورت ہے'' نامی افسانے میں حفیظ خان نے عورت سے متعلق فلسفیانہ گفتگو کر کے اپنے افسانوی مجموعے کو سطحیت کے الزام سے بچالیا ہے۔یہاں عورت کے بارے میں اس نے عمرانی حوالوں سے ہمدردانہ روش اختیار کی ہے۔وہ عورت جسے ہم اپنی جائیدادوں میں اس کا جائزاور قانونی حصہ تک نہیں دیتے۔ایک اور مقام پر عورت اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے خودکشی کر لیتی ہے۔میرا اشارہ افسانہ ''بزدل'' کی طرف ہے۔اس نوع کے تصورِ عورت نے حفیظ خان کا قد بلند کیا ہے لیکن میں اسے ''ماؤں بہنوں،بیٹیوں'' کے حوالے سے طبقہ نسواں کا حمایتی ثابت کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔

تاہم حفیظ خان کے افسانوں کی عورت زیادہ تر چلتر ہے۔ایک معروف کہاوت تو آپ کو یاد ہوگی کہ شیخ سعدی نے عورتوں کے مکروفریب سے متعلق کتابیں لکھیں اور اونٹوں کی ایک قطار پر لاد کر دوسرے شہر کو چلے۔راستے میں کھیت پڑتے تھے۔ایک عورت ہل چلانے والے رشتہ دار مردوں کے لیے کھانا لے کر جارہی تھی۔

اس نے پوچھا ''بابا کیا ہے''۔

انھوں نے حقیقت حال بتائی تو اس نے کہا کہ کیا تم نے عورتوں کے سارے مکروفریب جمع کر لیے۔

شیخ سعدی نے کہا۔ہاں!

وہ بولی پھر میرا کرشمہ دیکھو۔

یہ کہہ کر اس نے کھانے کی چنگیز سر سے اتاری ہے اور لگی چیخنے چلانے،شور سن کر ارد گرد کے کھیتوں میں کام کرنے والے زمیندار لاٹھیاں سنبھالے اس کی طرف بھاگے۔

اس نے شیخ سعدی سے کہا کہ میں ان سے کہوں گی کہ تم نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے پھر جو تمہارا حشر ہوگا دیکھ لینا۔

شیخ سعدی نے کہا ''کس طرح مجھے بچالو''

اس نے وعدہ لیا کہ اگر تم عورتوں کے خرابیوں سے متعلق یہ کتابیں دریا برد کردو تو میں بچاتی ہوں۔

شیخ سعدی نے مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وعدہ کرلیا۔ جب مرد قریب آئے تو اس نے اپنے فطری فریب سے کام لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

بھائیو، بیٹو! اللہ کا شکر، اس نے مجھے موزی سانپ سے بچالیا۔ اگر یہ بزرگ میری مدد نہ کرتے تو میں مرگئی تھی۔

جن سے شیخ سعدی کو مار پیٹ کا خطرہ تھا وہ ان کی آؤ بھگت کرنے لگے۔ کہتے ہیں شیخ سعدی نے وعدہ پورا کیا اور تمام کتابیں دریا برد کردیں۔

حفیظ خان نے عورت کو میان خیر وشر معلق دکھایا ہے لیکن اس کا جھکاؤ شر کی طرف زیادہ ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ پسند کی شادی کرنے کے باوجود اپنے اجنبی شوہر کی چند روزہ دوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک عورت کالونی کے پٹھان چوکیدار کو زلف گرہ گیر کا اسیر کرلیتی ہے۔ ایک مولوی صاحب کی کم عمر دوسری بیوی پہلے سے بیوہ اور ایک عدد بچے کی ماں ہونے کے باوجود موقع ملتے ہی جوان مرد کی قربت کے نشے میں سرشار بھاگ جاتی ہے۔ بظاہر شرافت کا لبادہ اوڑھنے والیاں اندر سے گھنی ہوتی ہیں۔ یہ تھوڑی دور تک ہر راہرو کے ساتھ چلتی ہیں۔ بے اعتباری اوران کی سرشت میں ہے۔ پہلی کہانی کی عورت پکڑے جانے کے موقع پر پہلے شوہر کا ساتھ دیتی ہے پھر پٹھان کے قتل پر طیش میں آکر شوہر کو ماردیتی ہے اور دونوں کے مرنے کے بعد ہر قسم کے الزام سے بری ہوکر تیسرے مرد کی بیوی بن جاتی ہے۔ کسی غزل گو نے ایسی عورت کے لیے کتنا اچھا شعر کہا ہے۔

فتنہ جگا کے شہر میں آگ لگا کے دہر میں
جاکے الگ کھڑے ہوئے کہنے لگے کہ ہم نہیں

شاید کسی کو نہیں معلوم، ادب کی دنیا میں میرا داخلہ نثر اور شعر کے دروازوں سے بیک وقت ہوا اور میں نے ابتداً افسانے بھی لکھے۔ جہاں تک پڑھنے کا تعلق ہے تو میں نے فکشن کا مطالعہ بہت کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میٹرک کے امتحان کے بعد میں نتیجے کا منتظر تھا اور ایک رات میں نے

کرشن چندر کا ایک افسانہ پڑھا تھا جس نے میرے دل کی دنیا تہ و بالا کر دی تھی۔ کہانی کچھ یوں تھی، کہ ایک سکھ اپنے باورچی خانے میں سردیوں کی ایک ڈھلتی شام کو جب کہ زور کی بارش ہو رہی تھی بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سالہا سال بیشتر کی بات ہے کہ ایک رات اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی اٹھی اور گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا اور کھیتوں میں مست کر دینے والی سرسوں پھولی ہوئی تھی۔ اس نے بیوی کا پیچھا کیا۔ وہ کھیتوں میں کھلیانوں میں بہتے ہوتی ہوئی نالوں سے گزرتی ایک جھوک پر اپنے محبوب سے ملنے گئی۔ دونوں قرب کے نشے میں سرشار ہو گئے اور وہ چھپ کر دیکھنے لگا۔ ایک موقع پر جب مرد نے عورت سے کہا کہ مجھے پیاس لگی ہے اندر کمرے میں گھڑا رکھا ہے پانی تو لا دو۔ وہ عورت اندر گئی تو اسی لمحے چھپے ہوئے مرد نے آگے بڑھ کر، کرپان سے اپنے حریف کا کام تمام کر دیا اور جلدی جلدی گھر آ کر سو گیا۔ اس بات کو جانے کتنے برس بیت گئے۔ ان کے بچے پیدا ہوئے، وہ جوان ہوئے مگر سکھ نے اپنا راز دل میں چھپائے رکھا۔ اس شام جب کہ زور کی بارش ہو رہی تھی باورچی خانے کا دروازہ کھل گیا۔ اس نے بیوی سے کہا سردی آتی ہے ذرا اٹھ کر دروازہ تو بند کر دے۔ عورت بولی ''مجھے ڈر لگتا ہے''

نہ جانے کیسے برسوں کا بھید سکھ کی زبان پہ آ گیا: ''راتوں کو اکیلے میلوں سفر طے کر کے جاتے تو تجھے ڈر نہیں لگتا''۔ یہ جملہ سننا تھا کہ یہ عورت زخمی شیرنی کی طرح خاوند پر حملہ آور ہو گئی ''اچھا تو وہ تم تھے کمینے، خنزیر، مردود......اور اس نے اپنے خاوند کو قتل کر دیا۔

یہ کہانی پڑھ کر مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ وہ دن اور آج کا دن جب چودھویں کا چاند چمکتا ہے اور مست کر دینے والی سرسوں پھولتی ہے تو مجھے کرشن چندر کے اس کہانی کے کردار یاد آ جاتے ہیں۔ پچیس برس سے میں اس تلاش میں تھا کہ کوئی افسانوی فن پارہ مجھے اس افسانے کا سا لطف عطا کرے۔ حفیظ خان کے پہلے افسانے نے مجھے کرشن چندر کی یاد دلا دی۔ اس میں بھی وہی تجسس اور تاثر ہے۔

تجسس کی بات آتی ہے تو اس کا تذکرہ بھی ہو جائے کہ حفیظ خان کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی اس کا تجسس ہے۔ تقریباً ہر افسانے میں کہیں کم، کہیں زیادہ، یہ عنصر موجود ہے جو تجسس کو آہستہ آہستہ نقطۂ عروج تک لے جاتا ہے۔ اگر آپ نے اس کی گفتگو سنی ہے تو وہ بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔

متجسس اور متحیرہ۔ پہلا افسانہ تو ہے ہی لا زوال اس کی دوسری بھرپور مثال افسانہ ''بزدل'' ہے۔

حفیظ خان کے افسانوی اسلوب میں شگفتہ لہجے کی بازگشت دیر تک اور حد تک سنائی دیتی ہے۔ وہ کہیں کہیں محض متبسم کرتا ہے اور کہیں قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کی محفلوں میں بیٹھنے والے اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ بہت زندہ دلانہ اور پُرمزاح گفتگو کرنے کا عادی ہے۔ اس کی گفتگو کا یہی لہجہ اس کی افسانوی تحریروں میں متشکل ہوا۔ مثال کے طور پر لائبریری میں نیلی آنکھوں والی لڑکی سے اس کی پہلی ملاقات کی گفتگو کہ ''فلسفہ تو الو پڑھتے ہیں'' جبکہ فلسفہ لڑکی کا باپ پڑھتا تھا۔ یا پھر بیوی کو ''بزرگو'' کہہ کر مخاطب کرنا اور بزرگوں کا برا منا جانا اور پھر قسم کھاتے ہوئے اپنے سر کی طرف اشارہ کرنا یا پھر یہ جملہ کہ ''اس کے والد نے اگلے جہان تبادلہ کرالیا۔''

کہیں کہیں وہ منٹو کے قریب چلا گیا۔ مثلاً آٹا گوندھتے ہوئے آپا کا منظر۔ میں اسے متنبہ نہیں کرتا۔

حفیظ خان خوبصورت جملہ لکھنے پر زبردست قدرت رکھتا ہے۔ اس کے لیے کہیں کہیں تو وہ لفظوں کی تازگی سے مدد لیتا ہے اور کبھی کبھی غیر متوقع صورتحال پیدا کر دیتا ہے۔ چند جملے دیکھئے۔

☆ نینداور بیداری کی ملی جلی کیفیت

☆ بچوں کے چہروں کی ملکوتی معصومیت

☆ دوریوں کو رفاقتوں میں اور اجنبیت کو تعلق میں بدل دیا

☆ میرے بدن کی پانچویں حسیں سماعت بن گئیں

☆ وہ بدصورتی سے ٹال گئی

☆ طوطا چشم جذبات، جنھیں میں نے بڑی مشکل سے ضبط واحتیاط کے پنجرے میں قید کر رکھا تھا۔

اس پر بس نہیں وہ جانتا ہے کہ افسانوں کا اسلوب کیا ہے! مثلاً اس طرح کے پیراگراف ''گھر پہنچتا تو ریحانہ کے معصوم چہرے پر رقصاں محبت کے جذبوں سے گندھی مسکراہٹ، میرے جسم کے ذرے ذرے میں تازگی بن کر پھیل جاتی......''

حفیظ خان کے افسانے مناسب حد تک پھیلے ہوئے ہیں۔ نہ بہت مختصر نہ زیادہ طویل۔ آغاز وانجام

میں توازن افسانے کی ایک خوبی ہے۔ اگر اس کی بہترین مثال دیکھنی ہو تو ''مائی بڑھیا کا گھوڑا'' دیکھئے۔ جب میں اس افسانے کو پڑھتے پڑھتے آخر پر پہنچا تو ماشاءاللہ سبحان اللہ کہتے کہتے میری زبان تھک گئی۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے تو تمہارے نزدیک حفیظ خان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی کیا ہے تو میں کہوں گا کہ اس کے افسانوں میں کمال کی بنت ہوتی ہے اور اس بنت کے باطن میں وہ گہری معنویت پوشیدہ رکھتا ہے۔ آیئے چند مثالوں سے رجوع کرتے ہیں۔

O۔ سب سے پہلا مقام وہ ہے جہاں حفیظ دودھ کو روشنی اور قہوے کو اندھیرے کی علامت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اسے دودھ میں قہوہ ڈالنے کے عمل سے روشنی پر اندھیرا غالب آنے کا خطرہ رہتا ہے لیکن قہوے میں دودھ ڈالنے کو وہ روشنی سے تعبیر کرتا ہے میں اس کی اس پسند کو روشن ضمیری تصور کرتا ہوں۔

O۔ گوری رنگت اور نیلی آنکھوں والا مرد مجبوراً سیاہ رنگت والی عورت سے شادی کرتا ہے۔ اور اس کی شباہت والی عورت اس کی بیوی کی شباہت والے مرد سے دونوں کا منطقی نتیجہ ایک جیسے بچے ہوتے ہیں۔ سیاہ رنگت لیکن نیلی آنکھوں والے!!! گویا دودھ میں قہوہ ڈالو یا قہوے میں دودھ، بات ایک ہی ہے۔ اس موقع پر وہ بچھڑنے والوں کو امریکہ اور کینیڈا کی سرحد پر ملواتا ہے۔ گورے اور کالے کی معنویت محل نظر رہے۔

O۔ افسانہ ''آٹے کی عورت'' کا کردار کہتا ہے کہ متواتر ڈیڑھ سال شہر رہنے کے بعد میں ایف اے کا امتحان دے کر گاؤں چلا آیا۔ میں نے سوچا ایف اے تو دو سالوں میں ہوتا ہے لیکن جب افسانوی بنت کی گہری معنویت کی طرف دھیان گیا تو میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا کہ حفیظ خان نے تین تین مہینے کی تعطیلات شہر کے قیام سے منہا کر دی ہیں۔

☆۔ افسانہ ''قابل'' کی خاتون کردار جب اپنی ساس سے لڑتی ہے تو یہ معنی خیز جملہ بولتی ہے۔ ''مُردے پلے پڑ گئے ہیں'' افسانے کے آخر پر جا کر کھلتا ہے کہ وہ بیمار بوڑھی ساس ہی سے یہ جملہ نہیں کہہ رہی تھی بلکہ اس کا مخاطب جنسی طور پر محروم شوہر بھی تھا۔

آپ ہر افسانے میں حفیظ خان کے ہاں ایسی بنت اور معنویت ملاحظہ فرمائیں گے۔ اس

افسانہ نگار سے ہمیں بہت سی امیدیں ہیں بالخصوص اس کے کار منصبی کے حوالے سے...... ایک دو افسانوں میں حفیظ خان کے ہاں مقدمات میں سے کہانیاں کشید کرنے کی روش دکھائی دیتی ہے لیکن وہ تو اردو افسانے کو مالا مال کرسکتا ہے۔ ڈاکٹر تو فقط ظاہری زخم دیکھتا ہے وہ تو منصف بھی ایسا جو روح پر لگے زخم دیکھ بھی سکتا ہے اور ان کا علاج بھی کرسکتا ہے۔

باقی سائیں آخر میں صرف اتنا کہنا ہے کہ عورت سے محبت کرو...... یہ ظالم چیز اپنی تمام تر مکاری، عیاری اور بے اعتباری کے باوجود چاہے جانے کے قابل ہے۔ سائیں ''نسائیت'' میں ذہانت، میری بھی کمزوری ہے کہ اتنالیس سالہ زندگی میں پچیس برس فقیر نے عشق کے کوچے میں بسر کیے، چمن چمن کی سیر کی۔ کہیں موتیا تھا، کہیں چنبیلی...... گلاب کا پھول پہلی دفعہ نظر پڑا ہے۔ نسائیت میں ذہانت ملتی ہی نہیں اس حوالے سے میرے نزدیک کائنات میں صرف ایک ہی عورت ہے اور اسے بھی پتہ ہے اور وہ اسی شہر میں رہتی ہے لیکن ایسی عورتیں جو حسین بھی ہوں اور ذہین بھی، اچھے مقدر لے کر نہیں آتیں، تمہارے افسانے کی عورت کی طرح۔ اس طرح جمال پرست اور ارفع فکر مرد بھی بدنصیب ہوتے ہیں......

تم منصف ہو اگر انصاف کرو تو ایک ماہیا عرض کرتا ہوں۔

تکڑی تولن دی

آپ نصاف کریں ساڈی جانئیں بولن دی

اور قارئین...... حفیظ خان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے آخر پر مجھے اپنی ایک حیرت کا اظہار کرنا ہے۔ آپ نے وہ مشہور جملہ تو سنا ہوگا کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور کس من چلے نے اس پر گرہ لگائی تھی وہ بھی آپ کے پیش نظر ہوگی کہ ہر ناکام مرد کے پیچھے ایک سے زیادہ کامیاب عورتوں کا ہاتھ ہوتا ہے...... میں حیران ہوں کہ حفیظ خان، اتنی ساری عورتوں کی موجودگی میں کامیاب وکامران کس طرح ہے!

O

4/9 ڈی ایس پارک واہ کینٹ

(17 / جون 2001ء)

وہ افسانے جو ایک مرد ہی لکھ سکتا تھا

محمد حمید شاہد

ایک مکالمے کے دوران اشفاق احمد نے فرمایا تھا:

''جنس سے انسان، خاص طور پر مرد کبھی نہیں تھکتا۔ وہ اس میں دور تک چلا جاتا ہے، دیر تک رہتا ہے۔''

اشفاق احمد کا یہ جملہ مجھے حفیظ خان کے افسانوں کے مجموعے ''یہ جو عورت ہے'' کو بغور پڑھنے پر یاد آیا۔ چودہ افسانوں کی اس کتاب میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو گرفت میں لے لیتی ہے، اپنے آپ سے وابستہ کر لیتی ہے۔ صرف لذت، رنگ اور خوشبو کے چھینٹے نہیں اڑاتی، کئی سوالات بھی اٹھاتی ہے۔

عورت کے بارے میں ایسے سوالات جو صرف ایک مرد ہی بہتر طور پر اٹھا سکتا تھا۔ یہ وہ سوالات ہیں جو عورت اور مرد کے بیچ ہمیشہ سے رہے ہیں اور ہمیشہ رہ جانے کے لیے ہیں۔

ان سوالات کے سکے، کھکھناتے مرد اور اس کھن کھن کے بدن میں نئے نئے معنی کی روح اتارتی عورتیں، بظاہر اس دائرے سے نکلنے کا جتن کرتے دکھتے ہیں۔ مگر فی الاصل یوں ہے کہ وہ اسی کے اسیر رہنا چاہتے ہیں۔ عجیب لذت کا رہٹ ہے کہ ہر بار پڑچھے سے ہوتا، ہودی کے راستے ایسا غوغائی سیال مستقبل کے کھیتوں میں انڈیلا جا رہا ہے جو رقیق ہونے پر وہیں جم جاتا ہے۔ نرم زمینوں

کے اندر نہیں اترتا، نہ ہی آگے کو بہتا ہے کہ یوں بہے چلے جانا اس کی خصلت نہیں ہے۔بس یوں کہہ لیجئے کہ یہ تو انسانی معاشرے کے کنویں کی خصلت ہے۔ڈھیر بنتی ہوئی اٹ، بوسیدہ معاشرے کے تازہ کنویں کی تہہ سے نکل کر باہر پھسلن بناتی اٹ کہ اس سے پھسل پھسل کر گرنا اور اس کی بو کو سانسوں میں یوں رچا بسا لینا کہ وہ خوشبو کا سارا احترام پالے، دونوں جانب کی فطرت کا حصہ ہے اور ''یہ جو عورت ہے'' کی کہانیاں ہیں، یہ اسی فطرت کا قصہ ہیں۔

اشفاق احمد کو ایک بار پھر یاد کر لینے دیجئے کہ ان کی کہی ہوئی ایک اور بات دہرانے کا موقع نکل آیا ہے، فرماتے ہیں۔

''جنس ایک بڑی طاقتور اور بڑی پاکیزہ چیز ہے''

پھر اس میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔

''یہ میری Creation کی باعث ہے، دیکھیں جی! میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں، یہ جنس اس کے پیچھے کارفرما تھی تو میں تشریف لے آیا ہوں لہٰذا میں اس کا احترام کرتا ہوں۔''

اشفاق احمد جس جنس کا احترام کرتے ہیں وہ ادھر ادھر ا ملے گھلے نہیں پھرتی کہ بقول ان کے:

''ایک جنس کا لیول زمین کی طرف جانے کا ہے اور ایک جب میں پورے کا پور Lowest Level سے اوپر اٹھتا ہوں، فٹ بال کی طرح، تو میری جنس کا یہ لیول ہے۔''

''یہ جو عورت ہے'' کہ کہانیوں کے بیشتر مرد اور عورتیں، جنسی کشش کیمیائی کے اثر میں ہیں تاہم مردوں کا سفر ڈھلوان کا ہے، گرنے کے بعد مسلسل گرے چلے جانے کا۔جبکہ عورتوں کے حوالے سے یہاں بوقلمونی کا سماں ہے۔اس Spin ہوتی گیند کی طرح، جو ہر بار اچھلنے پر اپنی سمت بدل لیتی ہے یا پھر شعبدہ باز کے اس کھدو کی طرح جو اپنے ماں کی ہتھیلی سے مس ہو کر ہر بار نیا رنگ بدل لیتا ہے۔

اس مجموعے کے پہلے افسانے ''کس کے ساتھ'' کی عورت کو دیکھئے۔ایک مرد کے پہلو سے غائب ہو کر دوسرے مرد کے پہلو میں نمودار ہو جاتی ہے۔عورت، اپنے اندر کے رنگ اور چلن بدل

لینے والی عورت کچھ ایسی خصوصیات رکھتی ہے کہ اپنی جنس کو Lowest Level پر تربیت دینے والا مرد مشتعل ہو جاتا ہے اور جب وہ برزخ میں ہکا بکا بیٹھا ہوتا ہے تو پہیلی بن جانے والی اپنی ہی عورت کے بارے میں سوچے جاتا ہے اور الجھے جاتا ہے۔ اس کہانی میں مرد اور عورت کی قدرے مختلف نفسی جبلتوں کی نفسیاتی سطح پر تفہیم کی کوشش نظر آتی ہے۔ کیا معاملہ اتنا سادہ ہے جتنی سادگی سے بیان کر دیا گیا ہے۔ شاید نہیں، یوں لگتا ہے کہ افسانہ نگار، تین پونڈ وزن اور بارہ ارب خلیوں والا دماغ رکھنے والے مرد کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے سے چار اونس کم وزن کا دماغ رکھنے والی عورت کے گنجھل کو پوری طرح سمجھ سکے۔ گنجھل کیوں ہے، کیسے ہے اور کہاں ہے، اس افسانے میں اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اس افسانے میں وہاں ایک اور کہانی اپنا آغاز پاتی ہے جہاں چوکیدار بجلی کی سی تیزی سے تپائی رکھے ہوئے ریوالور کی طرف جھپٹتا ہے اور ریحانہ ''نہیں نہیں'' چیختی مزاحم ہو جاتی ہے۔ کہانی کے بیچ دوسری کہانی میں چوکیدار کو موت کی گھاٹ اتارنے والا مرد، اپنی ہی عورت کی نفرت کے لاوے سے ڈھیر ہو جاتا ہے۔ یوں عورت ایک نئی گنجھل لے کر سامنے آتی ہے۔

''حاصل جمع'' کی کہانی Probability کی گھمن گھیری سے Net Result برآمد کرتی ہے وہ اپنی جگہ دلچسپ سہی مگر مجھے اس کہانی کے غیر مکلّف بیانیے نے بہت لطف دیا ہے۔

''آٹے کی عورت'' وہ پہلی کہانی ہے جہاں افسانہ نگار سنبھل کر کہانی کے اندر بہ نفس نفیس اترتا ہے اور وہاں تک چلا جاتا ہے جہاں عورت اور مرد اپنی اپنی جبلتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ یہاں آٹا گوندھتی آپا رضیہ ہے جو خالص جنس بن جاتی ہے، آٹے کے پیڑے جیسی، ایک ''مکی'' اور ایک ''تھاپے'' پر پھسل جانے والی، دہکتے تنور کی تپتی دیوار سے گرم گرم اتر کر ایک مرد کی لذت کا نوالہ بن جانے والی۔ سب کچھ کہانی میں نہایت چابکدستی اور سلیقے سے بتایا گیا ہے اور جہاں عورت کی سائیکی کا باریک بینی سے مطالعہ کیا گیا ہے وہاں مرد کی فطرت کو بھی کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ کیسے ایک بچہ کولھوں پر سوار ''آپا آپا'' کہتے نہ تھکتا تھا اور کیسے شب و روز نگل کر گھبرو بن جانے والا وہی بچہ آپا کو فقط جنس کا استعارہ بنا دیتا ہے۔ کاش افسانہ نگار وہیں تک محدود رہتا جہاں آنسوؤں سے Expicit ہوتی آپا کے جذبے جون بدلتے ہیں اور اس کے قدم جنس کی لذیذ طلب سے نڈھال ہو جانے والے مرد

کے دروازے پر آہٹ پیدا کرتے ہیں کہ اس کے بعد اس کا گرنا اپنی عظمت کے فلک سے ذلت کی پاتال میں گرنا ہوجاتا ہے جو قاری کو اس کے قریب لے جانے کی بجائے Repel کرتا ہے۔ تاہم یہ بھی تو عورت کا ایک روپ ہے کہ اپنے قدموں پر کھڑی رہتی ہے تو آسمان کی بلندیوں کو چھوتی ہے اور جب گرتی ہے تو وہاں تک گرے چلی جاتی ہے جہاں تک اسے گرانے والا گرانا چاہتا ہے۔

''مائی بڑھیا کا گھوڑا'' کی عورت یوں مختلف ہے کہ وہ گرانے اور چباڑا لنے کا ہنر جانتی ہے۔ ''آٹے کی عورت'' کی طرح اس کہانی کی عورت بھی مرد سے عمر میں بڑی ہے، سات برس بڑی مگر اس سے کہیں مختلف ہے، رشتے بدل جانے سے بڑی عمر کی عورت کیسے مختلف ہوجاتی ہے ان دونوں کہانیوں کو ساتھ ساتھ پڑھنے سے یہ عقدہ پوری طرح کھل جاتا ہے۔

''تن من سیس سیریز'' کی مائی جنداں بھی ادھیڑ عمر کی ہے، گوشت پوست کا پلپلا پہاڑ۔ مگر اس کہانی کا اصل موضوع عورت نہیں، وہ مرد ہے جو عورت کی طلب میں یوں اندھا ہوگیا ہے کہ اوندھا جا پڑتا ہے۔ ساری عمر خود کو یوسف ثانی سمجھنے والے بوڑھے مرد کی روش دیکھ کر قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مرد بوڑھا تو ہوجاتا ہے مگر اس کی جنس کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔

افسانہ ''قابل'' کا مرد جنس کے کچھو کے کھا کر گرنے والے مراد سے مختلف مرد ہے، بہت مختلف۔ بلکہ وہ مرد ہے ہی نہیں۔ آدھی عمر گزار چکنے کے بعد ماں کے اصرار پر دسویں جماعت کی طالبہ سے بیاہ رچا لیتا ہے تو کہانی کا المیہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ وہ المیہ ہے جو اس معاشرے کا ناسور بن چکا ہے۔ کہانی کا اختتامیہ اپنے مرکزے سے گہری وابستگی نہ رکھنے کے باوجود رستے زخموں کی بھرپور نشاندہی کرتا ہے۔

''دھوپ دیوار'' میں سرے سے کوئی مرد ہے ہی نہیں، وہ مرد جو سہارا بنتا ہے، بن سکتا ہے یا جس سے سہارا بننے کی امید باندھی جاسکتی ہے۔ ادھر ادھر جو مرد ہیں، وہ تماش بین ہیں، تالیاں پیٹنے والے، لودھیں رہنے والے یا پھر رالیں بہانے والے۔ تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کہانی کی عورت خود مرد بن جاتی ہے۔ ''لاہور جان'' کہانی کی عورت میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ مرد بن سکے لہٰذا عبرت کا نشان بنادی جاتی ہے۔

''جنت، حور، قصور'' کے مولوی عبدالقدوس کا واسطہ دو عورتوں سے پڑتا ہے، گھر کو جنت بنانے

والی عورت سے اور آندھی کی طرح آ کر گزر جانے اور تہس نہس کر دینے والی عورت سے بھی، یہاں تک کہ مرد بے بس ہو جاتا ہے اور رو دیتا ہے۔ مرد کا اس کہانی میں رو دینا عورت کو زندگی میں واپس لانے کے لیے ہے جبکہ "آٹے کی عورت" کے مرد کے آنسو عورت کو گرانے اور پامال کرنے کے لیے تھے۔ مرد کے آنسوؤں کی دو سطحوں پر یہ تفہیم بجائے خود دلچسپ ہو گئی ہے۔

"غیرت" کا عنوان پانے والی کہانی میں جابر مرد کی جہالت کو اپنی انتہا پر دکھایا گیا ہے۔ اس کہانی کی فضا میں عورت صرف عورت ہونے کے سبب مرد کے لیے قابل نفرت ہو جاتی ہے۔ جب کہانی کی عورت قتل ہو جاتی ہے تو مرد اپنے کیے پر نادم ہونے کی بجائے اسے اپنی غیرت کا تقاضا سمجھ بیٹھتا ہے۔

"بزدل" کی شمسہ بھی موت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ نہانے کی چوکی پر بیٹھی خود پر پانی انڈیلتی شمسہ کو دیکھ لینے والا مرد لمحہ بھر کو نادم ضرور ہوتا ہے مگر جلد ہی جنس کے چٹخارے لیتا اور اندھا دھند آگے ہی آگے بڑھنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک عورت اپنی عزت اپنی زندگی قربانی کر دیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ موت کو یوں کھلی بانھوں میں سے گلے لگا لینے والی عورت ہی ہماری تہذیب کو سنبھالے ہوئے ہے۔

"باری باری سرکار" کی عورت کی لغت میں عزت کا وہ مفہوم نہیں ہے جو شمسہ کے ہاں ہے۔ اس کہانی کی مس تبسم ایک ہی وقت میں کئی مردوں کو بہلانے کا ہنر جانتی ہے، ایک ساتھ نہیں الگ الگ۔ "الو" کے عنوان سے لکھے گئے افسانے کی مدیحہ بھی ایسی ہی عورت ہے مگر وہ ایک ہی وقت میں کئی مردوں کے بیچ ناٹک رچا سکتی ہے کہ یہی کچھ اسے مرد نے سکھایا ہوتا ہے۔

ایک کہانی جس کا تذکرہ ہونا باقی ہے، وہ ہے "یہ جو عورت ہے"۔ یہ کہانی اس مجموعے کا عنوان بھی بن گئی ہے۔ اس کہانی کو پڑھنے والے کے سامنے ایک سوال ضرور آ کھڑا ہوتا ہے کہ "کیا یہ افسانہ ہے"؟ یہ ایسا سوال ہے جو گزری دہائیوں میں اسی قبیل کے فن پاروں کے حوالے سے تسلسل کے ساتھ اٹھایا جاتا رہا ہے۔ اتنے تواتر کے ساتھ کہ اب اس میں اس کے معنی نفی ہو گئے ہیں۔ "جو ہے، جہاں ہے" کے اصول پر بہت کچھ قبول کیا جا چکا ہے۔ ایسے میں افسانے کا بیرونی احاطہ دھندلا گیا ہے۔ اسی دھندلے احاطے میں "یہ جو عورت ہے" رکھ لیجیے کہ اس فن پارے میں فی الاصل کہانی کے خدوخال

[illegible] اس کہانی کا موضوع بھی عورت ہے، اپنی جنس کے سبب معتوب [illegible] Sexual Exploitation کی شکار بدنصیب عورت، وہ عورت جس سے [illegible] نام نہاد اور عبدالقدوس، سب ہی نفرت کرتے ہیں۔

"[illegible] عورت ہے" کے افسانے پڑھنے کے بعد مجھے یوں لگتا جیسے اس پوری تہذیب کو بچائے رکھنے والی [illegible] پر اسے چلانے کے جتن کرنے والی، اپنے قدموں تلے جنت رکھنے والی، [illegible] عورت کی کہانیاں یا تو ابھی حفیظ خان کو لکھنی ہیں یا پھر وہ سقراط کی طرح ڈنڈی مار گیا ہے۔

یہ سقراط کی طرح ڈنڈی مارنے والی بات شاید آپ تک پوری طرح پہنچ نہیں سکی، البذا سقراط کا قصہ بھی سن لیجئے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ایتھنز کے لوگ سقراط سے بحث مباحثہ کے لیے کسی نہ کسی بہانے کو کھینچ لایا کرتے تھے کہ بحث مباحثہ ہو وہ تماشا دیکھیں کون جیتتا ہے۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ ایک کاروباری شخص کو لے کر اس کے پاس پہنچ گئے جو بہت راست باز تھا۔ سقراط نے پوچھا" اے شخص، کاروبار میں راست بازی کیا ہوتی ہے"۔ اس کا جواب تھا۔ "لین دین ٹھیک ٹھیک کیا جائے، ادھار اور امانتیں وقت اور وعدے پر لوٹا دی جائیں"۔ اب سقراط کی باری تھی، کہا "بھلے آدمی بعض اوقات درست درست ادائیگی راست بازی کے منافی ہو جاتی ہے"۔ لوگوں نے تمسخر سے قہقہہ لگایا۔ پھر جھنجھلاہٹ سنائی دی۔ "بھلا راست بازی بھی کہیں غلط ہو سکتی ہے!"۔ سقراط نے کہا "ہاں! دیکھو تمہیں ایک شخص کو اس سے مانگا ہوا ہتھیار لوٹانا ہے، طے شدہ تاریخ آ جاتی ہے۔ تم ہتھیار لے کر پہنچ جاتے ہو حالانکہ یہ شخص ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ اگر اگر تم ہتھیار اس کے ہاتھ میں تھما دو گے تو کیا وہ شخص لوگوں کی گردنیں نہ مارتا پھرے گا"۔

تو صاحبو! یہ جو جنس ہے نا، یہ بھی کہیں کہیں مہلک ہتھیار کی طرح ہو جاتی ہے خصوصاً وہاں جہاں پہلے ہی معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو۔

حفیظ خان نے کہانیوں کے بیچ کہیں کہیں سقراط کی طرح ڈنڈی مارنے کو ترجیح دی ہے تاہم اب شاید اس کی بہت زیادہ ضرورت ہو گئی ہے کہ نئی ٹیکنالوجی کا ہر ادارہ جنس کی دلدل میں اس معاشرے کو وہاں تک دھکیل دینا چاہتا ہے جہاں سینے پر چڑھی دلدل حلقوم سے آوازیں چھین لیتی ہے۔ جب

لکھے ہوئے لفظ ہی نہ رہیں گے تو کیا معنی اور کیا معنی کے نئے نئے پہلو۔ حفیظ خان نے یہ کیا ہے کہ اپنے افسانوں میں دلدل نہیں بنائی۔ تاہم ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی مصلحت نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ہو۔ اس نے عورت کی نفسیاتی تہیں کھنگالنے کو جو قصد کیا تھا اس میں بہت حد تک کامیاب رہا ہے۔ عورت کی اتنی بھرپور تصویر ایک مرد ہی بنا سکتا تھا۔

دامودر گپت کے قدیم سنسکرت کتاب ''نٹنی منم'' کا میراجی نے اردو میں ترجمہ کیا تو اس کا دیباچہ لکھتے ہوئے سعادت حسن منٹو نے کہا تھا:

''......سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تمام باتوں کو قلم بند کرنے والا ایک مرد ہے...... یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ اس لیے عورت خواہ وہ بازاری ہو یا گھریلو، خود کو اتنا نہیں جانتی جتنا کہ مرد اس کو جانتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عورت آج تک اپنے متعلق حقیقت نگاری نہیں کر سکی۔ اسکے متعلق اگر کوئی انکشاف کرے گا تو مرد ہی کرے گا۔''

حفیظ خان نے اس کی مقدور بھر کوشش کی ہے اور اپنی کہانیوں میں عورت کے بارے میں ممکنہ انکشافات کر دیئے ہیں۔ یہ کہانیاں زندگی کا سچ ہیں۔ وہ سچ جو کوڑے کی صورت پڑے پڑے تعفن پھیلانے لگتا ہے یا پھر وہ سچ جو حرامی بچے کی طرح ممتا سے محروم ہو کر گھروں کے آنگنوں میں دبا دیا جاتا ہے۔ مجھے امید ہے، اس سچ کا سامنا کرنے والے، سارے اسباب و علل سامنے رکھیں گے اور زندگی کی ان کی راہوں پر نکل کھڑے ہوں گے جہاں جنس تعفن نہیں چھوڑتی، خوشبو بن جاتی ہے اور حیات کے تسلسل کی علامت بن جانے کے سبب محترم بھی ہو جاتی ہے۔

O

---- اسلام آباد

جون 2001ء

یہ جو عورت ہے

ڈاکٹر سلیم اختر

عورت۔ تصویرِ کائنات میں رنگ یا معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا؟ ظاہر ہے مرد و زن انسان ہی کے دو روپ ہیں بس ان کا دائرہ کار مختلف ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے میں کچھ اسرار تلاش کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ روایت کے مطابق عورت نے مرد کو بہشت سے نکلوایا، لہٰذا وہ گناہ کی ترغیب دینے والی قرار پائی لیکن یہی عورت اپنی دل نوازی، دلداری اور دل سوزی سے مرد کا گھر جنت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ عورت کے بارے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا بصیرت افروز بات منسوب ہے کہ عورت پسلی کی طرح ٹیڑھی ہے اسے اسی طرح قبول کرو کہ سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو ٹوٹ جائے گی۔

کسی بھی مخصوص موضوع پر تخلیقی کام آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لیے وسیع مطالعہ اور بے پناہ ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سونا آسانی سے کندن نہیں بنتا۔ یوں تو کوئی بھی انسانی کہانی عورت کی شمولیت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی لیکن بعض لکھنے والوں نے اپنی تحریروں میں اسے مرکزی حیثیت دی ہے۔ اس کے مثبت و منفی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اس کے لیے گہرا نفسیاتی مشاہدہ اور کردار نگاری پر عبور ضروری ہے۔

اس تناظر میں حفیظ خان کے افسانوی مجموعے ''یہ جوعورت ہے'' کا مطالعہ کرنے پر احساس ہوتا ہے کہ ان کے کچھ افسانے عورت ہیں، کچھ عورت کے بارے میں تو کچھ افسانوں میں عورت بالواسطہ طور پر نظر آتی ہے ،اسی لیے ان افسانوں کا یہی محور قرار پاتا ہے۔''یہ جوعورت ہے''......ان افسانوں کے ذریعے سے آپ بھی عورت سے تعارف حاصل کیجیے۔ یہ اندازِ نَو!

O

(فلیپ ''یہ جوعورت ہے'')

یہ جو حفیظ خان ہے

منو بھائی

یہ جو حفیظ خان ہے اس میں عشق کی ساری خوبیاں اور ادب کی تمام خامیاں موجود ہیں۔ عشق نے اسے ''ماں بولی'' سے پیار سکھایا ہے اور ادب نے سے ایسے موضوعات دیے ہیں جو محض ''ماں بولی'' تک محدود نہیں رہنے چاہئیں۔ غالباً یہ میری فرمائش تھی کہ اپنے افسانوں کو سرائیکی سے باہر کی دنیا کی ہوا بھی لگواؤ۔ خواب بے شک اپنی مادری زبان میں دیکھو مگر ان خوابوں کو زیادہ سے زیادہ آنکھوں تک لے جانے کا اہتمام بھی کرو۔

جس طرح مردوں کی خرابی ہے کہ وہ عورتوں کو مردوں کے ذہن اور آنکھ سے دیکھتے ہیں اسی طرح عورتوں کی یہ خامی ہے کہ وہ مردوں کو عورتوں کے ذہن اور آنکھ سے دیکھتی ہیں اور دونوں اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ مرد اور عورت ہونے کے علاوہ انسان بھی ہیں۔

یہ جو حفیظ خان ہے اس نے ''یہ جو عورت ہے'' میں جو افسانے شامل کیے ہیں وہ تذکیر کے دماغ اور تانیث کی آنکھ سے محفوظ ہیں چنانچہ ''یہ جو افسانے ہیں'' یہ مردانے اور زنانے نہیں ہیں ''انسانے'' ہیں اور بہت اعلیٰ ہیں۔ فکر افروز ہیں۔ خیال انگیز ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ عورت کی گنجھل دار بجھارت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

(فلیپ، ''یہ جو عورت ہے''، 19 / مارچ 1996ء)

حفیظ خان کی افسانہ نگاری

جاوید اختر بھٹی

سید وقار عظیم نے بہت پہلے لکھا تھا کہ ''اچھے افسانہ کی سب سے ضروری اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ افسانہ نگار شروع سے آخر تک اس میں لہجہ اور انداز کی ہم آہنگی کو قائم رکھے۔اس کے جذبہ خاص، اس کی روح اور مرکزی خیال ایسی چیزیں ہیں جن پر افسانہ نگار کو پہلے سے غور وفکر کر کے اپنے تخیل میں صفائی پیدا کرنی پڑتی ہے۔جب تک تخیل میں صفائی اور وضاحت نہیں ہوگی کوئی سلیقہ کی بات کہنی ممکن ہی نہیں۔اچھے افسانے کے بارے میں ممتاز شیریں نے لکھا تھا کہ ''افسانے کی تعمیر میں تکنیک ایک بڑا ضروری جزو ہے لیکن مکمل اور خوبصورت چیز اسی وقت تیار ہوگی جب مواد اچھا ہو، اسلوب تحریر اور بیان اچھا ہو۔فن کار سب کو اچھی طرح گوندھے کہ یہ ہم آہنگ ہو جائیں اور صناعی اور چابک دستی سے ڈھال کر ایسی مکمل اور خوبصورت شکل دے کہ مواد اور ہیئت میں کوئی فرق نظر نہ آئے اور ہم پڑھ کر یہ نہ کہیں کہ اس افسانے کا مواد یا تکنیک اچھی ہے بلکہ یہ کہہ اٹھیں ''یہ افسانہ اچھا ہے''۔

ایک اچھے افسانے کی پیش کش کے بارے میں سید وقار عظیم اور ممتاز شیریں کی رائے میں زیادہ فرق نہیں ہے۔وہ افسانہ نگاروں سے ایک سی توقعات رکھتے ہیں۔یہ تمہید اس لیے تھی کہ میں حفیظ خان کے افسانے پڑھ رہا ہوں اور ان کے افسانے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ایک بار پھر افسانے میں کہانی

زندہ ہوگئی ہے۔ یہاں پر شمس الرحمن فاروقی کے مضمون ''افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ'' کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ جس میں وہ لکھنے پر مجبور ہوگئے کہ ''افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ افسانہ دلچسپ یا تجسس انگیز کیوں نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ہم میں انسانی لگاؤ اور فکرمندی کیوں کم ہے یا افسانہ ہمارے اس لگاؤ اور فکرمندی کو برانگیخت کیوں نہیں کرتا۔''

میرا خیال ہے کہ حفیظ خان اچھے افسانے لکھتے ہیں۔ وہ اس ہنر سے پورے طور پر واقف ہیں کہ اچھے افسانے میں کون کون سے رنگ کیا تاثر دیتے ہیں اور رنگوں کی آمیزش سے کون سا نیا رنگ بنتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ حفیظ خاان کے افسانے عورت کے بغیر مکمل نہیں ہوتے۔ لیکن سبھی عورتیں ظالم ہیں نہ ہی مظلوم، ایک عورت کے بہت سے روپ ہیں لیکن بہروپ کوئی نہیں...... وہ اپنے افسانے میں ''بری عورت'' کی توہین نہیں کرتے، گالی نہیں دیتے، بدکار ہونے کا طعنہ نہیں دیتے۔ اندر سے کھولتے ہوئے جنسی مرد کی طرح افسانوی تشدد نہیں کرتے۔ یہ سب کچھ افسانہ نگار کے اختیار میں ہوتا ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ وہ افسانہ نگاری میں عدم تشدد کے قائل نظر آتے ہیں۔

وہ عام سے گھروں کے افسانے لکھتے ہیں۔ ایسے گھروں کے جہاں اکثر افسانے جنم لیتے ہیں۔ جہاں انسان رہتے ہیں اور حقیقت کے اس قدر قریب ہوتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے ایسا سچا شخص افسانہ نگار کیونکر بن گیا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر کہانی کے اندر موجود ہیں۔ اور ایک کونے میں چھپ کر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جونہی ایک افسانہ مکمل ہوتا ہے تو ایک نئے گھر کی تصویریں ان کے سامنے آجاتی ہیں۔

وہ جدید زمانے کی عورت کی بنیادی نفسیات اور زندگی کی تمام تر تلخیوں کا بھرپور احساس رکھتے ہیں۔ اردو ادب کی عدالت میں ان کے افسانے ''حاصل جمع''، ''کس کے ساتھ؟''، ''مائی بوڑھیا کا کھوہ''، ''[illegible] نے کی عورت''، ''یہ جو عورت ہے''، ''لاہور جان''، ''غیرت''، ''بزدل''، ''دھوپ دیوار''، ''باری باری سرکار''، ''قاتل''، ''تن من سیس سریر'' اور ''الو'' گواہی دینے آئے ہیں۔ ایک افسانہ نگار کے حق میں اتنے افسانوں کی گواہی بہت ہوتی ہے۔ حفیظ خان کے افسانے عورت کے بغیر مکمل نہیں

ہوتے۔

''حاصل جمع'' کی شہلا ایک ماڈرن لڑکی ہے۔اسے غصہ آتا ہے۔وہ دعوت میں چائے کی میز کو الٹ دینے کی جرأت رکھتی ہے۔وہ نڈر اور بے باک ہے وہ کہتی ہے۔''مجھے اس طرح چائے بنانا بالکل پسند نہیں''......''مگر کس طرح''......''اس طرح کہ قہوے میں دودھ ملانے کی بجائے......دودھ میں قہوہ ملایا جائے''......''مگر نیٹ ریزلٹ تو ایک ہی ہوتا ہے کہ چائے بن جاتی ہے''......''لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ بنتی کس طرح سے ہے''......''اف......مگر کیسے''......''ایسے کہ دودھ......روشنی کی علامت ہے اور قہوہ اندھیرے کی......اگر روشنی میں اندھیرا ملایا جائے تو......شام ہوتی ہے اور پھر رات بن جاتی ہے......موت کی علامت......اور مجھے رات سے خوف آتا ہے......جبکہ قہوے میں دودھ ملایا جائے تو اندھیرے میں روشنی گھلتی ہے......اور جب اندھیرا میں روشنی گھلے تو صبح نمودار ہوتی ہے......صبح جو زندگی ہے......''

''کس کے ساتھ؟'' کی ریحانہ ایک ایسی لڑکی ہے جس کے بارے میں عالم برزخ میں دو مرد پریشان ہیں کہ اسے کس کے ساتھ محبت تھی؟ یہ کبھی نہ سمجھ آنے والی لڑکی ہے۔

''مائی بڑھیا کا گھوڑا'' کی ناہید ایک گھریلو عورت ہے۔وہ کتاب چھپنے سے زیادہ گھر میں ٹی وی کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔یہ افسانہ اس المیے کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ کتاب کی اشاعت کے لیے مصنف کو کس کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔

''آٹے کی عورت'' رضیہ ہے۔رضیہ آپا کے روپ میں ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ایک بار پھر میرے سامنے موجود تھی۔اس کے بالوں میں سفیدی کا ذرا سا پیوند ضرور لگ گیا تھا۔بس اس کے علاوہ اس میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔طبیعت میں وہی پہلے جیسی سادگی اب بھی موجود تھی''۔اور''عورت غائب ہوگئی اور اس کی جگہ ایک پروقار سراپے نے لے لی جس کی آنکھوں میں شفقت کی بجائے نفرت کی سرخی شامل تھی۔''

''یہ جو عورت ہے'' اور ''لاہور جان'' ہمارے ہی زمانے کی عورتوں کے جیتے جاگتے کردار ہیں' المیے ہیں جنھیں ہم دیکھ سکتے ہیں اور جنھیں ہم اکثر دیکھتے ہیں۔

''دھوپ دیوار'' میں آصفہ۔''بزدل'' میں شمسہ''غیرت'' میں بیٹی اور ''باری باری سرکار'' میں

بھی ایک لڑکی موجود ہے لیکن ان لڑکیوں کے ساتھ مرد کا مختلف شکلوں میں بھرپور کردار شامل کر دیا گیا ہے۔

یوں یہ افسانے عورت اور مرد کی مشترکہ کہانی بنتے چلے جاتے ہیں۔

''تن من سیس سرپ''۔اور''قابل'' کچھ مختلف کہانیاں ہیں۔یہ مرد کے گرد گھومتی ہیں۔ان کہانیوں میں عورت بھی موجود ہے لیکن مرد کا نمایاں کردار جام مراد اور جمیل اختر ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

میں اپنی رائے پر مجموعی طور پر آخر تک قائم رہا ہوں کہ''حفیظ خان کے افسانے عورت کے بغیر مکمل نہیں ہوتے۔''

حفیظ خان کا فن علامتی ہے نہ تجریدی۔۔۔۔وہ اپنے پڑھنے والوں کو تلاش نہیں کرتے۔کیوں کہ وہ پہلے سے موجود ہیں اور کہانیوں کے منتظر ہیں۔یوں میرے نزدیک حفیظ خان ایک کامیاب فن کار ہیں۔ان کی کامیابی دراصل فسانے میں کہانی کی زندگی ہے۔

آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ''اردو افسانہ''اب حقیقت سے قریب ہو گیا ہے۔اس نے فطرت انسانی کا زیادہ گہرا مطالعہ کیا ہے۔اسے زندگی کی تبدیلیوں کا بھی پورا احساس ہے اگر وہ خطابت اور انشاء پردازی کے چکر سے دور نکل جائے تو اس میں بلندی آجائے۔''حفیظ خان کا اسلوب اور طرز بیان سادہ ہے۔ان کے کردار لمبی چوڑی تقریریں نہیں کرتے اور نہ ہی بلندی پر کھڑے محسوس ہوتے ہیں۔وہ شعوری طور پر اپنے پڑھنے والے کو پریشان بھی نہیں کرتے۔وہ اس معاشرے کے افسانہ نگار ہیں جس میں ہم سانس لیتے ہیں یا گھٹن محسوس کرتے ہیں۔اسی معاشرے کے افسانے،جس میں ہم رہنا چاہتے ہیں۔مزید زندہ رہنا چاہتے ہیں یا فرار چاہتے ہیں۔جلد مر جانے کی تمنا رکھتے ہیں۔ حفیظ خان ہمارے دکھ سکھ کا افسانہ نگار ہے۔اسی لیے وہ ہمارا اپنا افسانہ نگار ہے۔

O

(23/دسمبر 1995ء)

حفیظ خان کی سرائیکی کہانیاں

سندھ وادی کی عورت کا نیا مقدمہ

شمیم عارف قریشی

ترجمہ، تخلیق کا حقیقی متبادل نہ سہی، مختلف اقوام، خطوں اور زبانوں کے درمیان رابطے کا کام یقیناً سرانجام دیتا رہا ہے۔ وادیٔ سندھ میں ہزاروں برس سے تخلیق شدہ ادب اِس خطے کی مرکزی زبان (سرائیکی) میں ہی منتقل ہوتا رہا ہے اور لمحۂ موجود تک یہ عمل جاری وساری ہے۔ ۱۹۱۲ء کے لینگوئج سروے آف انڈیا کے مولف اور محقق گرائرسن نے برِصغیر کی تمام زبانوں سے مقابلتاً ڈیڑھ سو صفحات صرف اور صرف سرائیکی (لہندی) کے لیے مخصوص کرتے ہوئے اسے دنیا کی عظیم کلاسیکی اور تخلیقی زبان قرار دیا ہے۔ اُنیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے معاشرتی و سیاسی عوامل (بشمول اقوامِ یورپ کی بذریعہ سمندر ہندوستان میں آمد، وسطی ہند کی اہمیت، تقسیمِ ہند اور اس کے نتیجے میں وادیٔ سندھ کے قریباً تمام شہروں سے قدیم ترین اور نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ شہری آبادی کا انخلاء وغیرہ) نے اس خطے کے زبان وادب کو طویل عرصے تک مکاشفے سے نہ صرف محروم رکھا بلکہ ایک قعرِ مذلت میں بھی ڈالے رکھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ستر کی دہائی کے تعلیمی انقلاب، وادیٔ سندھ کے دیہی علاقوں میں سکول، کالج اور یونیورسٹیوں کے قیام، مقامی زبان وادب وموسیقی کی ریڈیو اسٹیشنز پر نشریات اور

پاکستان کے چھوٹے صوبوں میں مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کے فیصلے کے برعکس پنجاب میں مادری زبانوں میں تعلیم کی تکفیر اور ستر کی دہائی کے بعد کے زمانے میں پاکستان کے انہی خطوں میں سیاسی او معاشی عدم شراکت کے شدید احساسات نے یہاں کی مقامی زبانوں کے جدید ادب میں مزاحمتی دور کا آغاز کیا۔ سرائیکی زبان وادب کا یہ دور ایک تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ جس میں عظیم تخلیقی تجربے کیے گئے۔ شعری روایت اس دور میں فزوں تر رہی کہ اس خطے میں ہزاروں برس سے شاعری اور اُس کی الحانی روایات نے ہمیشہ اس زبان کو زندگی اور دوام بخشنے میں ایک کردار ادا کیا تھا۔ رفعت عباس، اشو لال، ارشاد تونسوی، عاشق بزدار اور دیگر شعراء نے اِس خطے کی عظیم شعری روایات کو قومی احساس اور تفاخر عطا کیا لیکن ترجمی، تنقیدی، تحقیقی، ڈرامائی و افسانوی ادب میں سرائیکی زبان کو اغلباً اداراتی معاونت کے عدم حصول کی بناء پر وہ سطح میسر نہ آسکی جو شعری اصناف میں حاصل رہی تھی۔

اس دور میں تخلیق شدہ سرائیکی ادب انگریزی اور اُردو میں بوجوہ ترجمہ نہ ہوسکا کہ خصوصاً اُردو کو وفاق کی نمائندہ زبان گردانتے ہوئے، مقامی وقومی زبانوں کے تخلیق کاروں اور ترجمہ نگاروں نے اپنے آپ کو اُردو سے قصداً وغیر قصداً دور رکھنے کی سعی کی۔ مگر حال ہی میں اُردو کو یہاں کی ایک ہمسایہ زبان کے ساتھ ساتھ صحافت اور رابطے کی موجودہ زبان ہونے کے ناطے (لوک ورثہ کے پلیٹ فارم پر لوک ادب کے تراجم کی پذیرائی کے نتیجے میں) پاکستان کے تمام زبان وادب میں تخلیقی تجربوں کے تراجم کا عمل خوش آئند قرار دیا جارہا ہے۔

حفیظ خان جو سرائیکی ڈرامے اور کہانی کے متقدمین میں سے ہے، کی تخلیقات کو اُردو کے قالب میں ڈھالنا اِسی خوش آئند عمل کا ایک حصہ ہے کہ عالمی سطح پر اس کی مثالیں لاطینی اور فرانسیسی زبانوں کی تخلیقات کے تراجم کی ہیں کہ جن سے یورپ میں نشاۃ الثانیہ اور ادبی تحاریک برپا ہوگئی تھیں۔ اِس عمل کا آغاز بھی تراجم سے ممکن ہوا تھا۔ حفیظ خان کی کہانی میں وادیٔ سندھ کی عورت اُس کی کہانیوں کے تراجم سے اُبھر کر کیسے نمودار ہوتی ہے، اِس عمل کو مَن مترجم نے کہانیوں کے تعارفیے کا موضوع بنانے کی بھی ایک سعی کی ہے تاکہ آج کی وادیٔ سندھ اور خصوصاً سرائیکی خطے کی عورت جن عالمی مباحث کا موضوع ہے، اُسے ایک درست تناظر میں دیکھنا ممکن ہوسکے۔

حفیظ خان کی کہانی اِس خطے میں لکھی جانے والی اُردو کہانی یا اُردو بولنے والوں کی لکھی جانے والی کہانیوں سے نسبتاً اِس طرح مختلف ہے کہ اُس نے یہاں کی زمین اور عورت کو آؤٹ سائیڈر کے طور پر نہیں دیکھا۔ زمین کی باس اور عورت کی بساند کو اُس نے ایک آباد کار ای۔ ایم فوسٹر، یا سیاح ابن بطوطہ کے طور پر محسوس کرنے کی بجائے اپنی کہانی کو ایک زمیں زاد کی طرح یہاں کے بیان، محاورے، لب و لہجے اور بیشتر پیش یہاں کے رویّوں سے نمو بخشی ہے۔ اس کی کہانیاں وادیٔ سندھ کی چلتی پھرتی تصویریں بھی ہیں۔ اس کی کہانی میں عورت کا مرکوز ہونا یہاں کے تاریخی جبر کی نشاندہی کرتا ہے جس نے ابھی تک یہاں کی شاعری کو الیے کے طور پر اپنے پھیلاؤ میں رکھا ہوا ہے۔ الیے کی یہ عظیم رو جس سے سرائیکی شاعری لبریز ہے، حفیظ خان کی کہانی کو بھی ایک سمت دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اُس کی کہانی صرف مجبور محض عورت کا بیانیہ ہونے کی بجائے آج کے عہد میں ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بھی بن کر اُبھر رہی ہے کہ عورت کے حوالے سے اُس کی وفا زیادہ اہم ہے یا اُس کے حقوق؟...... آج کے قاری کے لیے یہ کہانیاں اِسی سوال کی تجسیم بھی ہیں اور اُس کی تفہیم بھی۔

ہزاروں برس پیشتر دنیا کا قدیم ترین شعر و ادب وادیٔ سندھ میں تحریر کیا گیا تھا۔ مستشرقین نے یہاں کی ویداؤں (بشمول رگ وید، جو ویداؤں میں اوّل اور وادیٔ سندھ کے مرکزی شہر اغلباً ملتان یا ملوہا میں تحریر کی گئی تھی) کو اوّل آثار قرار دیا ہے (Oxford Companion to English Literature Page 819- First Edition 1932, 3rd 1950) اس لحاظ سے قرطاس ابیض پر نمودار ہونے والا پہلا شعر اور ابتدائی نثر اِسی علاقے سے متعلق ہے۔ قصہ گوئی اور شاعری یہاں کے لوگوں کے خمیر میں رچی بسی ہے۔ یہاں کا الحان و بیان، شعر و فسوں سے مربوط ہے کہ جہاں پر دنیا بھر کے مقابلے میں خورد و نوش افراط میں رہا ہو اور جس خطے کے دستر خوان پر دنیا بھر کی اقوام، درویش سے لے کر حملہ آور تک، تمتع حاصل کرتی رہی ہوں، وہاں کے باشندوں کے پاس فنونِ لطیف اور خصوصاً قصہ گوئی کے لیے اضافی وقت اور خصوصی ذوق رہا ہوگا۔

یہاں تاریخی طور پر، ابتداء ہی سے زرعی سماج کے معرضِ وجود میں آنے اور علیٰ ہٰذا القیاس تقسیمِ کار کی اوّلیں توضیع نے کارِ حیات میں ایک تنوع پیدا کیا، اس نے کُرۂ ارضی پر اوّلیں خطۂ امن

تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ، یہاں اور باہر کی کوہستانی اور صحرائی دنیاؤں کے باشندوں کی نامطمئن اور یک رُخی زندگی کے لیے انتہائی کشش اور بے کراں جذب کا ساز و سامان مہیا کیا تھا۔ وادیٔ سندھ کی ماقبل وید معاشرت امن و آشتی کے معراج پر یقیناً بلاوجہ فائز نہیں تھی کہ امن ہمیشہ خوشحالی اور خوشحالی مساوات ہی سے عبارت رہی ہے۔ وادیٔ سندھ کا قدیمی ویدک ادب شاہد ہے کہ اشتراک، تخلیق اور وجود اس کے موضوعات رہے ہیں جنھوں نے یہاں کی معاشرت میں رشتوں کے توازن کی تشکیل میں مدد دی۔ اُس دور کے ادبیات میں ہمہ نوع حیات کی یہی وجوہ ہیں۔

وادیٔ سندھ کی زندگی میں مرد کے بین بین عورت کے مقام اور ادب میں وجودِ زن کی توانائی نے اُسے ہمسایہ خطوں میں ممیز و ممتاز رکھا اور گمان غالب یہی نظر آتا ہے کہ اِس وادی میں یہاں کی بھرپور معیشت کے ساتھ ساتھ یہاں کی توانا اور فعال نسائی حوالوں سے پُرکشش معاشرت نے بھی بیرونی خطوں سے دراندازی اور حملہ آوری کو اسباب فراہم کیا تھا۔ وادیٔ سندھ کے ہر سہ مراکز موہن جو دیرو، ہڑپا اور ٹیکسلا سے دریافتہ فنون میں یہاں کے زندگی سے معمور نسوانی مجسمے ڈانسنگ گرل اور سلیپنگ سنگر، ماقبل وید یا دراوڑی دور کی صحت مند اخلاقیات کا ثبوت ہیں کہ جسے آریاؤں کی جابرانہ اور بنیاد پرست اخلاقیات کے ہاتھوں تاراج ہونا پڑا۔ یہ امر اس بات کی مکمل دلیل ہے کہ وادیٔ سندھ کے دیگر لطیف فنون کے ساتھ ساتھ یہاں کے شعر و سخن میں وجودِ زن اپنی معراج پر تھا۔ قصہ گوئی کی روایت سے جونہی قصہ نویسی وجود میں آئی یہاں کے فنکار نے عورت کے وجود میں حلول ہو کر اپنے تخلیقی اظہار کو ہمیشہ ممکن بنایا۔ رگ وید سے آج اکیسویں صدی عیسوی کے وادیٔ سندھ کے شعر و سخن کے فن پاروں میں زندگی کو عورت کے استعارے سے بیان کرنے کی روایت آج تک رواں نظر آتی ہے۔

آثارِ تاریخ سے عیاں ہے کہ دراوڑی دور تک سماج اور ادب میں عورت کی نمائندگی اور اظہار صحت مند سطح پر رہا ہے۔ ٹیکسلا، ہڑپا اور موہن جو دیرو سے برآمدہ نسوانی مورتیوں میں مغنیاؤں، رقاصاؤں اور دیگر لطیف پہلوؤں کی موجودگی اور ماہرانہ سطح پر اُن کے عمیق جائزے اسی امر کے گواہ ہیں کہ زن، زر اور زمین اس سماجی دباؤ سے آزاد رہے تھے جو سماجی دباؤ بعدہٗ آریائی حملہ آوروں اور اُن کی تشکیل کردہ اخلاقیات اور بہر صورت ملکیت کے تصور کی وجہ سے تشکیل پذیر ہوا کہ قبضے کی مذہبیات

بیرونی خطوں سے درآمد ہوئی جو مابعد آریائی زمانوں میں بھی بُدھ مَت، ہندومَت اور اسلام کے نام پر معدودی استثنیات کے باوجود عورت اور کمزور مقامی مرد کے خلاف ایک جبر کے طور پر جاری وساری رہا اور متذکرہ سماج میں لمحۂ موجود تک جاری وساری ہے۔

ماقبل آریائی یا دراوڑی عہد میں ہی عورت کی توقیر اور سر بلندی ممکن تھی کہ مقامی مرد کا وسائل (بشمول زن، زر، زمین) پر حملہ آوری انداز میں بے محابہ کشت و قبضہ اُس کا مسئلہ نہیں بنتا تھا۔ آریائی اخلاقیات کے نفاذ کے نتیجے میں مادرسری نظام (قلیل زوجگی یا یک زوجگی) کا سرِ موخاتمہ اور پدرسری نظام (کثیر زوجگی) کی شروعات نے جہاں یہاں کی قدیم معاشرت (جو آج کے معروف معنی میں مساوات کے بہت قریب تھی، وادئ سندھ کی مرکزی اور تاریخی وارث زبان 'سرائیکی' میں آج بھی لفظ' نوکر ' کا مقامی متبادل دستیاب نہیں ہے، قریب ترین دستیاب متبادل لفظ 'بیلی' ...... دوست، شریکِ کار اور محبوب کے معانی کا حامل ہے) کو منقلب کر کے رکھ دیا۔ حملہ آوروں نے بادشاہوں، جابر سلاطین اور اُن کی معاون و مربی اشرافیہ کو جنم دیا اور یوں وادئ سندھ میں ازمنۂ قدیم سے آزاد، با توقیر اور صاحبۃ الرائے عورت، کثیر زوجگی کے زعم پر حرم کی زینت اور مرد کی کاذب انا (شاونزم) کی علامت بن کر رہ گئی اور اُس کی جسمانی اسیری کو چادر اور چاردیواری کا نام دے دیا گیا۔

وادئ سندھ کا زرعی سماج اور مساویانہ معاشرہ کہ جس کے معاشی کردار میں مساوی شریکِ کار کے طور پر عورت رہی تو ضرور، مگر سماجی سطح پر ہمسایہ اقوام کے حملہ آور کہ جو قبائلی کردار کے حامل تھے، اُنہوں نے قبائلی اخلاقیات کے نفاذ کے نتیجے میں اُسے اپنی ذات کے اظہار اور فیصلہ کے حقوق سے محروم کر دیا۔ نتیجتاً وادئ سندھ کی عورت جو یہاں کے زرعی سماج میں اپنے بھرپور کردار کی بنا پر سماجی، روحانی اور فنّی سطح پر ارفع رہی تھی، محض اور محض اپنے باپ، بھائی، خاوند اور بیٹے (جو پدرسری سماج کے رشتے تھے) کی عزت اور ملکیت ہی بن کر رہ گئی۔ معاشی سطح پر قبائلی سماج کے برعکس زرعی سماج کے فعال کارکن ہونے کے باوجود اُسے اپنی زندگی کے فیصلوں سے خارج کر دیا گیا۔ بالفاظِ دیگر یہاں کی عورت کو کارِ حیات عطا کر کے شرکتِ حیات سے محروم کر دیا گیا۔ اُسے فرائض تو دراوڑی دور کے تفویض کیے گئے مگر اُس کے حقوق کا انکار آریائی انداز میں کیا گیا کہ یہاں کی عورت دیہات

کی ستر فیصد آبادی میں مخلوط فرائض کی انجام دہی میں فحش نظر نہیں آتی لیکن شہر کی تیس فیصد آبادی کی عورت اسپورٹس اور میراتھن میں فحاشی کی مرتکب دکھائی دیتی ہے۔

عورت پر سماجی دباؤ کے اِس عمل نے اِس خطے میں ایک عظیم المیہ کو جنم دیا جو اِس خطے کی قدیم اور تاریخی زبان سرائیکی نے اپنے شعر و سخن میں دنیا کے سب سے بڑے المیے اور مرثیے کی صورت میں ریکارڈ کیا ہے۔ یہاں کا مرثیہ بنیادی طور پر شعر اور کہانی کا الم انگیز امتزاج ہے جس سے سندھ وادی کی سرائیکی زبان کا کم و بیش سارا ادب پھوٹتا ہے۔ اور آج تک کی کہانی 'تریمت کتھا' کی صورت میں جاری وساری ہے۔ حفیظ خان کی کہانی، جس نے سرائیکی کہانی کاروں کے متقدمین میں پیشرو کا کردار ادا کیا ہے، اِسی 'تریمت کتھا' کا معاصر حوالہ بنتی ہے۔ حملہ آوری اور آریائی اخلاقیات کے نتیجے میں تشکیل شدہ سماج میں مسلسل ایک سماجی دباؤ کا شکار آج کی عورت، چہار جانب کے منقلب معاشروں سے قطع نظر، اپنے اور سماج کے رشتوں کے نئے توازن کی کس طرح متلاشی ہے (مختاراں مائی کا مقدمہ یہاں اور باہر کے سماج کی نگاہ میں کس ہزیمت کا حامل ہے، مثال کے طور پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے)۔

بیسویں اور اکیسویں صدی عیسوی بھی وادئ سندھ کی عورت کے لیے بدقسمتی کا تسلسل ثابت ہو رہی ہے۔ ہمسایہ خطوں میں بہت بڑی تبدیلیوں (ایران میں شاہ پرستی کا خاتمہ، افغانستان میں ایک طویل خانہ جنگی کے بعد جدید تصورات کی آمد، تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ہندوستانی معاشرے میں جاگیروں کا خاتمہ وہاں دنیا کی سب سے بڑی مڈل کلاس کی پیدائش اور عظیم خواندگی) کے ظہور کے باوجود، وادئ سندھ کی عورت ہزاروں برس کے روایتی جبر اور تسلط کا شکار چلی آ رہی ہے۔ پیداواری معاشرے میں عورت کی بھرپور شرکت اور زبان بندی کے تضاد کے باوجود مرد کی عورت سے مکمل وفاداری کی توقعات ہی یہاں کی عورت کے المیے کو جنم دے رہی ہیں۔ امرِ حیرت ہے کہ پوری دنیا میں عورت کی زبان بندی کم و بیش لوک کہانی یا قصۂ پارینہ بن چکی ہے مگر وادئ سندھ میں عورت کی گلو بندی ایک زندہ کہانی ہے۔

یہاں آج کے معاشرے کے تمام ادارے بشمولِ خاندان، مذہب اور ریاست بنیادی انسانی حقوق کی ادائیگی کے بغیر وفاداری کے تمام قوانین صرف اور صرف عورت پر نافذ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ یہ معاشرہ عورت کو تقدیس اور فحاشی کے درمیان کوئی نارمل رشتہ تفویض کرنے کے لیے

تیار نظر ہی نہیں آتا۔ یہ کم وبیش وہی کیفیت ہے کہ جس کی نشاندہی بیسویں صدی کے وسط میں یورپی معاشرے کے حوالے سے معروف فلسفی برٹینڈ رسل نے اپنی تحریر Man, family & Society میں کی تھی کہ عورت کی بے وفائی کے پس منظر میں اُس کے بنیادی حقوق کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ وادیٔ سندھ کا معاشرہ بھی کم وبیش اِسی صورت حال سے دوچار ہے۔

اِس خطے کی لوک کہانیوں اور عشقیہ داستانوں سسی پُنوں، ہیر رانجھا، مرزا صاحباں اور دیگراں میں عورت کی وفاداری یا عورت سے وفاداری ایک بنیادی موضوع کے طور پر نظر آتے ہیں۔ لوک کہانیوں کی تمام تر مقبولیت اور پذیرائی کے باوجود اِن کہانیوں (جو یہاں واقعات کے طور پر بھی لیے جاتے ہیں) کے نسوانی کرداروں کے حوالے سے رضائے نسوانی کو ایک بنیادی انسانی حق کے طور پر نہ لیے جانے کے باوجود، بالعموم اور بالائی و وسطی پنجاب کے علاقوں میں بالخصوص شرمندگی اور مردانہ شاونزم کے طور پر لیا جاتا ہے۔ نسوانی رومانی کرداروں کو مقدس یا فحش حوالے کے طور پر لیا جانا ہی یہاں کی اجتماعی مردانہ نفسیات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جو یہاں کی عورت کو ایک نارمل فردِ معاشرہ کے طور پر قبول کرنے سے منکر ہے۔ حفیظ خان نے اپنی کہانیوں میں وادیٔ سندھ کی عورت کے انہی نسائی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے جو اِس خطے میں نہ صرف عظیم المیے کی وجوہ میں سے ہیں بلکہ یہاں کی عورت کے گم شدہ کردار اور ایک نئے توازنِ رشتہ داری کی ضرورت کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

حفیظ خان کی کہانیوں میں، وادیٔ سندھ کی سرائیکی شاعری کی قدیم روایت کی طرح سماج کے کمزور ترین افراد اور کمزور ترین افراد میں بالخصوص عورت کے الم اور اُس کے اسباب وعلل کی نشاندہی کرنے والے جملہ عناصر کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اُس کی کہانیوں میں (بشمول حالیہ وسابقہ مجموعے) اِس وادی کے موجودہ سماج کی عورت کی کیفیتِ وفا اور توازنِ رشتہ وتعلق کو بار اول استفہام کے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ اور بظاہر ناتواں و نادان نظر آنے والی یہ عورت آج کے معاشرے میں مرکزِ قوت کی شناخت اور زیرِ سطح اُس کے حصول کی جس جدوجہد میں کارفرما ہے، اُسے بھی اِن کہانیوں کے نسوانی کرداروں سے آشکار کیا گیا ہے۔ اپنی تحریکاتِ نفسی ونفسانی اور اُمیدِ حیات کا بظاہر بلیدان کرنے والی یہ عورت اپنی خواہشِ خُفتہ کو کس طرح بیدار کرتی ہے اور اِس معاشرے

میں وفا بالجبر کی بجائے وفا بالنفس کی طرف کس انداز میں رجوع کرتی ہے، قابل دید ہے۔
حفیظ خان کی کہانی 'اِک اور بھنور گرداب میں' اسی تصور کی مُبیّن اور مُرقّع ہے۔ اسی کہانی کی مرکزی کردار خاتون 'کنیزاں' کہانی کے آغاز میں نئی نویلی دلہن کے طور پر افرادِ خانہ میں کس طرح مرکزِ ثقل کو تلاش کرتی اور Total Surrender میں چلی جاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

''مرد چونکہ عموماً شادی کے بعد اپنے گھر میں رہتا ہے مگر عورت کا پودا، کسی دوسری جگہ سے نکال کر اجنبی زمین میں لگا دیا جاتا ہے...... اس لیے اُسے نئے نئے رشتوں کو نہ صرف احتیاط سے سنبھالنا ہوتا ہے بلکہ اُن کی اِس طرح آبیاری کرنی پڑتی ہے کہ معمولی لغزش بھی سرزد نہ ہونے پائے...... سمجھ دار لڑکیاں نئے گھر میں جاتے ہی سب سے پہلے اختیارات کا مرکز تلاش کرتی ہیں۔''

معاشرتی دباؤ کا سب سے بڑا شکار یہاں کی عورت نظر آتی ہے۔ اپنی بقاء کے لیے اپنی خواہشات کی قربانی، اپنے محبوب اور خاوند دونوں کو قربان کر کے بھی دے سکتی ہے۔ دباؤ کی اِس نفسیات سے نکلنے کے لیے اُسے ایک عمر چاہئے اور پوری عمر یونہی بیت جاتی ہے۔ عورت کی خواہشاتِ نفسانی کا احیاء اُس کے خاک ہو جانے کا کس طرح منتظر رہتا ہے، یہ بھی اسی کہانی میں ملاحظہ ہو۔

''تن سہل ہُوا تو من میں بھی وہ ساری اجنبی لہریں پھر سے جاگ پڑیں جو لڑکپن میں ساری ساری رات جگاتی تھیں۔ کنیزاں کا دل چاہتا کہ غلام حسین دوکان پر نہ جائے اور بس اُسی کے ساتھ بستر پے پڑا، اُس کے بدن کو اِس طرح جھنجھوڑے، کُچلے، مسلے اور کھنگالے کہ مسام اور ماس تو کیا، ہڈیوں کے گودے تک سے آلس، کاہلی اور سستی نچوڑ ڈالے۔

اُس نے پہلے پہل تو آنکھ ناک کے اشارے سے متوجہ کرنے کی کوشش کی، پھر باتوں باتوں میں ہلکے پھلکے نوٹس اظہارِ وجوہ شروع ہوئے...... اب بھی نہ سمجھا تو ہار سنگھار، چھیڑ چھاڑ، دانت سے کاٹنا، بکوٹا لے لیا، مگر جب غلام حسین نے کسی بھی عمل کا ردِ عمل ظاہر نہ کیا تو ایک دن بول ہی پڑی...... 'آپ کو میرا کچھ خیال ہی نہیں۔''

عورت کے بحرانِ وفا سے اُس کی وفا بالنفس کس طرح نمودار ہوتی ہے کہ جب کنیزاں استردادِ حق کے نتیجے میں ماضی میں محبت کرنے والے خاوند غلام حسین کا ہیولا اُس کے نوخیز ملازم کی

صورت میں تلاش کر لیتی ہے۔

''مگر یہ کیا، یہ تو غلام حسین تھا، بیس بائیس برس پہلے کا غلام حسین، ویسا ہی تیکھا تیکھا اور سلونا، جس کی گرفت ہڈیاں کڑکا دیتی تھی، وہی پکڑ جو ساری اکڑ نچوڑ لیتی تھی۔ ششدر آنکھوں کے ساتھ کنیزاں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ لڑکا کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر اُسے کوئی بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اُس نے سر جھٹک کر سننے کی کوشش کی، مگر اُلٹا آنکھوں کے سامنے شیشے سے آ گئے، لڑکے کا چہرہ بھی دھندلا گیا۔ کنیزاں نے آنکھیں مَل کر پھر سے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ غلام حسین ہی تھا، شادی سے پہلے والا غلام حسین۔''

انہی دو جذبوں کا بحران ایک رویہ بن کر یہاں کی عورت کے ردِ عمل کی تشکیل کا باعث بن رہا ہے۔ بحرانِ وفا، شادی کے ادارے کے نتیجے میں پیدا شدہ خاوند اور بیوی کے رشتے کو کیوں کر شکست سے دوچار کر کے وفا بالنفس (جو بظاہر سماجی انتقام کی شکل کا مظہر لگتا ہے) میں کس طرح تبدیل ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں کی عورت کثیر زوجگی جو آریائی اخلاقیات کے طور پر در آئی، کو کس طرح باطنی وظاہری طور پر دیکھتی، محسوس کرتی اور اُس کے خلاف نبرد آزما ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر حفیظ خان کی دو اور کہانیوں 'ناز و نکھیلا' اور 'منشا اور میاں منشا' میں ہر دو خواتین کردار نصیب خاتون اور صبیحہ بی بی اپنی تکمیلِ ذات، خودی (انا) اور تحفظِ ناموسِ ذات کے لیے جس ردِ عمل کی طرف گامزن ہوتی ہیں، وہ آج کی وادیٔ سندھ کی عورت کے حقوق کے حوالے سے ایک نئی اخلاقیات کی ترویج کے لیے لمحۂ استفسار ہے۔

''شروع شروع میں تو نصیب خاتون خاصی زچ ہوتی، مگر کیا کر سکتی تھی، اپنے آپ ہی کو کھاتی رہتی اور پھر رفتہ رفتہ یہ اُس کی عادت ہوتی چلی گئی۔ شادی کے بعد سال ڈیڑھ سال تک بچے کی خواہش تو تھی مگر ہبلا سا نہ تھا۔ اِس ماہ نہیں تو اگلے۔ لیکن اِس کے بعد تو باقاعدہ پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ آخر چار چھ مہینے بعد میکے سوہڑے جانا ہی پڑتا۔ جتنے منہ اُتنی باتیں اور جیون خان بالکل ہی لاتعلق، فکر نہ فاقہ۔ جواب دہی کا عذاب جھیلے تو نصیب خاتون، ہتڑں مارے (کوشش کرے) تو نصیب خاتون، کہیں سے تعویز، پھُل، ٹونا ٹوٹکا، گولی پھکی...... اِسی جان ماری میں بیس برس گزر گئے۔''

مرد کی تکمیل عورت اور عورت کی تکمیل اولاد بالخصوص اولادِ نرینہ ہے۔ وادیٔ سندھ کی عورت

یہاں کے تسلطِ مردانہ پر مبنی سماج کی شدت کے ردِعمل میں کس طرح اُترتی اور اپنے تحفظ اور تکمیل کے لیے بظاہر مروج و معروف اخلاق سے پہلو تہی کرتے ہوئے جداگانہ طریق اختیار کرتی ہے۔

''جیون خان نے نازو کی چلتی ہوئی نبض دیکھی تو جان میں جان آئی۔ پھاپھو (نوکرانی) کو کچھ اس طرح ڈانٹا کہ اُس کی چیخیں سرد ہو کر رہ گئیں۔ اب اُس نے اپنا رُخ نصیب خاتون کی طرف کیا۔ ایک ہاتھ میں گُت کیا آئی، پشت کی جانب اتنے زور سے کھینچا کہ گردن دوہری ہو کر کمر سے لگ گئی۔ اب نصیب خاتون والا جن اُس کے بدن میں حلول کر گیا تھا۔ نہ دیکھا مرتی ہے کہ جیتی، مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ 'دفع ہو جا بنجر عورت...... خود تو پھانسی چڑھے گی، مجھے بھی خوار کرے گی۔ جیون خان تو کچھ دیر بعد دفتر چلا گیا، اب مسئلہ ماسی پھاپھو کے لیے کہ بی بی کو سنبھالے کہ نازو کو۔ نازو نے تو پھر بھی اُف تک نہ کی مگر نصیب خاتون کے لیے یہ سب کچھ خلافِ توقع تھا۔ ڈوب مرنے کا مقام تھا کہ جس شوہر نے پوری زندگی کبھی اُنگلی کھڑی نہ کی، آج بس ایک نوکر کے لیے پورے جسم کو لہولہان کیا سو کیا، بنجر ہونے کا طعنہ بھی دے گیا۔''

اِس کہانی میں نصیب خاتون کا اپنے نوکر نازو کے ساتھ فرار کا واقعہ اور اس پر اُس کے خاوند جیون خان کی خودکشی، دونوں وادیٔ سندھ کے آج کے سماج کی حقیقی تصویر قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اِس خطے میں ونی، وٹی، وٹہ سٹہ، تیزاب پاشی، چہرہ سوزی، بدن سوزی اور کاروکاری جیسی رسوم آج بھی بنیادی طور پر مردانہ تسلط کے ہر قیمت پر نفاذ کی مختلف صورتیں ہیں۔ جیون خان کی خودکشی بھی اِسی بحران کے ردِعمل کا ایک سانحہ ہے کہ جہاں مرد اپنے تمام تر قوانین یہاں کی عورت اور صرف عورت پر نافذ کرنے میں ناکامی کی سبکی کے طور پر محسوس کرتا ہے۔ عورت کی تکمیلِ ذات جو بہر صورت اُس کی پیدائش اولاد اور پیدائش اولادِ نرینہ سے مشتق ہے، سے منکر ہو کر ایک مرد بصورت خاوند، بھائی، والد یا اقرباء عورت کش حملوں پر اُتر آتا ہے۔ آج کی جدید سائنسی تحقیقات اور خصوصاً جنیاتی علوم (Genetics) نے اب آ کر یہ ثابت کیا ہے کہ عورت کے بانجھ پن میں مرد بھی برابر یا اُس سے فزوں تر شریک ہے۔ یہاں کی عورت کے حقِ حصولِ اولاد کو اور زیادہ مضبوط کرتا ہے اور مرد کے بانجھ پن کے ساتھ ساتھ یہاں پر اُس

کی آریائی، قبائلی یا مردانہ اخلاقیات کے بانجھ پن کو بھی آشکار کرتا اور عورت کے اقدامِ حصولِ اولاد کو مردانہ جبر کی موجودگی میں جواز فراہم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

یہی کیفیت حفیظ خان کی دوسری کہانی 'منشا اور میاں منشا' میں موجود ہے کہ جہاں مردانہ مرکزی کردار میاں منشا کی جنسی سرگرمی کی وجہ محض وجۂ نشاط ہے، وہیں نسوانی کردار میاں منشا کی بیگم صبیحہ بی بی کے اشارتاً بیان کردہ بظاہر غیر اخلاقی قدم کی وجہ، وجۂ حصولِ اولادِ نرینہ ہے جو آج کے اکیسویں صدی کے سائنسی و علمی شعور کے مطابق صحت مند و توانا عورت کی جبلی ضرورت ہے۔ احتیاجِ اولادِ نرینہ کی یہی کیفیت حسبِ ذیل ہے:

> ''میاں منشے کی شادی کو سات برس ہو چلے تھے۔ پہلے برس بیٹی پیدا ہوئی مگر پھر تو جیسے بریک لگ گئی۔ تعویز، دھاگہ، دعا دارو، دَم درود، خاک شفا، گولی پھکی ......مگر بیٹے کی خواہش، خواہش رہ گئی۔ ایک عرصے تک تو صاحب نے خاصے رسے تڑوائے کہ جاگیر کے وارث کے لیے عقدِ ثانی کر لیا جائے، مگر اُس کی بیوی صبیحہ بی بی شہر کی پڑھی ہوئی، ایم اے پاس، باپ مرکزی وزیر، بڑا بھائی ضلع کا سیشن جج، چھوٹا ڈپٹی کمشنر اور ماموں صوبائی اسمبلی میں قایدِ حزبِ اختلاف...... اب اِن سے بھلا کون اختلاف کرے۔ چھوٹے موٹے کھڑکے دھڑکے پر ہی میاں منشا حوصلہ ہار بیٹھا اور سسرال کی ہاں میں ہاں مِلاتے ہی بن پڑی کہ اللہ بیٹا دے گا تو اسی سے ورنہ شکر الحمدللہ۔
>
> صاف لگتا تھا کہ یہ گُل گھوٹو میاں نے، مرتے کیا نہ کرتے کے طور پر قبول کیا تھا وگرنہ اُس کے اندر تو نری آگ تھی، شعلے تھے، کھولاؤ تھا۔ تپش حد سے بڑھی تو یوں در آنے والی یہ دراڑ، زنان خانے اور ڈیرے کی درمیانی چوکھٹ تک آن پہنچی۔ فاصلہ زیادہ ہوا تو دراڑ خلیج بنتی چلی گئی۔ ردِعمل میں میاں منشے نے ڈیرے کو شباب کی قوس و قزح سے منور کر لیا۔''

یہ کہانی اپنے اختتامیہ پر ڈرامائی ہونے کی وجہ سے قاری کے لیے تفہیم مزید کا باعث بنتی ہے۔ نوکر منشا اپنی خودکشی سے پہلے، مالک میاں منشے کے لیے سامانِ تعیش کا وسیلہ بننے کے ساتھ ساتھ، اپنی مالکن کے لیے بھی وسیلۂ اولادِ نرینہ ثابت ہو چکا تھا۔ اختتامی جملوں سے پوری کہانی کا تاثر

منکشف ہوتا ہے۔

''اندر کمرے میں منشے کی لاش رکھی تھی۔ منشا گذشتہ شب کو کیڑے مار زہر پی، بیوی کو بیوہ بنا، میاں منشے سے ہاتھ کر گیا تھا۔ حاکم بے بس ہوا تو سوائے اپنا خون جلانے کے اور کوئی یارا نہ رہا، سو برداشت کر گیا۔ مگر کھیل ابھی باقی تھا۔ کیونکہ اِس کے چھ ماہ بعد، میاں منشے کے گھر بیٹا پیدا ہوا

کالا کنڑ چھا اور ٹھگنا......

پاؤں کی انگلیوں سے ناک کے نتھنوں تک، ہر انگ موٹا موٹا اور بھدا، جیسے کسی نے مٹی کے ڈوبے مار مار کر مجسمہ بنایا اور پھر اُس کی تراش خراش کیے بغیر، چابی دے کر چلنے کے لیے چھوڑ دیا......پڈک، پڈک، پڈک۔''

حفیظ خان کی دیگر کہانیاں بھی یہاں کی عورت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ آریائی اخلاقیات جو بنیادی طور پر یہاں کے سیاہ فام باشندے کے خلاف رہی ہے، سیاہ فام عورت کو کس طرح مطعون وملعون قرار دیتی ہے اور یہاں کی دانائی اور سچائی کے طور پر بھی پیش کی جاتی رہی ہے، اس کا اظہار حفیظ خان کے ایک اور مجموعے کی کہانی 'مائی بڑھیا کا گھوڑا' میں موجود ہے کہ جس میں وجودِ تانیث، تذکیر کی حیات کے خاتمے کے طور پر پیش کیا گیا۔ وادیٔ سندھ میں آج بھی بیوی کا خاوند سے پہلے مرنا مباح اور خاوند کا پہلے مرنا، بیوی کے لیے اور بیوی کی نحوست ہی قرار دیا جاتا ہے۔ بیوہ کی دوسری شادی کی دیگر رکاوٹوں میں ایک رکاوٹ اُس کا مرد کُش اور نحس ہونا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ اِس کا اظہار کچھ یوں ہے:

''سنانے والے نے سنایا کہ یہ شاید دنیا کا واحد ذی روح ہے کہ جسے اُس کی مادہ ملاپ کے وقت اِس طرح کھا جاتی ہے کہ اُسے پتہ بھی نہیں چلتا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی ذی روح کو کھایا جائے اور اُسے پتہ بھی نہ چلے'

میں نے پوچھا

سنانے والے نے مزید سنایا' اس کے جسم میں تین جگہوں پر اعصابی نظام کے مرکزے ہوتے ہیں، سر، دھڑ اور دُم کی طرف......اُسے مستی میں دیکھ کر مادہ پہلے اُس کا سر کھاتی ہے، پھر دھڑ اور بے چارے کو پتہ تب لگتا ہے جب دُم آن پہنچتی

ہے......تو اِس طرح نَر اور مادہ دونوں اپنی اپنی بھوک مٹا لیتے ہیں۔"

عورت کے حوالے سے غلامی اور اسیری کی دیگر صورتوں کے علاوہ مرد کا کم عمر عورت کے ساتھ شادی کرنا بھی ہے کہ کم عمری میں کسی کو زیرِ دست کرنا، سِدھانا اور خواہشات کی بجا آوری کے قابل بنانا (ایک کم عمر جانور یا جاندار کو پالتو بنانے کی طرز پر) نسبتاً آسان ہے۔ شادی کے ادارے میں جہاں مرد کی نسبتاً زیادہ عمر ایک صفت کے طور پر شمار ہوتی ہے وہیں ایک عورت کی خاوند کے ساتھ ہم عمری یا زیادہ عمر سماجی سطح پر ایک تمسخر یا پھبتی کے طور پر لی جاتی ہے اور اِس طرح کی رفاقت ہم خیالی کی بجائے عورت کے لیے ایک مسلسل بے توقیری اور بے حیثیتی پر منتج ہوتی ہے۔ اِسی کہانی میں ایک مثال ملاحظہ ہو:

"بزرگو......ہائے ہائے ایسی بوڑھی تھی تو پھر شادی کیوں کی تھی میرے ساتھ، اُس وقت تو چاند کا ٹکڑا تھی، پھولوں کی رانی تھی......بھلا کیوں دکھائی نہ دی تھی میری عمر ......اور آخر مجھے ہے کیا، صرف سات برس تو بڑی ہوں۔ پھر تم بھی تو لڑکے بالے نہیں ہو ناں' ...... یہ سب کچھ بیگم نے حسبِ معمول اِتنے جوش سے کہا کہ اُسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔"

عورت میں زوالِ حیات کی کیفیت مرد کے مقابلے میں خاصی شدید دکھائی دیتی ہے جسے حفیظ خان نے آج کی زندگی سے ایک حقیقی رنگ کے طور پر عورت کی تصویر اور تجسیم میں ایک جھلک کے طور پر دکھانے کی کوشش کی ہے۔

"جی ہاں! اِتنی بھولی بھالی بھی نہیں......سب سمجھتی ہوں، ساری منافقت ہے۔ میں جب اِس گھر میں آئی تھی تو یاد ہے ناں میرا رنگ روپ، اور اب تو میرا خون پی لیا ہے تمہارے گھر نے، پیلی زرد ہو گئی ہوں۔"

عورت کا تعلق یکتائی اور حقِ یک زوجگی، ردِعمل کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ عورت مرد سے شکست خوردہ ہونے کے نتیجے میں مرد کی بجائے دوسری عورت ہی کو اپنے دُکھ کی وجہ قرار دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

"کیا کہا...... گلے پڑ گئی ہوں، ہاں اب تو گلے پڑوں گی ناں اور وہ نک چڑھی فرزانی جو دماغ پر سوار ہے ناں، ایک کا گھر برباد کیا ہے، طلاق لی ہے اور اب ذلیل، کمینی میرے گھر پر نگاہ ٹکائے بیٹھی ہے۔"

مرد سے زیادہ عورت کی سیاہ فامی اُس کی بدقسمتی سے عبارت رہی ہے۔ سفید فام آریائی

رنگ و نسل کی برتری نے وادئ سندھ میں مقامی رنگت کی عورت کو سماجی طور پر مزید بے حیثیت و بے وقعت کر دیا۔ حفیظ خان کی کہانی 'تن مَن سیس سریڑ' اِسی کیفیت کے تاثر کے ساتھ اپنے قاری پر وا ہوتی ہے۔ زمیں زادگی اور سیاہ فامی کس کس انداز سے قابلِ تبرّیٰ ہے اور معیارِ حُسن کے مردانہ اور غیر مقامی معیارات یہاں کی جمالیات کی تشکیل کے عمل پر کس طرح اثر انداز ہوتے رہے ہیں، اِس کہانی کے ابتدائیے میں ملاحظہ ہوں:

"پلپلے جُثے کی ادھیڑ عمر جنداں اُس کے لیے ایک مصیبت ہی تو تھی اور تھی بھی اُس کے چچا کی بیٹی، اِس لیے مراد نے چُپ سادھ لی...... لاکھ اِدھر اُدھر ہوتا، لڑتا جھگڑتا...... پر کالے گوشت کا پلپلہ پہاڑ سینے پر سوار ہو جاتا تو جوانی کا صدقہ اُتارنا ہی پڑتا۔"

"جام مراد خود بھی بہت خوف صورت تھا مگر سمجھتا خود کو یوسفِ ثانی...... خدا نے کرم کیا جو چمڑی ذرا چِٹی ہو گئی وگرنہ دن کو بھی بچے ڈراتا...... جب آئینے میں اپنی چِٹی چمڑی دیکھتا تو سارے سوہنے اُسے اپنے سامنے گھاس کاٹتے دکھائی دیتے...... کالی بلا کے دفع کرنے کا نہ اُسکے پاس کوئی منتر تھا اور نہ ہی کوئی پھُل دھاگہ۔ ایک دفعہ کالے بکرے اور کالے مُرغے کی سری کا ٹونا بھی کر چکا تھا...... اللہ سائیں! اِس رات کی ماں کو اپنے پاس بُلا لے اور میرے لیے چاندنی رات کی شہزادی بھیج دے۔"

آریائی جمالیات کی تشکیل کی اِن کیفیات کے ساتھ معاشرتی سطح پر جو کریہہ صورتِ حال مرتب ہوئی اُس نے مردانہ شاونزم کو اگر ایک طرف جوازات فراہم کیے تو دوسری طرف رضائے نسواں کی نفی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کہانی کے اختتام کی صورتِ حال ملاحظہ ہو:

"وہ چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا...... آنکھوں کے آتش دان اندھیرے میں سُرخ سُرخ تمازت بکھیرنے لگے اور اُس کا جسم برف ہو گیا جس پر کپکپاہٹ جاری تھی...... جیسے تیز آندھی میں دیمک زدہ درخت ہچکولے کھاتا ہے۔ اُس کی برسوں کی خواہش تکمیل تک آن پہنچی تھی۔ منزل کو اتنا قریب پا کر مراد کا دل دھماکے کرنے لگا جس میں اب ترتیب بھی باقی نہ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اُس کے پورے جسم کا خون نچڑ کر اُس کی آنکھوں میں آ گیا۔ دیے کی لو بہت ہی مدھم تھی۔ سکھاں نے نیند میں لات مار کر کھیس اُتار پھینکا۔ مراد کو یوں لگا جیسے شہزادی انگڑائیاں لے رہی ہو...... اور

وہ اُس پر جھکتا چلا گیا۔"

حفیظ خان کی کہانی 'یہ جو عورت ہے' کو اگر اُس کی کہانیوں کی کہانی کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ حفیظ خان نے اپنی کہانی کے طویل سفر میں اب تک یہاں کی عورت کے مختلف پہلوؤں کو اپنے متنوع نسوانی کرداروں کے روپ میں جس قدر پیش کیا ہے وہ تمام پہلو اور مباحث اِس کہانی کو واحد متکلم کے ذریعے بالکل اِس طرح پیش کرتے ہیں جس طرح آسکر وائلڈ نے اپنے فن کو اپنی تحریر پروفاندس (Profondis) میں پیش کیا ہے۔ اِس کی اپنی کہانیوں پر تبصرے کے طور پر اِسی کہانی کے مکالموں کو پیش کیا جائے تو زیادہ قرینِ انصاف ہوگا۔ وادیٔ سندھ میں تاریخی طور پر مرد کے سارے بہروپ، عورت کو صرف اور صرف ایک ہی روپ میں کیونکر دیکھتے ہیں، ملاحظہ ہو:

"میرا نام پنڈت رام داس ہے۔ آپ مجھے فادر جوزف، سنت گرنام سنگھ اور عبدالقدوس بھی کہہ سکتے ہیں۔ نام کے علاوہ میرے کام بھی بہت سے ہیں مگر میں ہر کام عورت سے نفرت کے اظہار کے لیے کرتا ہوں۔ میرا سونا، میرا جاگنا، اُٹھنا، بیٹھنا، بولنا، خامشی، میری نفرت کے اظہار کے لیے بالکل ناکافی ہیں۔"

عورت کے اِس سماج میں اوّلیں کارکن ہونے کے باوجود، معیشت میں اُسے کس طرح عدمِ شرکت کا احساس دلایا جاتا رہا ہے، اس کے وجود کی نفی پر ہی معاملہ تمام نہیں ہوا بلکہ آریائی و مابعد کے سماج میں اُسے جلی و خفی طور پر قربان کیا جاتا رہا ہے۔ مثال درج ذیل ہے:

"میرا کھاتی ہے مگر میرے کمائے ہوئے روپوں سے مجھے ذلیل ورسوا کرنے کا سامان کرتی ہے...... حالانکہ میں نے ستاروں کی حرکات اور مخفی علوم کی قوت سے اِس کی پیدائش کے تناسب کو کم سے کم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ حرافہ مخفی قوتوں کو بھی ٹھگا جاتی ہے۔ میں نے اسے پیدا ہوتے ہی زمین میں دبا دینے کا عمل بھی کیا۔ مگر وہ پھر سے اپنی تعداد برابر کر لیتی ہے۔ میں نے جنگ و جدل میں اُسے نیست و نابود کرنے کی بھرپور سعی کی۔ اپنے معبودوں کی مزید خوشنودی کے لیے اُسے قربان گاہوں کی زینت بھی بنایا، مگر کیا کیا جائے کہ پھر بھی برابری کی دعویدار آ ٹھہرتی ہے۔"

عورت کی بے توقیری اور بے حیثیتی کی دیگر صورتیں بھی 'یہ جو عورت ہے' میں کھل کر بیان کی گئی ہیں:

''میں نے خود عورت ہی کو جائیداد کا رتبہ دے کر ملکیت کے زمرے میں لے لیا۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ اُس کی اپنی کوئی جسمانی خواہش نہیں بلکہ وہ صرف مرد کی جنسی خواہش کی تسکین کا ذریعہ ہے...... میں نے اُسے اُس کی پیدائش پر ماتم کرنا سکھایا ہے، ہونہہ بے وقوف ...... اپنی پیدائش کا ماتم کرتی ہے۔ اور ہاں میرے خلاف کچھ نہیں کر سکتی تو اپنے ہی خلاف سازشیں کرتی ہے۔ اپنا گلا اپنے ہی ہاتھوں سے کاٹتی ہے اور پھر اپنے جیسی ہی کسی عورت کی زندگی جہنم بنا دیتی ہے۔ ویسے کچھ کچھ بے وقوف بھی ہے۔ میں نے اُسے صنفِ نازک کہا تو اُس نے یقین کر لیا۔ حالانکہ اِس نزاکت کی آڑ میں اُس کے عضلات کمال کی مشقت کر جاتے ہیں۔''

نسوانی رشتوں میں توقیر کا فقدان حفیظ خان نے اپنی چشمِ بینا سے کیسے جداگانہ انداز سے دیکھنے کی سعی کی ہے، اِس عبارت کو ملاحظہ کیجیے:

''میں اُسے ماں کہتا ہوں مگر اپنی خدمت کے لیے، اُسے بہن بھی کہہ دیتا ہوں کہ میری انا اور انتقام کی تسکین کے لیے قربانی کا ریوڑ سلامت رہے۔ بیٹی بھی کہی جا سکتی ہے کہ اُس کے ساتھ ہونے والے سلوک سے ہی تو میرے بیٹے میں جہاں گیری کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔''

حفیظ خان کی کہانیاں، اُن کا یہ ترجمہ اور دیگر زبانوں میں ممکنہ تراجم، اِس خطے اور اِس کی عورت کو ہمسایہ اقوام اور دیگر اقوام کے قارئین تک پہنچ کر کس طرح کا تاثر پیدا اور قائم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، اِس کا جواب دینا شاید قبل از وقت ہے۔ مگر جو بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ وادیِ سندھ کی طرح، دنیا کے سبھی خطوں کو انہی کی اپنی نمائندہ ثقافتوں کی زبان میں ہی بیان کرنا ممکن ہے۔ ایک رپورتاژ، سفرنامہ اور کہانی یقیناً صنفی طور پر ہی نہیں، تخلیقی طور پر اسی لیے مختلف ہوتے ہیں کہ کہانی، حفیظ خان کی کہانیوں کی طرح زمین اور اُس کی حیات و نبات کے ساتھ ساتھ نمو پاتی ہے اور اس کی خوشبو سے زمان و مکان کے فاصلے طے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

آج کی سندھ وادی کی کہانی کی عورت اِس امر کی متقاضی ہے کہ یہاں کی تاریخ کی شہادت کی روشنی میں اِس مقدمے کا فیصلہ صادر کیا جائے گا کہ اُسے آریائی اخلاقیات کے وضع کردہ

فرائض ہی ادا کرتے رہنا ہے یا اُسے دراوڑی حقوق کے حصول کی جدوجہد کا آغاز کر دینا چاہئے۔ کیا اکیسویں صدی کے آنے والے ماہ و سال اُسے توقیرِ نسواں کا کوئی مژدۂ جاں فزا سنائیں گے یا اس خطے کی مخصوص مردانگی پر مشتمل اخلاقیات اُسے ماضی کا کوئی پاکیزہ مزار یا قصۂ پارینہ بنا دینے میں کامیاب و کامران ثابت ہو جائے گی۔

حفیظ خان کی کہانی سرائیکی زبان کے جدید عہد کی اوّلیں کہانیوں میں سے ہے۔ اہلِ قرات کے ساتھ ساتھ اہلِ نقد و نظر نے ماضی میں اِن کہانیوں کی عورت کو کیسے شناخت کیا تھا، اس عورت کو سندھ وادی کے تاریخی المیہ کے کردار کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جو اس خطے کے ماضی کے مرثیے کا موضوع بھی ہے اور مستقبل میں یہاں کی عورت کا مقدمہ بھی۔ اہلِ نظر اپنی پیش بینی سے یقیناً ملاحظہ کر رہے ہوں گے کہ یہ مرثیہ اِن کہانیوں میں ایک نئے مقدمے کو جنم دے رہا ہے۔

O

(28/مارچ 2006ء، ملتان)

'یہ جو عورت ہے' کے افسانے

پروفیسر ڈاکٹر سعیدہ رشم

''ادب برائے زندگی'' کے مصداق حفیظ خان کے افسانوں کا مقصد تعمیری ہے۔اپنے قلم کو قوم کی مقدس امانت سمجھتے ہوئے صحت مند معاشرتی اصلاح، سیاسی، سماجی، اخلاقی، معاشی اور تعلیمی مسائل پر رائے زنی کچھ اس طرح کی ہے کہ موضوعات کا تعلق تجربہ اور تاثیر سے بھرپور ہے۔دائرۂ عمل کا انحصار اور وسعت، حدود زماں و مکاں، سکون اور تحرک، ایمائیت اور وضاحت، اعمال اور تفصیل ان کہانیوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ان کا اسلوب سادگی اور پختہ کاری کا حسین امتزاج ہے۔تکلف سے مبرا ان کی تحریریں جوئے شیریں کی روانی میں رواں دواں ہیں۔ان کے موضوعات متنوع اور منتشر ہیں مگر تنوع کے باوجود ان میں انسان دوستی کی رمق قدر مشترک ہے۔معاشرے کا ایک احساس بندہ ہونے کے ناطے ان کی نظروں نے معاشرے میں جو کہانیاں ڈھونڈی ہیں وہ عام لوکائی کو دکھائی نہیں دے سکتیں۔

حفیظ خان نے اپنے تجربوں اور مشاہدوں سے حیاتی کا نظریہ قائم کیا ہے اور ہر افسانے کے انجام کو اچھا بنایا ہے جس سے قاری کے شوق کی تشنگی کو بھڑکایا گیا ہے۔

O

(فلیپ ''یہ جو عورت ہے''، 21/اکتوبر 1997ء)

حفیظ خان کے افسانوں کی معنی آفرینی

علی تنہا

اردو میں افسانوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے لیکن اس کی روح اُتنی ہی تیزی سے سمٹ رہی ہے۔ کیونکہ اردو کے کثیر افسانہ نگار مقصدیت اور معینہ معیاروں سے اوپر دیکھنے کی سکت ہی نہیں رکھتے۔ وہ ہیئت کو ایک ہی تناظر میں دیکھنے کے اس درجہ عادی ہو گئے ہیں کہ اب آگے پیچھے، دائیں بائیں دیکھنے سے ان کی گردنوں میں اینٹھن ہونے لگتی ہے۔ اُردو کے نوجوان افسانہ نویس حفیظ خان نے بڑی حد تک ایک امتناعی موضوع کو ایک بار پھر چھیڑا ہے۔ منٹو کے بعد عورت، مرد کے جنسی زاویوں کو دیکھنے کا عمل یک سطحی بنا رہا۔ مگر حفیظ خان نے جس عورت کا آشوب اس مجموعہ میں پیش کیا ہے، وہ اپنے سیاق وسباق کے حوالے سے گہری معنویت رکھتا ہے۔

حقیقت پسندانہ اسلوب کی تکنیک میں لکھے گئے ان افسانوں کی فضا میں حفیظ خان نے معنی آفرینی کو عمدگی سے پیش کر دیا ہے۔ اس کے کرداروں میں واقعہ کی تشکیل مروجہ اسالیب کے تحت ہی ہوتی ہے تا کہ اس کے عام قاری بھی افسانے کے موضوعی حقائق سے فوری اثر پذیر ہو سکیں۔ گویا اس اعتبار سے اس کے افسانے واقعاتی زندگی کو ہمارے سامنے منکشف کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ دنیا میں غیر واقعاتی صورتحال بھی ممکن ہے؟ یقیناً مابعد القصہ جیسے تمثال اور علامت میں آرٹ نے متشکل کیا

ہے۔ مگر حفیظ خان نے پلاٹ اور تکنیک کو چونکہ واقعے کی پرداخت سے منسلک کیا ہے اس لیے ا
افسانہ عصری شعورِ ذات کا شارح ہے۔ وہ ذات جس نے ایک مسخ اور برباد معاشرے میں عورت
رسوائی کی انتہا تک پہنچا دیا ہے اور جو خود تضاد کے گرداب میں بھول گیا ہے کہ عورت کے ناپید
سمندر میں اس کے وجود کی کیا شکل بن گئی ہے۔ ادبی افق پر یہ افسانے ہمیں نہایت پُرکاری سے وا
کے باطن میں جھانکنے کی دعوت دیتے ہیں تا کہ امرِ واقعہ کے اندر کا منظر ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ
۔حفیظ خان کے افسانے حشو و زوائد اور لفظوں کے انبار کے عذاب سے پاک ہیں۔ اس کے مختصر
بھرپور فقرے افسانے کے اندر موجود کہانی سے ایک ایک پردہ چاک کر کے زندگی کے افادی اور غ
افادی رشتوں کی تفہیم میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ حفیظ خان کے افسانوں
تکنیک کے حوالوں سے بھی کرداری سطح پر تجربے ایک خوشگوار حیرت سے مملو ہیں اور اس اعتبار سے
افسانے زندگی کا سناریو ہیں جس میں اختصار اور موضوعی حسن نے افسانے کے ایک وقیع منظر نامہ
پیش کر دیا ہے۔

O

(19 دسمبر 1994ء

حفیظ خان کی کہانیاں

طارق شاہد

حفیظ خان سے ملاقات کوایک زمانہ گزر گیا۔ان کاتعلق جوڈیشری سے ہے۔وہ کچھ عرصہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں اسلام آباد میں رہے۔ان دنوں ان سے ملاقاتیں رہیں۔وہ اپنی مصروفیات کے باوجودادب کوبھرپوروقت دیتے ہیں۔وہ تقریبات میں کم نظرآتے ہیں لیکن دوستوں کے دوست ہیں۔

حفیظ خان شاعر،افسانہ نگار،ڈرامہ نگاراورمحقق ہیں۔ان تمام اصناف میں ان کی کتابیں شائع ہوچکی ہیں لیکن بنیادی طور پروہ افسانے کوشاید زیادہ توجہ دیتے ہیں۔سرائیکی ادب میں ان کا نام ایک روشن ستارے کی طرح ہے۔ان کی تخلیقات کے نہ صرف اردو بلکہ انگریزی میں بھی بہت سے تراجم ہوچکے ہیں۔

ان کی کتابیں ''کچ دیاں ماڑیاں''(سرائیکی میں ڈراموں کی پہلی کتاب ایوارڈ یافتہ) 1989ء''وینیدی رُت دی شام''(سرائیکی افسانے ایوارڈیافتہ)1990ء''ماما جمال خان(سرائیکی میں بچوں کے ڈراموں کی پہلی کتاب)1990ء''اتفاق سے نفاق تک''(پاکستان کی آئینی تاریخ کا ایک فسوں خیز باب)1993ء''یہ جوعورت ہے''(اردو افسانے)1997ء''پہلی شب تیرے

جانے کے بعد'' (اردو نظمیں) 1999ء ''خواب گلاب'' (بچوں کے سرائیکی ڈرامے) 2003ء ''اندر لیکھ دا سیک'' (سرائیکی افسانے) 2004ء ''رِھڑے پندھ'' (سرائیکی ڈرامے) 2005ء ''رفعت عباس کی سرائیکی شاعری'' (تحقیق وتنقید) 2006ء ''خرم بہاولپوری: شخصیت، فن اور منتخب سرائیکی کلام'' (تحقیق وتنقید) 2007ء میں شائع ہوچکی ہیں، جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ادب کے ساتھ کتنے کمیٹڈ ہیں۔ حال ہی میں ان کی کتاب ''حفیظ خان کی کہانیاں'' وادیٔ سندھ کی عورت کا نیا مقدمہ (منتخب سرائیکی کہانیوں کا اردو روپ) شائع ہوئی ہے۔

اس کتاب میں وہ کہانیاں ہیں جو پہلے سرائیکی میں شائع ہوچکی ہیں۔ ان کہانیوں کا اردو روپ اُس عام قاری کے لیے یقیناً بہت اہم ہوگا، جو سرائیکی نہیں جانتا۔ کیونکہ ان کی یہ کہانیاں اپنی زمین سے جڑی ہوئی ہیں اور انھوں نے اس میں بنیادی طور پر اپنی وسیبی عورت کا دکھ درد بیان کیا ہے۔ ان کہانیوں کی ایک چاشنی اس طرح بھی بنتی ہے کہ حفیظ خان جوڈیشری سے جڑے ہوئے ہوئے ہیں اور یہ اندازہ کرنا بہت مشکل ہے کہ ان کہانیوں میں کتنی کہانیاں حقیقت پر مبنی ہیں کیونکہ ان کا تعلق براہ راست عوام سے رہا ہے۔ اس لیے مسائل کی نشاندہی اس میں جا بجا نظر آتی ہے۔ وہ اپنی دھرتی سے جڑے ہوئے ادیب ہیں۔ ان کی کہانیاں نہ صرف مسائل بیان کرتی ہیں بلکہ ان مسائل پر سوچنے پر بھی مجبور کرتی ہیں۔

ان کے ڈرامے بھی بنیادی طور پر ان کے اپنے وسیب کی تصویر کشی کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ دیگر سرائیکی افسانہ نگاروں میں الگ سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔

O

(روزنامہ ''اذکار'' اسلام آباد، 14 دسمبر 2007ء)

حفیظ خان: ایک خلّاق افسانہ نگار

الیاسؔ میراں پوری

وادیٔ سندھ کی ہزاروں برس قدیم زبان سرائیکی اپنے باطن میں اسرار و رموز کی بے شمار پرتیں اور لاتعداد جہتیں رکھتی ہے۔ آپ ان پرتوں اور جہتوں کو کھولتے جایئے اس میں آپ ہر لمحہ اور ہر لحظہ ایک نئے ذائقے سے آشنا اور نئے جہانِ معنیٰ سے بہرہ ور ہوتے جائیں گے۔ اس زبان میں مٹھاس اور شیرینی اتنی دلآویز اور روح افزا ہے کہ اس زبان میں لکھا گیا ادب عالمی ادب کی صف میں بلا چون و چرا شمار کیا جا سکتا ہے۔ شاعری، تنقید، تحقیق، افسانہ، ڈراما، ناول...... غرض کونسی صنفِ سخن ایسی ہے جس میں طبع آزمائی نہ کی گئی ہو۔

عورت کا سب سے بڑا المیہ اُس کے ساتھ ہونے والا غیر انسانی سلوک ہے۔ کبھی تو اسے ''ونی''، جیسی قبیح رسم کے بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے تو کبھی ''کالی'' قرار دے کر اس پر عرصۂ حیات تنگ کر کے دنیا میں عبرت کا نشان بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عورت کی مظلومیت کا سلسلہ یہیں پر نہیں رکتا بلکہ اس کا دائرہ کار اس وقت وسیع ہو جاتا ہے جب اسے گھٹیا مخلوق اور پاؤں کی جوتی سمجھ کر اس کے حقوق اور خواہشات کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے کے بھیانک اور مکروہ کردار اپنی ہر خامی اور اپنا ہر گناہ عورت کے سر تھوپنا اپنے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں سمجھتے۔ اور ایک اس وادی

کی عورت ہے جو تمام تر معاشرتی دباؤ میں آکر اپنے خاوند اور محبوب کی قربانی دے دیتی ہے۔ خصوصاً وادیِ سندھ کی عورت اس سفاکیت کا خاص شکار ہے۔ عورت کی اس مظلومیت کو آپ کیا نام دیں گے؟ کیا یہ انسانیت کی تذلیل نہیں اور کیا یہ مہذب معاشرے کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ نہیں، جس کی گونج ایوانِ عدل تک تو پہنچتی ہے لیکن شنوائی نہیں ہوتی اور فیصلہ اکثر اُس کے خلاف ہی ہوتا ہے۔ عورت کی اس مظلومیت کی تصویر کبھی بھی دکھائی نہ دیتی اور عورت کی مظلومیت کی ایسی خونچکاں داستانیں کبھی منظرِ عام پر نہ آتیں اگر دلِ دردمند کے مالک تخلیق کار اس رویے کی بھیانک منظرکشی نہ کرتے، ان کے رِستے زخموں پر پھاہا نہ رکھتے اور معاشرے کے گلے سڑے کرداروں کی نقاب کشائی نہ کرتے۔

حفیظ خان آج کے عہد کا ہی نہیں بلکہ آنے والے دور کا بھی ایسا تخلیق کار ہے جس نے اپنی تخلیقات کے ذریعے سسکتی انسانیت کو امید اور بیم ورجا کی روشنی دکھائی ہے۔ ایسی روشنی جو سماج دشمن اور فکری غلاظت میں لتھڑے ہوئے بے نیل و بے مرام کرداروں کی قہر آلود آنکھوں کو چندھیا کر آگے بڑھتی ہے تو ایک نئے عزم اور نئے ولولے کے ساتھ۔ الجھی گتھیوں کو سلجھاتی اور فکر و نظر کے نئے زاویے بناتی ہوئی۔ حفیظ خان کی نگارشات نے نہ صرف معاشرے کو اس کا حقیقی چہرہ دکھایا ہے بلکہ معاشرتی و سماجی ناانصافیوں کو ایوانِ عدل میں بھی لا کھڑا کیا ہے۔ تنقید کی پرپیچ پگڈنڈیاں ہوں یا تحقیق کی عمیق گھاٹیاں، افسانے کا حیران کن ابتدائیہ ہو یا ڈرامے کا دلوں کو جھنجھوڑتا اختتام...... انھوں نے ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔

حفیظ خان ادیبوں کے اُس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جن کا قلم صنفِ نازک کے خلاف کیے جانے والے اقدامات اور حقوق کی پامالی پر جب حرکت میں آتا ہے تو بڑے بڑے سیاسی بزرجمہروں کی قبائیں اور مذہبی بہروپیوں کی عبائیں تار تار کر دیتا ہے۔ حفیظ خان کے افسانے ہمارے معاشرے کے گلے سڑے کرداروں کی متعفن لاشوں کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں کہ دیکھو! یہ ہے جدید معاشرے کی عورت کی بھیانک تصویر! ایک طرف تو آزادیٔ نسواں کا راگ الاپنے والے اس حد تک آگے جا چکے ہیں کہ نسوانیت کو عریانیت سے تعبیر کر کے اسے غیر مستور کر دیا ہے اور دوسری طرف

پسماندہ علاقوں میں لوہے کے چنوں سے پلی ہوئی اور ظلم کی چکی میں پسنے والی عورت جس کا نوحہ لکھتے ہوئے دل کے نہاں خانوں سے درد کی کئی ٹیسیں اٹھتی ہیں اور قلم روشنائی کی جگہ خونِ جگر کا طالب ہوتا ہے۔

حفیظ خان سرائیکی کہانی کے متقدمین میں شمار ہوتے ہیں۔وہ بیک وقت افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، کالم نگار، صحافی، نقاد، شاعر، مترجم، مؤرخ، محقق اور منصف ہیں۔انھوں نے ہر میدان میں اپنے فن اور اپنی صلاحیتوں کا سکہ منوایا ہے۔جس کا ثبوت ان کی تخلیقات میں جھلکتا ہے۔ان کی تحریروں میں کوئی تصنع یا عامیانہ پن نہیں بلکہ اس میں حالات کی سنگینی اپنے خونیں جبڑے کھولے ہمارے معاشرے کی بچی کھچی قدروں کو نگلنے کے لیے بے چین و بے کل دکھائی دیتی ہے۔

حفیظ خان کا نمایاں میدان افسانہ نگاری ہے۔ان کے مندرجہ ذیل سرائیکی اور اردو افسانوی مجموعے نقادانِ ادب سے پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔

(1) ویندی رُت دی شام (1990ء)

(2) یہ جو عورت ہے (1997ء)

(3) اندر لیکھ داسیک (2004ء)

(4) حفیظ خان کی کہانیاں (2007ء)

مصلحت کی چادر اوڑھے نام نہاد نقاد، حفیظ خان کے افسانوں کو کوئی بھی مقام و مرتبہ دیں، انھیں 'تنقید'' کے کسی بھی ترازو میں تولیں اور کسی بھی سانچے میں ڈھالیں، لیکن ان کے افسانے اپنے تمام تر فنی لوازمات اور فکری معیارات پر نہ صرف پورے اترتے ہیں بلکہ ان میں ایک مقصدیت بھی پنہاں ہوتی ہے جو ہمیں یہ اشارہ کرتی ہے کہ دیکھو یہ بہت دور تک نظر آنے والے بھیانک خواب ہیں جن کی تعبیر اندوہ ناک اور کرب ناک ہے۔

''غیرت'' میں وادیٔ سندھ کی عورت پر ظلم طینت مردذات کی من گھڑت اجارہ داری ملاحظہ کریں:

''اچھا تو یہ سردار زادی اب جوتا پہنے گی...... بھاگنے کا ارادہ ہے کسی کے ساتھ......

پوچھ ماں اس سے کہ ہماری سات پیڑھی میں کیا کسی عورت نے جوتا پہنا ہے۔ اس بدذات نے تو میری ناک کٹادی ہے...... کسی نے سن لیا...... دیکھ لیا...... تو میں کیا منہ لے کر باہر جاؤں گا کہ میری بہن کو بھی نئے زمانے کی ہوا لگ گئی...... جبھی تو بھاگ جانے کو تیار بیٹھی ہے۔"

حفیظ خان نے مذکورہ افسانے کے آخری حصے میں حالات کی سنگینی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ خبیث اور دُوں نہاد مرد کس طرح عورت کو مطعون وملعون کرتے ہیں:

"...... تجھے گوشت کھانا تھاناں...... کمینی اور بے غیرت ہونا تھاناں...... تو لے پھر کھا گوشت...... اپنا گوشت کھا"...... یہ کہہ کر ربو نے بوٹی رکھی کے منہ میں ٹھونس دی۔"

حفیظ خان کے افسانوں میں طنز کی گہری کاٹ ہے، لیکن اس طنز میں عزت نفس مجروح نہیں ہوتی بلکہ اس میں تفکرات اور تصوارت کے کئی در وا ہوتے نظر آتے ہیں۔ وہ سیاسی رہنماؤں کی منافقت اور مذہبی وڈیروں کی ریاکاری دیکھتے ہوئے اپنے گہر بار قلم سے شرر افشانی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

حفیظ خان کے بارے میں یہ تاثر کہ وہ حقوقِ نسواں کے خلاف ہیں، لایعنی الزام اور الفاظ کی ٹِلے نویسی ہے۔ لیکن وہ عورت کی مادر پدر آزادی کے کبھی بھی موید نہیں رہے۔ وہ عورت کو اُس کا صحیح حق دلوانے کے طالب اور اسی کے لیے کوشاں ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ عورت کی خامیوں اور کمزوریوں کو نظر انداز کرتے ہیں بلکہ وہ تصویر کے دونوں رخ قاری کے سامنے کر کے فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں۔ "باری باری سرکار" اس کی بہترین مثال ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے تصویر کا دوسرا رخ اس مہارت سے دکھایا ہے کہ نسوانیت اور شیطانیت ہم خیال اور ہم فکر نظر آتی ہیں۔ افسانے کا مرکزی کردار مس تبسم کس طرح ایک وقت میں کئی مردوں کو بہلانے کا ہنر جانتی ہے، لیکن الگ الگ...... "تبسم" کی گفتگو ملاحظہ کریں۔ کوئی شخص یقین کر سکتا ہے کہ بظاہر اتنی غیرت مند لڑکی کتنی گھٹیا، سوقیانہ پن اور عریاں پیکر کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے:

"تم بھی مرد ہوناں، ان کتوں کی طرح۔ میرے جسم کو اتنا سستا سمجھ کر، جان بوجھ کر

ان کے آگے ڈال کر چلے گئے کہ یہ عیش اڑا لیں۔ مگر مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ ان جیسے گیدڑ چیڑ پھاڑ کر پھینک دوں۔ نکالو انہیں یہاں سے، مگر تم کیا نکالو گے، تم تو بزدل ہو، کم ہمت ہو، مکار اور سازشی ہو......''

ہمارے معاشرتی اور سماجی دباؤ کا سب سے بڑا شکار وادئ سندھ کی عورت ہے۔ جو اپنی بقاء واستحکام کے لیے خواہشات کی قربانی، محبوب اور خاوند دونوں کو قربان کر کے بھی دے سکتی ہے۔ لیکن اس کی یہ قربانی کسی قطار شمار میں نہیں ہو پاتی۔ دباؤ کی اِس نفسیات سے نکلنے کے لیے اُسے ایک عمر چاہیے اور پوری عمر یونہی بیت جاتی ہے۔ عورت کی خواہشاتِ نفسانی کس طرح منتظر رہتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''تن سہل ہوا تو من میں بھی وہ ساری اجنبی لہریں پھر سے جاگ پڑیں جو لڑکپن میں ساری ساری رات جگاتی تھیں۔ کنیزاں کا دل چاہتا کہ غلام حسین دوکان پر نہ جائے اور بس اُسی کے ساتھ بستر پے پڑا، اُس کے بدن کو اِس طرح جھنجھوڑے، کُچلے، مسلے اور کھنگالے کہ مسام اور ماس تو کیا، ہڈیوں کے گودے تک سے آلس، کاہلی اور سستی نچوڑ ڈالے۔ اُس نے پہلے پہل تو آنکھ ناک کے اشارے سے متوجہ کرنے کی کوشش کی، پھر باتوں باتوں میں ہلکے پھُلکے نوٹس اظہارِ وجوہ شروع ہوئے......اب بھی نہ سمجھا تو ہار سنگھار، چھیڑ چھاڑ، دانت سے کاٹا، بگوٹا لے لیا، مگر جب غلام حسین نے کسی بھی عمل کا ردِعمل ظاہر نہ کیا تو ایک دن بول ہی پڑی......' آپ کو میرا کچھ خیال ہی نہیں!''

''اک اور بھنور گرداب میں'' کے مطالعے سے جو تاثر فوری طور پر قائم ہوتا ہے وہ یہ کہ ابھی تک عورت کی خواہشات اور حقوق کا تعین نہیں ہو سکا کہ عورت چاہتی کیا ہے؟ کاروبارِ زندگی میں الجھ کر لوگ کس طرح اپنے خانگی معاملات سے لاتعلق ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی ایک جھلک ملاحظہ کریں:

''مگر یہ کیا، یہ تو غلام حسین تھا، بیس بائیس سال پہلے کا غلام حسین، ویسا ہی تیکھا تیکھا اور سلونا، جس کی گرفت ہڈیاں کڑکا دیتی تھی، وہی پکڑ جو ساری اکڑ نچوڑ لیتی تھی۔ ششدر آنکھوں کے ساتھ کنیزاں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ لڑکا کچھ کہہ رہا تھا مگر اسے

کوئی بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اُس نے سر جھٹک کر سننے کی کوشش کی مگر اُلٹا آنکھوں کے سامنے شیشے سے آ گئے، لڑکے کا چہرہ بھی دھندلا گیا۔ کنیزاں نے آنکھیں مَل کر پھر سے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ غلام حسین ہی تھا، شادی سے پہلے والا غلام حسین۔"

شمیم عارف قریشی، حفیظ خان کی کہانیوں کے بارے میں کہتے ہیں:

"حفیظ خان کی کہانیوں میں، وادیٔ سندھ کی سرائیکی شاعری کی قدیم روایت کی طرح سماج کے کمزور ترین افراد اور کمزور ترین افراد میں بالخصوص عورت کے الم اور اُس کے اسباب و علل کی نشاندہی کرنے والے جملہ عناصر کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اُس کی کہانیوں میں (بشمول حالیہ و سابقہ مجموعے) اِس وادی کے موجودہ سماج کی عورت کی کیفیتِ وفا اور توازنِ رشتہ و تعلق کو بارِ اوّل استفہام کے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ اور بظاہر ناتواں و نادان نظر آنے والی یہ عورت آج کے معاشرے میں مرکزِ قوت کی شناخت اور زیرِ سطح اُس کے حصول کی جس جدوجہد میں کارفرما ہے، اُسے بھی اِن کہانیوں کے نسوانی کرداروں سے آشکار کیا گیا ہے۔" (دیباچہ "حفیظ خان کی کہانیاں")

حفیظ خان کے بعض افسانے شخصی خاکے کی طرز پر لکھے گئے ہیں جن میں طنز کے ساتھ مزاح کی چاشنی بھی ہے اور منفرد سراپا نگاری کی دلکشی بھی۔ "ناز و بگھیلا" کے مطالعے سے یہ خوشی ہوتی ہے کہ حفیظ خان اگر خاکہ نگاری کی طرف آئیں تو اس میں بھی اپنی الگ انفرادیت قائم کر سکتے ہیں۔ "ناز و بگھیلا" اس کی بہترین مثال ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے جس طرح ناز و بگھیلا کی کردار نگاری کی ہے ایسے کردار ہمارے معاشرے میں دیکھے جا سکتے ہیں:

"چار فٹ قد، اوپر کا دھڑ بڑا اور ٹانگیں چھوٹی، گردن پتلی اور لمبی، نرخرے کا ابھار اس قدر نمایاں جیسے پرانی سوڈے کی بوتل میں پھنسی ہوئی بلور کی گولی، گال پچکے ہوئے، ناک تر و تازہ ٹنڈے جیسی، جس کے نیچے مکھی مونچھ......"

ایک اور افسانے "جاتی رُت کی شام" (جو "سرائیکی افسانے "ویندی رُت دی شام" کا اردو ترجمہ ہے

)میں سراپا نگاری ملاحظہ کریں:

''چہرے کی حد تک ایا پیپ دیکھنے میں اچھی بھلی شکل کا رہا ہوگا، جس میں خوبصورتی کا تناسب کم اور بھول پن کا تھوڑا زیادہ تھا۔ چہرے مہرے سے قطع نظر اُس کا نچلا دھڑ، اُس کے سر کے لحاظ سے بہت ہی چھوٹا تھا۔ قد ہوگا یہی کوئی سوا تین ساڑے تین فٹ۔ اس پر بھی خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک مرتبہ کچھ اس شدت سے بخار چڑھا جو اترتے اترتے اُس کی ٹانگوں سے زندگی بھی نچوڑتا چلا گیا۔''

حفیظ خان کے افسانوں میں ایسی بے ساختگی اور شگفتگی ہے کہ بات دل میں اتر جاتی ہے۔ انھیں الفاظ برتنے کا ڈھنگ خوب آتا ہے اور وہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کرنے کے فن میں بھی اتارو ہیں۔ یعنی الفاظ کی فضول خرچی نہیں کرتے۔ اُن کی نثر میں نہ تو عربی اور فارسی کے دقیق الفاظ بوجھل پن پیدا کرتے ہیں اور نہ جملوں کا ڈھیلا پن روانی کے راستے میں روڑے اٹکاتا ہے۔ محاوروں اور لفظوں کا اس قدر صحیح استعمال ہوتا ہے کہ ہر لفظ زندہ اور جیتا جاگتا نظر آتا ہے جو نہ صرف آپ سے بات کرتا ہے، بلکہ آپ کو تھپکتا اور جھنجھوڑتا بھی ہے۔ ان الفاظ کے ذریعے خیال واحساس کی پوری تصویر پڑھنے والے کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔

حفیظ خان کے ہاں محاورے، خود بخود نثر میں شان و شوکت، رچاوٹ، توازن، تخلیقیت، تازگیٔ الفاظ، گھن گرج اور کثیر الجہات معانی موضوع کی مناسبت سے اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی جگہ ایسے ٹھاٹ باٹ اور ٹھسے سے جماؤ کے ساتھ آتے ہیں کہ انھیں کسی دوسرے محاورہ یا لفظ سے نہیں بدلا جا سکتا۔ وہ ایسے کھل اٹھتے ہیں کہ حسن و دلکشی کے ساتھ معنی و مفہوم کی صاف اور اجلی تصویر ہمارے ذہن پر نقش ہو جاتی ہے اور یہ نقش کبھی بھی مدھم نہیں ہوتا۔ اُن کے افسانوں میں لہجے کا ایسا سبھاؤ، ایسی مٹھاس اور گھلاوٹ ہے کہ بات چیت کا یہ انداز ہمارے وجود پر جادو کا سا اثر کرتا ہے اور ہم نثر کو پڑھ کر اس مسرت سے ہم کنار ہوتے ہیں جو ادب کی بنیادی صفت ہے۔ حفیظ خان کے ہاں تخلیقی جملے کثرت سے ملتے ہیں:

☆ نیند اور بیداری کی ملی جلی کیفیت (''مس کے ساتھ'')

☆ ٹاہلی کے تنے کو نرمی کی دیمک نے چاٹ کر کھوکھلا کر دیا (''لاہور جان'')

☆ جذبوں کی گہرائی ماپنی ہوتو رفاقت سے زیادہ رقابت کی تہیں کھنگالنی پڑتی ہیں۔ (''مکتی نہیں نبھتی نہیں'')

☆ بچوں کے چہروں کی ملکوتی معصومیت (''کس کے ساتھ'')

☆ منہ سے دوزخ کی آگ کے شعلے نکال رہے ہو (''جنت حور قصور'')

☆ دوریوں کو رفاقتوں میں اور اجنبیت کو تعلق میں بدل دیا (''کس کے ساتھ'')

☆ حبیب اتنا قریب نہیں ہوتا جتنا رقیب ہوتا ہے۔ (''مکتی نہیں نبھتی نہیں'')

☆ میرے بدن کی پانچوں حسیں سماعت بن گئیں (''کس کے ساتھ'')

☆ وہ بدصورتی سے ٹال گئی (''حاصل جمع'')

☆ طوطا چشم جذبات، جنھیں میں نے بڑی مشکل سے ضبط واحتیاط کے پنجرے میں قید کر رکھا تھا۔ (''آٹے کی عورت'')

حفیظ خان کی کہانیوں نے صرف وادیٔ سندھ کی عورت ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کی عورت کے سماجی ونفسیاتی بحران کو جو نطق عطا کیا ہے، اس کی بازگشت جدید عہد کی سرائیکی کہانی کو ایک نیا رخ دے چکی ہے۔ صدیوں سے صنفی مغائرت کا شکار سرائیکی عورت فی الاصل نہ کمتر ہے اور نہ ہی کمزور۔ آنے والے ادوار میں جدید کہانی کار چہار جانب عالم میں حفیظ خان کی اس جری کاوش کے تاثر میں یہاں کے نسائی صنف پر پڑے اسرار کے دبیز پردے کو ہٹانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو یقیناً اس خطے کے افسانوی ادب میں ایک منفرد اضافہ ہوگا۔

O

(روزنامہ ''جنگ'' ملتان، 10 مارچ 2008ء)

حفیظ خان ایک حقیقت نگار

اقبال بانو

حفیظ خان پہلے ایک ڈراما نویس کے طور پر سامنے آئے اور اب اُن کا روپ افسانہ نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے ہے۔ حفیظ خان نے ڈرامے کے بعد افسانہ کی صنف میں بھی اپنی انفرادیت تسلیم کرالی ہے اور یہ اُن کے قلم کی کامیابی ہے۔ حفیظ خان کی تحریر عام فہم ہے جسے ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ اُن کے کردار بھی عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ حفیظ خان نے روایتی افسانہ نہیں لکھا بلکہ اُس نے افسانے کو محض حسن کاری اور رومانیت کی دلدل میں مزید دھنسنے سے بچا کر اُس کے قدم حقیقت نگاری کی سنگلاخ زمین میں پیوست کر دیے ہیں۔ حفیظ خان کے افسانوں میں انسان کے داخلی رویوں میں چھپا ہوا خیر وشر، سچائی بن کر ظاہر ہوتا ہے اور اُن کی تحریر حقیقی تجربوں کی گواہی دیتی ہے۔ حفیظ خان کا اسلوب بے حد پُراثر ہے اور کہانی کے بیان کے لیے انتہائی موزوں ہے۔ حفیظ خان کو ہم بجا طور پر حقیقت نگاری کی روایت سے وابستہ افسانہ نگار کہہ سکتے ہیں۔ اُن کے سرائیکی افسانوں کا مجموعہ ''وینڈی رُت دی شام'' سرائیکی میں گراں قدر اضافہ ہی نہیں بلکہ آج کے سرائیکی افسانے کو نئی رفعتوں سے ہم کنار بھی کرتا ہے۔

O

(22اپریل 1990ء)

یہ جوعورت ہے

شیدا چشتی

حفیظ خان کا نام سرائیکی ادب پڑھنے والوں کے لیے کبھی بھی اجنبی نہیں رہا۔ وہ بطور ریڈیو پروڈیوسر ہمیشہ اپنی محنت اور لگن کی بدولت مقبول رہے لیکن سرائیکی ڈرامہ نگاری اور افسانہ نگاری نے ان سے محبت کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ وہ وکیل رہے، سول جج بنے، شعبہ قانون کے استاد رہے، ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر رہے، سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا لیکن پھر دوبارہ عدلیہ میں بطور سول جج شمولیت اختیار کر لی اور ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے اب ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدے پر فائز ہیں لیکن اس دوران وہ کبھی بھی اپنے قاری سے کٹ کر نہیں رہے لکھاری اور قاری کے درمیان ہمیشہ رابطہ قائم رہا۔ اس نے اپنے سرائیکی ڈراموں کو اشاعت کے مرحلے سے گزار کر ''کچ دیاں ماڑیاں'' کا نام دیا۔ اس کتاب کو خوب پذیرائی ملی اور اکادمی ادبیات پاکستان نے اس کتاب پر حفیظ خان کو ایوارڈ دیا۔ اسی طرح بچوں کے لیے بھی سرائیکی ریڈیائی ڈرامے تحریر کیے۔ اور انہیں ''ماما جمال خان'' کے نام سے شائع کیا۔ ''ویندی رت دی شام'' ان کے سرائیکی افسانوں کے مجموعے کا نام ہے جس نے انہیں بے حد مقبولیت دی۔ اس کتاب پر بھی اکادمی ادبیات پاکستان نے انہیں ایوارڈ دیا۔ ''یہ جوعورت ہے'' انکی اردو افسانوں پر مبنی کتاب کا نام ہے جس میں انھوں نے چودہ

افسانے شامل کیے ہیں ''ویندی رت دی شام'' میں شامل پانچ سرائیکی افسانوں کا اردو ترجمہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ اسی کتاب کا فلیپ منو بھائی نے لکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ ''غالباً یہ میری فرمائش تھی کہ اپنے افسانوں کو سرائیکی سے باہر کی دنیا کی ہوا بھی لگواؤ۔ خواب بیشک اپنی مادری زبان میں دیکھو مگر ان خوابوں کو زیادہ سے زیادہ آنکھوں تک لے جانے کا اہتمام بھی کرو''۔ ان کا اردو نثری نظموں پر مشتمل پہلا مجموعہ ''پہلی شب تیرے جانے کے بعد'' کے نام سے اسلام آباد سے شائع ہو کر قاری تک پہنچ چکا ہے، اس وقت ان کی اردو افسانوں کی کتاب ''یہ جو عورت ہے'' میرے سامنے ہے۔ کتاب کا فلیپ لکھتے ہوئے منو بھائی اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں ''یہ جو حفیظ خان ہے اس نے ''یہ جو عورت ہے'' میں افسانے شامل کیے ہیں وہ تذکیر کے دماغ اور تانیث کی آنکھ سے محفوظ ہیں چنانچہ ''یہ جو افسانے ہیں'' یہ مردانے اور زنانے نہیں ہیں ''انسانے'' ہیں اور بہت اعلیٰ ہیں۔ فکر افروز ہیں، خیال انگیز ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ عورت کی گھنجل دار بجھارت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔''

جاوید اختر بھٹی نے حفیظ خان کی افسانہ نگاری پر خوبصورت انداز میں گفتگو کی ہے جسے کتاب کی ابتدائی صفحات کی زینت بنایا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے افسانے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ایک بار پھر افسانے میں کہانی زندہ ہوگئی ہے۔ عام طور پر حفیظ خان کے افسانوں کے عنوان کہانی کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں لیکن بعض اوقات کسی افسانے کے کردار سے افسانہ نگار اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ وہ اسے اپنے افسانے کا عنوان بنالیتا ہے۔ کتاب کے پہلے افسانے ''کس کے ساتھ'' میں حفیظ خان نے اپنے افسانوی کردار ''ریحانہ'' کو ایک پیار کرنیوالی بیوی کے طور پر پیش کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ وہ کس قدر جلد کسی کمزور لمحے میں چیزوں اور جذبوں سے متاثر ہوتی ہے اسی کمزوری کو اس نے افسانے کی بنیاد بنایا ہے۔ ریحانہ انجینئر کی بیوی ہے لیکن جب وہ بسلسلہ ملازمت کراچی جاتا ہے تو اسی اثناء میں اس کی بیوی ریحانہ چوکیدار سے تعلقات استوار کر لیتی ہے جب اس تعلق کو وہ خود دیکھتا ہے تو اس کیفیت کو لفظوں میں کچھ یوں ڈھالتا ہے ''میری دونوں آنکھیں مرچوں سے بھر گئیں...... سر پر کسی نے جلتے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی رکھ دی۔ رگوں میں دہکتا ہوا پارہ ناچنے لگا اور میرا دم گھٹنے

لگا''۔موقع کی مناسبت سے وہ کئی خوبصورت جملے تخلیق کرتا ہے اور آگے بڑھتا رہتا ہے۔''حاصل
''،''مائی بڑھیا کا گھوڑا''، تن من سیس سریہ''،'' قابل''اور''جنت، حور،قصور''اس کے سرائیکی افسانے
ہیں جنھیں اردو میں ترجمہ کر کے کتاب زیرِ تبصرہ میں شامل کیا گیا ہے۔افسانہ''یہ جو عورت ہے''کتاب
میں ترتیب کے اعتبار سے ساتویں نمبر پہ ہے اس میں حفیظ خان نے عورت اور مرد کے مختلف رویوں
بڑی خوبصورتی سے طنز کے نشتر چبھوئے ہیں۔چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ گئے
ہیں۔عورت کا استحصال کس طرح سے ہو رہا ہے یا وہ خود اپنا استحصال کس طرح سے کر رہی ہے اس
بات کو بڑے خوبصورت جملوں میں واضح کیا ہے وہ اس افسانے کا اختتام ان جملوں میں کرتے ہیں
کہ''میری روح اب بھی اذیت میں ہے......میرے جسم کے کروڑوں ذرے ہوں اور ہر ذرے کو
گویائی ملے تو وہ چیخ چیخ کر میرے صدیوں کے دکھ کے نوحے اور اس سے میری نفرت کی داستانیں
سنائے گا۔جی ہاں صدیوں کا دکھ......جب اس نے میری انا کے ریزے ریزے کیے......اور مجھے حسد
کی آگ میں جھونکا تھا......صدیوں پہلے اس وقت جب میرا نام قابیل تھا اور اس نے ہابیل کو مجھ پر
ترجیح دی تھی۔افسانہ''دھوپ دیوار''میں سکول / کالج جانے والی لڑکیوں کو گھر سے سکول اور سکول سے
واپسی تک کس طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کس طرح لوگ ملازمت پیشہ خواتین پر اور ان
کے کردار پر شک کرتے ہیں۔انہی مسائل پر افسانہ بُنا گیا ہے۔اس افسانے میں استعمال کی جانے
والی زبان بڑی دلکش ہے اور قاری افسانہ نگار کے مشاہدہ کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔حفیظ خان اپنے
افسانوں میں عورت کے کردار کو بھرپور انداز میں پینٹ کرتے ہیں۔عدلیہ سے وابستگی کی وجہ سے انہیں
کہانی بھی میسر آتی رہتی ہے چونکہ روزانہ ان کی عدالت میں کوئی ایک کہانی سامنے ہوتی ہے کتاب
میں شامل اُن کا افسانہ''لاہور جان''اس کی بہترین مثال ہو سکتی ہے۔گو میرے نزدیک اس افسانے کا
بہترین نام''نجات''ہو سکتا تھا لیکن لگتا ہے افسانہ نگار کو نام کا انوکھا پن بھا گیا اور''لاہور جان''کو ہی
افسانے کا عنوان بنا دیا گیا۔اسی طرح افسانہ''غیرت''بھی ان کی عمدہ تخلیق ہے اس افسانے میں
لڑکے اور لڑکی کی پرورش میں رکھے جانے والے فرق اور وٹے سٹے کی شادی کو افسانہ نگار نے اپنے
افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ماں بیٹی کے درمیان مکالمے افسانے کی جان ہیں۔رکھی (بیٹی) ماں سے

بوٹی مانگتی ہے تو ماں کہتی ہے'' دیکھ وہ کام میں کیسے کروں جو ہماری سات پیڑھیوں میں کسی عورت نے نہیں کیا ہاں تیری ایک پھوپھی نے منہ میں بوٹی ڈال کر...... پھر سے ہانڈی میں ڈال دی تھی کلیاں بھی کیں ۔مسواک بھی کیا مگر تیرے باپ کو نہ جانے کہاں سے بو آ گئی اور پھر بے چاری اگلے دن کا سورج نہ دیکھ سکی...... '' آخر وہ کیوں نہیں کھانے دیتے بوٹی'' وہ کیا ساری مرد ذات ہی ایسا کرتی ہے۔ '' مگر کیوں؟......'' وہ کہتے ہیں کہ عورت گوشت ہے، گوشت کھائے گی تو اس کے دماغ کو حرام چڑھے گا......اسے اپنا مرد اچھا نہیں لگے گا۔ بھاگ جائے گی کسی اور کے ساتھ...... کمینی ہو جائے گی۔'' اس افسانے میں سرائیکی لہجہ بھی خوب بولتا ہے۔ افسانہ'' بزدل'' ایک سادہ مگر بھرپور رومانوی کہانی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح دلوں میں محبتوں کے پھول کھلتے ہیں اور کس طرح پیار کی خوشبو چاہے جانے والے کے دل میں اترتی ہے کس طرح عورت اپنی عصمت کے بدلے زندگی ہار دیتی ہے۔اس افسانے میں شمسہ کا کردار بھی کچھ اس طرح کا ہے وہ بچپن کے اس حصے میں بردہ فروش کے ہتھے چڑھتی ہے۔جب وہ ٹھیک طرح سے بول بھی نہیں سکتی۔ بھول پن کے زمانے سے جوانی کی دہلیز تک اس کا سفر بے خطر گزرتا ہے لیکن اس کی بھرپور جوانی کس طرح خود اسے ڈسنے لگتی ہے اور کس طرح'' حق نمک'' ادا کرتے ہوئے اپنی جاں سے گزرتی ہے یہ سب افسانے میں بڑی مہارت مگر بڑی سادگی سے بیان ہوا ہے۔'' باری باری سرکار'' افسانہ نگار کی ایسی تخلیق ہے جس میں کہانی کا تانا بانا اس خیال پر بنا گیا ہے کہ معاشرے میں انسانی چہروں پر اتنے ماسک چڑھے ہوئے ہیں کہ اصلی نظر ہی نہیں آتا اور جب ماسک اترتے ہیں تو پلوں کے نیچے سے بہت پانی بہہ چکا ہوتا ہے۔یا پھر اسے معاشی ومعاشرتی ضرورتیں اس قدر مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ دوسروں کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔اس کہانی کا کردار'' تبسم'' بھی کچھ ایسے حالات کا شکار نظر آتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب'' یہ جو عورت ہے'' میں آخری افسانے کا نام'' الو'' رکھا گیا ہے یہ کہانی بھی عورت ہی کے گرد گھومتی ہے۔'' مدیحہ'' ایک ایسی لڑکی کا رنگ و روپ ہے جو چار عمر رسیدہ ریٹائرڈ بندوں کی ساقی گری کرتی ہے اور اپنے جوان جذبوں کا قطرہ قطرہ انکے ٹھنڈے جسموں میں انڈیلتی رہتی ہے۔اسے زندہ رہنے کے لیے پیسہ چاہیے اور وہی ٹھنڈے جسم اسکی ضرورت کے مطابق پیسہ دیتے ہیں۔ دنیا کس طرح اپنے دنیاوی امور سلجھانے

کے لیے عورت کے وجود کو استعمال کرتی ہے وہ بھی اس افسانے میں خوبصورت انداز میں بتایا گیا ہے۔ حفیظ خان کا انداز تحریر نہایت سادہ اور دلکش ہے وہ چھپے دار باتیں نہ تو خود کرتے نظر آتے ہیں اور نہ ہی انکے افسانوی کردار اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کرداروں کی بھرمار نہیں ہے بلکہ ضرورت کے مطابق کردار تخلیق کیے گئے ہیں۔ حفیظ خان چونکہ افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ ڈرامہ نگار بھی ہیں اس لیے انکے افسانوں میں کہیں کہیں ڈرامہ بھی موجود ہے خاص کر جب کو کسی افسانے کا اختتام کرنے لگتے ہیں تو ڈرامے کا رنگ ان پر غالب آتا ہے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے ادبی جملے ہی ان کے افسانوں کی جان ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں غیر ضروری طوالت بھی نظر نہیں آتی۔ راقم کو پروفیسر ڈاکٹر سعیدہ رشم کی فلیپ میں دی گئی رائے سے مکمل اتفاق ہے کہ ''ان کا اسلوب سادگی اور پختہ کاری کا حسین امتزاج ہے۔ تکلف سے مبرا ان کی تحریریں جوئے شیریں کی روانی میں رواں دواں ہیں''۔ حفیظ خان کے ہاں محاورے کا استعمال ضرورت کے مطابق ہوتا ہے ''آٹے کی عورت'' میں آپا رضیہ کا کردار بڑی خوبصورتی سے بنا گیا ہے اس کے ساتھ راشد کا کردار پوری طرح جوانی کی امنگوں بھری شوخی لیے ہوئے ہے۔ غرض زیر تبصرہ کتاب ''یہ جو عورت ہے'' جب ایک مرتبہ ہاتھ میں آجاتی ہے قاری اسے پڑھے بغیر کہیں ادھر ادھر رکھ نہیں سکتا۔ کتاب ختم ہونے پر قاری کے چہرے پر ایک تبسم پھیل جاتا ہے اس کا ذہن اور قدم بوجھل نہیں ہوتے۔ ادب دوست ہمیشہ کے لیے حفیظ خان کے دوست بن جاتے ہیں۔

O

(4 ستمبر 2000ء، اسلام آباد)

حفیظ خان کا ''اندر لیکھ داسیک''

رحیم طلب

سرائیکی افسانے کے ڈکشن کی بات ہوتو سرائیکی صاحبِ اسلوب افسانہ نگاروں میں ظفر لشاری ،مسرت کلانچوی اور حفیظ خان کے نام نہایت نمایاں ہیں۔ان افسانہ نگاروں کا انداز بیاں نہایت سادہ اور وسیبی زبان میں ہے۔یہ مذکورہ بالا افسانہ نگار انتہائی پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اپنے افسانے میں،کہانی پن میں علمی قابلیت وصلاحیت کے منفی پن کو نہیں آنے دیتے۔وجہ؟ وجہ صاف ظاہر ہے کہ جو چَس چرھار افسانے کے کرداروں کے مزاج مطابق ہے وہ اوریجنل لوکیشن پر فلمائی گئی فلم سے کم نہیں ہے۔حفیظ خان ایک منجھا ہوا افسانہ نگار ہے تو دوسری طرف وہ ڈراما نگار بھی ہے۔اُس کے ڈرامے میں افسانہ پن اور افسانے میں ڈرامائی پچ ملتے ہیں۔نثر نگاری کی دونوں خوبیوں کو آسانی سے جانچا پرکھا جاسکتا ہے لیکن ناپا نہیں جاسکتا کیونکہ اعلیٰ ادب اعلیٰ ذوق کا محتاج ہوتا ہے پیمانوں کا نہیں۔

حفیظ خان نے 1971ء سے افسانہ نگاری شروع کی۔اکادمی ادبیات سے ان دونوں نثری میدانوں یعنی افسانہ نگاری وڈرامہ نگاری میں سکہ بند ماہر ہونے کی وجہ سے دونوں شعبوں میں صدارتی ایوارڈ یافتہ ہے۔ان کا افسانوی سفران کے مجموعے ''ویندی رت دی شام''،''یہ جو عورت ہے'' سے ہوتا ہوا اب ''اندر لیکھ داسیک'' تک آ گیا ہے۔ذوق قلم اور شوق سفر جاری ہے ''اللہ کرے یہ مرحلہ

شوق نہ ہو طے'' کے مصداق وہ افسانوی ادب کے فروغ کے لیے کوشاں رہیں۔

ان کے ''اندر لیکھ داسیک'' میں نو افسانے شامل ہیں۔ان افسانوں میں خیال و ہیئت کا نیا پن سامنے آیا ہے۔کہانی بیان کرنے کا انداز ہر افسانہ نگار کا اپنا اپنا ہوتا ہے۔حفیظ خان بھی اپنے افسانوں کہانی کو وسیب سے کشید کرتا ہے۔کرداروں کو کسی ماہر مجسمہ ساز کی طرح ان کی تجسیم کرتا ہے اور ان کو خوبصورت اجرک رنگے لفظوں کے چولے سے مزین کر کے اہل ذوق کے سامنے پیش کرنے کا فن جانتا ہے۔میں اگر یہ کہوں کہ حفیظ خان کے افسانوں میں کردار لکھے نہیں گئے بلکہ انسانائے گئے ہیں۔ہر کردار کا لب ولہجہ اس کا اپنی لب ولہجہ لگتا ہے کہیں بھی مصنف کی طرف سے عالمانہ و فاضلانہ گھڑت کا احساس نہیں ہوتا۔

حفیظ خان کے ڈرامے ان کے گہری فکر اور توانا مشاہدے کے غماز ہیں۔حفیظ خان کی اپنے وسیب کے چاروں اطراف بسنے ہسنے رونے رلانے والوں پر صرف نظر ہی نہیں بلکہ وہ اپنے مشاہدے سے لفظی پورٹریٹ بناتے چلے جاتے ہیں۔کہانی پن کے آغاز میں ڈرامے کا عنصر اور انجام بھی ڈرامے کی طرح اچانک دم بخود۔قاری یکدم تحیر و حیرت کے سمندر میں جا گرتا ہے۔لحظہ پل تو ہوش میں نہیں رہتا کہ وہ خود کہاں ہے۔

حفیظ خان نے ''اندر لیکھ داسیک'' میں لوک متھ کی جرأت و پیوندکاری سے سرائیکی افسانے کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔منظر نگاری میں جس طرح اس کے باطن نے محسوس کیا ہے بغیر کسی لحاظ کے اپنے قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔وہ بسا اوقات منظر نگاری میں ادبی مصلحتوں سے کام نہیں لیتا۔ وہ منظر نگاری میں بے لاگ قلمکاری سے فنکاری کا خواہاں ہے۔اس کے افسانوں میں بیرونی لینڈ سکیپ اپنا وسیب ہی ہے۔جاننے والا تو وسیب کو جانتا ہی ہے لیکن نہ جاننے والا بھی پکار اٹھتا ہے کہ یہ کوئی شیریں زبان و نازک جٹیوں کا خطہ ہی ہے۔خالصتاً زبان کا ورتارا حفیظ خان کے اسلوب کا نمایاں عنصر ہے''جھات دے اندر گھات'' افسانے میں ایک جگہ منظر ملاحظہ ہو۔

''جتھ جتھ ریت دے سمندر وچ ساول دے جزیرے نظر آندے اتھ کوں کھلا چھوڑ ڈیندا، جیہڑا ادھ موئے لائی، پھوگ، اُکاں، چوانہہ، کریہنہ دے بوٹیاں کوں بھمبھولی راہندا تے شودا بھوگا لکی

بھوری ریت دے ٹیباں دی اُجاڑ جھکاڑ وچ آون والے ویلے دی لیک لکیند ارا ہندا''۔

''جنیں ویلے اوہناں بھارٹُردی تاں قمیض دی گھمر گھیر نال سینہ ساون دا بدل بن ویندا۔ کِھمن ای کِھمن، گاجاں ای گاجاں، ہوا گھگرے نال کھڑاند کریندی تاں گرولیاں ستھلاں چھمو چھم تھی ویندیاں''۔

اس ''جھات دے اندر گھات'' افسانے میں حفیظ خان نے انسانی حسن سے نہ بچ سکنا ایک فطری اور مقناطیسی امر کے طور پر دکھایا ہے۔ حسن ایک جادو ہے، سحر ہے۔ روپیلے حسن کی رو ہی میں گرفت نہایت بسمل کر دینے والی ہوتی ہے۔

حفیظ خان نے ''مکدی نہیں نبھدی نہیں'' میں عورت کی باطنی نفسیات اور مرضی کی مالک بتایا ہے۔ عورت چاہے تو اپنے مرد میں کسی اور عورت کو حصے دار نہ بننے دے اور چاہے تو اپنے جسم میں کسی اور مرد کی بھی حصے داری قبول کر لے۔ اس افسانے میں حفیظ خان نے جسمانی لذتوں کے لیے عورت کی مرضی کی نفسیات سے پردہ اٹھا کر قاری پر یہ منکشف کیا ہے کہ عورت عورت ہے اپنی مرضی کی ہی مالک ہے کوئی مرد اس کا مالک نہیں۔ اس افسانے میں حفیظ خان نے عورت و مرد کے باہمی تعلق و احساس کو بڑی باریکی سے پرکھا ہے اور اس کا تجزیہ قاری پر واضح کیا ہے چند مشاہداتی حقیقتیں ملاحظہ ہوں۔

''کیا کریجے اے مرد ہے ازلی بے نکا۔ ''فنافی الرن'' تھی کراہیں قبراں ونج لہندے پر لندھیپے توں باز نہیں آندا۔ میں وی لندھیپے دی پاتال تک پُر یندا گیم''

''دھکرائے وجن دی اذیت کنوں ودھ شاید ای کوئی اذیت ہووے۔ ایہہ گاری وی انجھی گاری اے جو پھاتیا پھتک ای نی سگدا''۔

''وجود دی ساری کشش تے مقناطیست انکارتوں شروع تھیندی ہے تے انکار تے مکدی ہے۔ ہک بئے زاویےتوں ڈیکھوں تاں انکار عشق ہے، مزہ ہے زندگی ہے تے اقرار موت، عشق تے وجود ڈوہیں دی''۔

''اندر لیکھ دا سیک'' افسانے میں ہمارے وسیب کی رونقیں ہیں۔ آماں گھاماں بٹ کڑاک، میل ملاپ، بحث مباحثے، اڑاند کھڑاند، بھن ترٹ، رسیے مینوے، چالاکیاں چتراایاں اور پارٹی بازی، یہ ہے

حفیظ خان کا اسلوب، سیاسی وانتظامی تبدیلی پر حفیظ خان کا قلم اس قسم کا پورٹریٹ بناتا ہے۔

''ایڈے چھاپے اوڈے چھاپے۔منشی میراثی تائی پکڑ،دھوبی کٹانڑاں،حلوائی پکڑ
کھکھے للے،کُکر گاشی،پراتھوں کیالبھدا،ملک تاں سبھو کجھ تال چا گیا،چھیکڑی ڈو
سپاہی پلس دے بلہا،کوٹھی حویلی سیل،اتے نوکر مزارع منشی ذلیل۔''

''اندر لیکھ دا سیک'' میں سیاستدانوں کی عوام سے روایتی بے حسی،شان،بے اعتنائی کا رویہ لحظہ لحظہ جھلکتا ہے وہ دھرتی پہ فرعون نہیں بلکہ خدا بنا ہوا ہے۔لیکن اللہ کی لاٹھی بے آواز بجتی ہے اور عبرت کے گہرے نشان چھوڑ جاتی ہے۔

حفیظ خان کردار سازی کے ساتھ،کردار کے خدوخال کے بیان کا ماہر ہے وہ ایک ماہر کیری کیچرسٹ کی طرح قلمکاری کرتا ہے اور ملمع کاری سے مطلق پرہیز۔چند کرداروں کے خدوخال ملاحظہ فرمائیں۔

''چارفٹ قد۔اتلا دھڑ وڈا تے جنگھاں چھوٹیاں،گردن سکی تے لمبی۔نرگٹ دا گٹارا
اتنا ابھریا جیویں پرانے سوڈے والی بوتل اچ پھسی ہوئی بلور والی گولی۔منہ چپاخوں،
نک جیویں نرویا میڑھا تے اوندے تلے مکھی مچھ''۔''تازو،ہک نمبر دا پھتر پڑی،
غصب دا ڈٹ باز گالھیں دا گھوڑ۔جتھ بہہ گیا سو بہہ گیا۔گالھ کیا ٹورنی زمین اسمان
ہک کر ڈتا،کوڑا وچھک کے بدھڑاں جو دھرتی ساڑ ڈیونی۔''

قصہ مختصر حفیظ خان مجموعہ ''اندر لیکھ دا سیک'' میں ڈرامہ اور کہانی پن کے انوکھے نویکلے روپ کے ساتھ سامنے آیا ہے۔تحیر و تجسس اُس کی کہانی کی روح ہیں۔کرداروں کی اس جیتی جاگتی دنیا میں حفیظ خان محوِ حیرت ہے کہ ہم نے زندگی کو بسر کیا ہے یا زندگی نے ہم کو بلکہ میں کہوں گا کہ صاحب ذوق نے زندگی کو بسر کیا ہے زندگی نے بے ذوقوں کو۔آپ کا کیا خیال ہے؟

O

(17 نومبر 2004ء بہاولپور)

یہ جوعورت ہے

مٹھل خان (صفدر بلوچ)

حفیظ خان پیشے کے لحاظ سے ایک منصف ہیں مگر منصف سے زیادہ مصنف کے روپ میں معروف ہیں۔انصاف کے شعبے سے تعلق رکھنے والے ادیبوں خصوصاً افسانہ نگاروں کی تعداد انگلیوں پر گنے جانے سے بھی کم ہے۔انصاف کرنے کے ساتھ ساتھ کہانی بننا اور کرداروں سے انصاف کرنا ایک مشکل کام ہے مگر حفیظ خان نے اسے پوری دیانت داری سے نبھایا ہے۔

سرائیکی زبان میں افسانے لکھتے لکھتے حفیظ خان نے اردو افسانوں کی سمت مڑ کر دیکھا اور یہاں بھی اپنی جگہ بنالی۔ان کی تازہ کتاب ''یہ جوعورت ہے''محض نام سے عورتوں کی کہانیوں کا تاثر دیتی ہے ورنہ اس میں شامل سبھی کہانیاں انسانوں کی کہانیاں ہیں،بقول منو بھائی کے''کتاب میں شامل افسانے تذکیر کے دماغ اور تانیث کی آنکھ سے محفوظ ہیں چنانچہ یہ جوافسانے ہیں یہ مردانے اور زنانے ہیں''انسانے''ہیں اور بہت اعلیٰ ہیں،فکرافروز ہیں،خیال انگیز ہیں۔

حفیظ خان نے خود اعتراف کیا ہے کہ''نہ ساری عورتیں شیطان نہ سارے مرد فرشتے،کہانیوں کو بھی سارے فرشتے چاہئیں نہ سارے شیطان کیونکہ کہانیاں تو ان دونوں قوتوں کے ٹکراؤ سے جنم لیتی ہیں''۔اس کا ثبوت کتاب کی چودہ کی چودہ کہانیاں ہیں جن میں ہر کہانی مرد اور عورت دونوں کی کہانی

ہے، کسی ایک کہانی میں بھی تنہا عورت موجود نہیں ،اور کہانی میں عورت کا ذکر شجر ممنوعہ نہیں الٹا حسن کا باعث ہے کہ علامہ اقبال کے بقول:

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

حفیظ خان کو سرائیکی ادب میں جو مرتبہ حاصل ہے وہ شاید اسے اردو ادب میں تو نہ مل سکے کیوں کہ مادری زبان میں بیان کی قوتیں پورے عروج پر ہوتی ہیں اور خصوصاً سرائیکی کی مٹھاس سے کہانی کا رنگ گہرا ہوتا ہے مگر اردو کہانی لکھنے والوں کی اگلی قطار تک رسائی حفیظ خان کے لیے چنداں مشکل نہیں اور اس کی پہلی کاوش یقیناً اس منزل تک اس کی ہمرکاب ہوگی ۔ ''یہ جو عورت ہے'' اپنے لحاظ سے افسانوی ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے جس کی قارئین تحسین کے ساتھ پیشوائی کریں گے۔

O

(ماہنامہ ''ماہ نو'' لاہور، نومبر 1998ء)

یہ جو عورت ہے

مظہر شہزاد

اردو افسانہ گزشتہ صدی کی ہر دہائی میں نئی کروٹ لیتا رہا ہے۔ بیانیہ افسانے کے بعد علامتی افسانہ، کبھی تجریدیت اور کبھی پھر کہانی کی دوڑ۔ لیکن افسانے کی بہر حال خصوصیت یہی رہی ہے کہ کوئی تحریک بھی اس کے اندر سے کہانی کا عنصر ختم نہیں کر سکی۔ گزشتہ صدی کی آخری تین دہائیوں میں افسانے نے بہت زیادہ فروغ پایا۔ اس کے قارئین کی تعداد میں اضافہ بھی ہوا اور اسے بے شمار نئے لکھنے والے پوری تازگی کے ساتھ میسر آئے۔

تازگی کی اس لہر میں ہمیں حفیظ خان بڑی توانائی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ حفیظ خان اپنی ماں بولی ''سرائیکی'' میں ایک عرصے سے افسانہ لکھ رہے تھے۔ حال ہی میں انھوں نے اردو میں اپنے کچھ افسانوں کے تراجم کیے اور کچھ افسانے براہ راست اردو میں تخلیق کیے۔ حفیظ خان کی کتاب ''یہ جو عورت ہے'' بھی ایک افسانہ ہے۔ دنیا کے تمام بڑے مشاہیر نے عورت کو ہر روپ میں بے حد سراہا ہے۔ انسان کی تخلیقی جیسی جانکاہ مگر ارفع صلاحیت سے لے کر تربیت اور پرورش کی مکمل ذمہ داریوں تک عورت اس کائنات کی سب سے اہم مخلوق ہے۔ حفیظ خان کے افسانوں میں عورت کے روپ، بہروپ اور سروپ کے بے انتہا رنگ نظر آتے ہیں۔ عورت فہم ہونے کا شاید کوئی بھی دعویدار نہیں ہو سکتا

۔عورت جتنا مشکل معمہ ہے بعض صورتوں میں اتنا ہی آسان اور دلچسپ بھی ہوتا ہے۔دنیا کے ہر افسانہ نگار نے اس موضوع پر لکھا ہے۔اردو ادب میں افسانے کی ابتداء ہی ''عورت فہمی'' سے ہوتی ہے۔آگے چل کر بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، رشید امجد، مظہر الاسلام، نیلوفر اقبال اور بے شمار ایسے نام با آسانی لیے جاسکتے ہیں جن کے معروف افسانے ''عورت فہمی'' پر مشتمل ہیں۔حفیظ خان کے افسانوں میں عورت کا خالص پن اور وفا شعاری سے لے کر اس کی ضد، انتقام کی سرشت اور بے وفائی جیسے موضوعات بھی شامل ہیں۔ان کے کچھ افسانوں میں بڑی شدت کے ساتھ یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔موضوعات کے تنوع کے باوجود بعض مقامات پر وہ ایک خاص دائرے سے باہر نہیں نکل سکے۔ان سب باتوں کے باوجود مذکورہ کتاب بلاشبہ اردو میں ایک واضح اضافہ ہے اور اس کتاب کو قاری یکسر نظر انداز نہیں کرسکتا۔کتاب کے فلیپ پر منو بھائی لکھتے ہیں۔

''جس طرح مردوں کی خرابی ہے کہ وہ عورتوں کو مردوں کے ذہن اور آنکھ سے دیکھتے ہیں اسی طرح عورتوں کی خامی یہ ہے کہ وہ مردوں کو عورتوں کے ذہن اور آنکھ سے دیکھتی ہیں اور دونوں اکثر بھول جاتے ہیں کہ وہ مرد اور عورت ہونے کے علاوہ انسان بھی ہیں''۔

حفیظ خان کے افسانے پڑھتے ہوئے اس کی ذہانت، مشاہدے اور افسانے پر گرفت کی داد دینی پڑتی ہے۔کتاب میں ''آٹے کی عورت''، ''غیرت'' اور ''باری باری سرکار'' نمائندہ افسانے گنے جاسکتے ہیں۔گو حفیظ خان کے موضوعات چونکا دینے والے اور اچھوتے نہیں ہیں۔لیکن بلاشبہ ان میں تازگی بہت نظر آتی ہے۔خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ یہ کتاب ملوہا پبلشرز ملتان نے شائع کی ہے۔

O

([illegible]مبر 1998ء)

سرائیکی مضامین

ویندی رُت دی شام

ڈاکٹر مہر عبدالحق

1956ء وچ ڈیرہ نواب صاحب (بہاول پور) اچ اکھ کھولن والا حفیظ خان، کل دا ریڈیو پروڈیوسر، وکیل، وفاقی سول سرونٹ، یونیورسٹی وچ قانون دا استاد اتے ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر، اج انصاف دی کرسی اتے بیٹھے۔ ایں طرح ادب دی اصناف اچ بھانویں افسانہ ہووے، ڈرامہ ہووے یا ول شاعری، حفیظ خان ہر صنف دا سنگھار، ہر جا نمایاں اُتے انو دا اپنا نویکلا انداز ہے۔ او اپنے وسیب تے اپنے لوکاں نال جڑیا ہویا وی ہے تے اوناں کنوں اَنج تے نمایاں وی ہے۔ یقیناً او اج دے سرائیکی ادب دا مستند حوالہ ہے۔

O

(فلیپ ''ویندی رت دی شام'')

ویندی رُت دی شام اتے نیٹ رزلٹ

محمد اسلم رسول پوری

پاکستانی سماج قبائلی اتے جاگیردارانہ نظام دی بھج ترٹ اتے سرمایہ دارانہ نظام دی ابتدائی تشکیل نال عبارت ہے۔ جتھاں پرانے عقائد، نظریات اتے اخلاقی قدراں زوال دیاں شکار ہن۔ اُتھاں نویں خیالات کوں قبول کرن وچ اساڈی سوسائٹی کوں کجھ مشکلاں درپیش ہن۔ ایہا وجہ اے جو اساڈیاں شکلاں تے کردار ادھورے۔ مسخ شدہ۔ نامعلوم نفسیاتی، جسمانی اتے جنسی الجھن دا نمونہ ہن۔

میڈے خیال وچ اساں وچوں ڈھیر سارے لوک ایں گالھ تے متفق ہوسن، جو کوئی وی فنکار جیڑھی سوسائٹی دا حصہ ہوندے۔ اپنے نظریات اتے کردار اتھاؤں گھندے۔ اتے ول اُنہیں کوں ہک تخلیقی رنگ روپ ڈے تے قارئین دے سامنڑیں پیش کریندے۔

حفیظ خان وی اساں وچوں ہے۔ اوندے افسانوی مجموعے ''ویندی رُت دی شام'' کوں پڑھوں تاں ایندی تائید تھیندی ہے۔ کیوں جو اوندے سارے کردار اساڈی سوسائٹی اتے روزمرہ زندگی دا حصہ دارلگدن جیڑھے ہر ویلے اساڈے سامنڑیں کنوں لنگھدن۔ لیکن اساں اُنہیں ڈو توجہ نسے ڈیندے۔ شاید کوئی تخلیق کار اساں عام آدمیں وانگوں نہ گزردا ہووے۔ اگر گزردا وی ہووے تاں او نداشعور انہیں سارین منظریں اتے کرداریں کوں از خود تے چپ چاپ محفوظ کر گھندے۔ ول کہیں

دی تخلیقی عمل وچ اوسب کجھ فنکار دے قلم دے سپرد کر ڈیندے ۔جیندا لبعض اوقات خود تخلیق کار کوں دی احساس نہیں تھیندا۔

حفیظ خان آپنے سب کردار خود تخلیق کیتن ۔بعض جاہیں تے میکوں احساس تھیئے جو اوں آپنے خیال کو پیش کرن کیتے کہانی دے کرداریں دی بنت وچ خاصی ذہنی اذیت بھوگی اے ۔ تاہم اے کڈاہیں نہیں آکھیا ونج سگیندا جو اوندی کہانی دا مواد اتے کردار خلاء وچ تخلیق تھیئے ۔ایہا وجہ ہے جو ایں بھجدے ترٹدے تے نویں تعمیر تھیندے سماج وانگوں اُنہیں وچوں اکثر نامکمل، معذور، جنسی صلاحیت تو محروم، جنسی عدم تسکین دا شکار اتے جذباتی ہیجانیں وچ گرفتار ہن۔ لیکن ایندے برخلاف وی بہوں سارے بئے کردار زندگی دے نویں جذبیں نال سرشار، پرعزم جدوجہد دے پیکر، مامتا دے جذبے نال مست اتے زندگی دی بقاء دے تسلسل کوں قائم رکھن کیتے سینہ سپر ہن ۔ایہا وجہ ہے جو ایہہ سارے کردار جیڑھے بھج ترٹ دا شکار وی ہن تے زندگی دی بقا دی جدوجہد وچ ہمت نال شامل وی، اتے سماج دے حقیقی نمائندے تے سچے عکاس ہن۔

تیلی جیڑھا جنسی صلاحیت تو محروم ہے۔سماج دیاں زوال پذیر قدراں دا طعنہ نہیں سنن چاہندا تے روزانہ سویرے نال تولیا تے صابن چاء تے حمام ڈو بے وجہ ونجن دا کرب سہندے ...... اتے نوجوان رشیدہ جنسی تسکین توں محروم کھڑے اُتے آلساں بھنن دے تھکا ڈیون والے عمل توں بیزار تھی ویندے اے۔اتے بالآخر بوسیدہ سماجی قدریں کوں تھڈا مار تے جیندے رہن دا نواں اہر کریندی ہے۔جیندا نتیجہ سماج دی پرانی قدریں دی نمائندہ ماء تے وضع دار تیلی دی موت دی شکل وچ ظاہر تھیندے ۔

جام مراد دی پوری زندگی جنسی عدم تسکین دا شکار رہندے ۔اتے اونکوں جیڑھلے آئیڈیل ملدے تاں اوندے اُتے اخلاقی قدریں دا ایہو جیڈا دباؤ ہوندے جو اُوا نہیں کوں بھن تھیں سگدا اتے دھڑام نال مرویندے ۔

بھاتی پھتکی دا کردار نسیم پرانے اتے نویں سماج دی ٹکر دے نتیجے وچ غیر متوازن شخصیت اتے جذباتی ہیجان دا پیکر لگدی اے۔اوپرانے قدریں دی پاسداری وچ آپنی نسبت نال وفاداری دا حوائگی عصمت دی حدتائیں اظہار کریندی اے۔لیکن نویں مادی قدریں دے دباؤ دا شکار تھی کراہیں دولت

دے پچھوں وی ٻجھ دھرک کریندی راہندی اے۔ لیکن باتا آخر ترٹ ٻجھ دا شکار تھیندی اے جو شخصیت دی نویں تعمیر دی بجائے سب کجھ ونجا بہندی اے۔ اتے اوندا حاصل نہ ہوون کھاویندا ہن۔

جتھاں حفیظ خان دے ایہہ سارے کردار سماجی ٹُٹ ترٹ دا نفسیاتی اظہار ہن۔ اتھاں نویں سماج دے آغاز تے تعمیر کیتے نویں جذبیں نال سرشار کردار وی ملدن۔ جسمانی نقائص دے باوجود "اپا پیپ" ہک باہمت اتے پرعزم کردار اے۔ جیڑھا آپݨی فطری کمزوری دے ازالے اتے آپݨی ذات دی تکمیل اللہ ڈیوایا دی شکل وچ کریندے۔ اتے آپݨی حیران کن جدوجہد نال دنیا کوں متحیر کر ڈیندے مگر آخر وچ آپݨی محرومی تے رووݨ پوندے۔ جو او قدرت دی ہک انجھی تخلیق ہن جیں کنیں جذبے تاں ہن مگر تسکین کیتے جسمانی تقاضے نہ ہن۔

"بوتے" دا کردار رضوان، زندگی دی بقا کیتے آپݨی بھرپور جدوجہد کہیں حالت وچ تے کہیں مقام تے ترک نہیں کریندا۔ او اجاڑ رہی وچ اندھاری گھپ رات کوں پیدل ٹُر ٹُر تے زندگیاں بچاون تے اوندے تسلسل کوں قائم رکھن کیتے ان تھک جدوجہد کریندے۔ اتے ایں طرح پوری کتاب دا ہک مثالی تے محترم کردار بن ویندے۔

گگی دا معصوم تے سادہ کردار زندگی نال سچی محبت اتے ماما دے جذبے دا شاندار اظہار اے۔ توڑے جو گگی کوں شادی نصیب ای نہیں تھئی۔ لیکن او زندگی دے تسلسل کوں ہر مقام تے وی قائم رکھن دی جدوجہد کریندی اے جتھاں ہک حقیقی تے سچی مامتا وی بے بس تے لاچار نظر آندی اے اتے گگی ایں جدوجہد وچ آپݨی زندگی قربان کرن توں وی نہیں جھکدی!!

"ویندی رُت دی شام" دے سارے افسانوی کرداریں دا تجزیہ کیتا ونجے تاں او آپݨے طبعی میلانات اتے اختلافات دے باوجود ہک مشترکہ جذبے تے جدوجہد دی عکاسی کریندن۔ اتے او جذبہ، زندگی دے تسلسل کوں قائم رکھن اتے اوندی بقاء کوں تحفظ فراہم کرن دا جذبہ اے۔

تیلی ہووے، بھانویں رشیدہ، نسیم ہووے، بھانویں گگی، مولوی عبدالقدوس ہووے، بھانویں حور بی بی، جام مراد ہووے، بھانویں اپا پیپ، سبھ کردار توڑے جو کوئی معذور ہووے، بھانویں عدم تسکین دا شکار، زندگی دے تسلسل کوں قائم رکھن دے تقاضے کنوں نہیں ہٹدا۔ بلکہ ایکوں ہر حالت وچ قائم رکھن دا اہر کریندے۔

افسانہ ''بوٹے'' تونیں جو اپنے مزاج دی روح نال ''ویدی رُت دی شام'' دے بنھیں افسانیں کنوں قطعی مختلف اے (اتے اوندی کہانی تے رومانی یا جنسی فضا طاری نئیں راہندی) ایندے باوجود اوواضح طور تے زندگی دی بقاء دی جدوجہد دا کھلا تے نمائندہ افسانہ ہے۔

''زندگی دی بقاء دی جدوجہد'' ایہہ ہے حفیظ خان دے سارے کرداریں دے نفسیاتی تجزیئے دا حاصل۔ اگرچہ ظاہر طور تے اکثر کردار جنسی حوالیں نال آپنے مختلف روپ بناتے اساڈے سامنڑیں آندن۔

''ویندی رُت دی شام'' دے ساریں کرداریں دی ساخت فطری اتے بے ساختہ اے۔ انہاں وچ بناوٹ اتے تصنع کتھائیں نظر نئیں آندا۔ اِت واسطے حفیظ خان دا فن کہیں نظریاتی پروپیگنڈہ دا شکار نئیں تھیندا۔ پوری کتاب دے افسانیں دا ہکو مجموعی تاثر بنڑدے...... لیکن ایہہ مجموعی تاثر بناون دی شعوری کوشش وی نئیں کیتی گئی اتے نہ کہیں حکیم وانگوں کوڑی دوا پلاون دا جبر کیتا گئے جو او ضرور افسانہ نگار دے نظریے کوں تسلیم کرے۔

نظریہ یا فکر جتلا اای کہانی دے اندر لُکیا کھڑا ہووے فن دا معیار اُتلا ای اُچا ہوندے۔ حفیظ خان ساکوں صرف کہانیاں سنا ئین۔ یا ایہہ یاد ڈیوائے جو اینجھے کردار وی اساڈے وسیب دا حصہ ہن۔ اساں انہیں کوں ڈیکھ تے بصیرت تے عبرت حاصل کروں، تے تھی سگے تاں انہیں واسطے آپنے دل وچ ہمدردی دا جذبہ وی پیدا کروں۔

میڈے خیال وچ اگر کوئی تخلیق کار آپنے قاری اندر ایہہ جذبہ پیدا کر گھندے۔ جیڑھا او پیدا کرن چاہندے تاں او کامیاب فنکار اے۔ اتے ایں حساب نال ہک سول جج صاحب کوں شاباش اے جو ادبی نقادیں دی عدالت وچ اوندا نیٹ رزلٹ Maintain رہ گئے اتے اوندیں کہانیاں اعلیٰ ادبی معیار تے پوریاں آن لتھین۔

O

(ماہنامہ سرائیکی ادب ملتان، مارچ 1991ء)

حفیظ خان ''ویندی رت دی شام'' دے پس منظر اچ

عامر...

کہانی اتنی پرانی ہے جتنی انسان دی اپنی تاریخ، بھانویں اے پتھریں تے تصویریں دی شکل
وچ اے، بھانویں تحریر تے یاوت سینہ با سینہ چلدی روایت اے، انسان دے اندر تے باہر ڈوہیں
نال تعلق رکھیندی اے۔ کہیں ایکوں سدھے سادے انداز اچ ڈٹھے تک کہیں تجریدی اکھ دے نال
تے کجھ لوگ ایجھے وی ہن جنہاں ظاہر دی اکھ نال انہاں مسائل کوں اپنا موضوع بنڑائے جیہڑے
انسان دی اندرونی ترٹ پھرٹ دا اظہار ہن۔ حفیظ خان دے افسانے ایں قبیل نال تعلق
رکھیندن۔ انہاں دے کردار، کہیں نہ کہیں جسمانی یا روحانی کمی دا شکار ہن، تے ول اے کمی انہاں
دی نفسیاتی کیفیت کوں کیویں متاثر کریندی اے، ایندا بیان ای انہاں دی کہانیاں دا انت ہے۔
جیہڑھا وی کہیں جسمانی کجھپ دا شکار ہوسی او اتنا معاشرے کنوں شاکی ہوسی۔ تے معاشرے
دے کردار دی تاں اوندے نال ہمدردی کرن دی جاء، اوندے کنوں انتقام گھن اپنا پیدائشی حق خیال
کریندن۔ انہاں دی طعن تشنیع، انہاں دے آوازے، نویں نویں ناں، فرد کوں مزید احساس کمتری دا
شکار بنڑا ڈیندے ہن تے نکی جئی وی حقیقت انہاں واسطے ہک وڈی آرزو بن ویندی اے۔ اے
حقیقت وی ہے جو عام آدمی دی خواہشات، آرزواں تے امنگاں اوندی اپنی وسعت تے وس دے
مطابق ای ہوندن پر انہاں کول محرومی ہرواری ہک نویں کہانی دے روپ اچ ساڈے سامنڑیں آندی

اے۔حفیظ خان دے قلم اچ اے طاقت ہے جو کردار نگاری ویلے نکی نکی جزئیات کوں وی اپنی اکھتوں اوڈھریں تھیون ڈیندا۔مشاہدے تے اوندی گرفت ہے۔کردار دی سیرت بیان کریندئیں اُو اوندا پورا سراپا بیان کرڈیندن۔جتھاں ضرورت محسوس کریندن، مکالمے نال تاثر کوں ودھا ڈیندن۔

''تن من سیس سریر'' ہک ایجھا افسانہ ہے جیندے محروم کرداراساں اپنے آسوں پاسوں ڈیکھ سکدے ہیں۔ماء پیو دی پسند دی شادی، اپنی ذات بارے نرگیست دا کمپلیکس، چھوٹے چھوٹے قصبے دیاں فضاواں اچ پلن آلے لوکاں دی نفسیات، اے سارے تلازمے ایں افسانے کو ہک بہترین افسانہ بنڑا ڈیندن۔ایندا کردار جام مراد بیاں دیاں مراداں تاں پوریاں پیا کریندے تے آپ ساری عمر تڑپدا رہندے۔اے تڑپا اوندی ذات دا کاہپ ہے۔جیندا اظہار او بئے کہیں نال کروی نئیں سکدا تے ول اپنی محرومئیں دا بدلہ او پتر دی کامیابئیں کنوں گھنڑ چاہندے۔صنف مخالف دی کشش او آخر تونڑیں محسوس کریندا راہندے تے آخر اچ عملی قدم چاون لگدے تاں موت مقدر بن ویندی ہے۔انیوں لگدے اے انجام حفیظ خان معاشرے کنوں اجھک تے بنڑا ڈتے۔بہرحال ایندی ساری تبدیل تھیندی کیفیت افسانے تے گرفت، منظرکشی نے جزئیات نگاری وی عروج تے ہے۔

انیویں افسانہ ''لگی'' ہک محروم چھوہر دی کہانی ہے۔معاشرے اچ عورت اونویں مظلوم ترین حالت اچ ہے تے ول او بے بس لاچار تے آرزوئیں دے ہتھوں بھنی تر ٹی چھوہر جیندے نال معاشرہ اوہو سلوک کریندے جیندی توقع اساں رکھیندے ہیں۔جے تئیں او چپ راہندی ہے۔اوندی عزت توقیر بئے انداز نال تھیندی اے۔پر اوندی خواہش، جنج کوں تر تر ڈیکھن اودے اندر دے کرب دا اظہار ہے۔معاشرے اچ جہیز دی لعنت، چنگے رشتے دی تلاش بہوں سارے گھریں اِچ چھوہریں کوں گوہے وانگ دکھن تے مجبور کرڈیندی اے۔انت اچ ''لگی'' دا بال کوں بچاون اتے اپنے آپ کو مٹا ڈیون اوندے اندر دی محبت دا اظہار ہے۔

اینویں افسانے ''بوتے'' وچ حفیظ خان نے ایں دنیا دی بے ثباتی تے بدن اندر بھجدے ڈر دی سریر کوں بیان کیتے۔روہی اچ بئے مسافر دی تلاش اچ اپنی جند دی قربانی کرڈیون انسانیت دا جذبہ تاں ہے پر کاہپے دے ڈر نے ہک کردار کوں تاں اصلوں بزدل بنڑا ڈتے۔او اپنے آپ تے ضبط نئیں کرسکدا تے آپ ہی انپڑیں جان دا نذرانہ پیش کرڈیندے۔اندھارے دا خوف انسان دے

بنیادی خوفاں اچوں ہک ہے۔سوجھلے دی تلاش اچ بعض لوک آپنے ہتھیں اینویں جان ڈیجا باہندن۔ پر کجھ لوک سوجھلے دی جستجو اچ اگوں ودھدے راہندن تے کامیاب وی تھی ویندن اتے ایں تلاش کوں او زندگی دا مقصد بنڑا گھندن۔

افسانہ ''قابل'' خاص طور تے ڈیکھن والا ہے۔کیوں جو ایندے اچ افسانہ نگار نے وڈے ماہرانہ انداز اچ قاری دے دماغ کوں اپنے نال نال چلائے ایں خاطر اودلچسپی پیدا کریندے۔ حالات تے واقعات ،اقوام عالم دی سیاست غرض جیہڑھی شئے اوندی گرفت اچ آندی اے بیان کریندے۔مرکزی کردار اتنی توانا شکل اچ سامنے آندے جو اساں اوندی خوبئیں کنوں متاثر تھیندے ہیں پر انجام اچ اساکوں ہک جھٹکا لگدے تے اَساں افسانہ نگار دی بندش تے اوندے اسلوب دے قائل تھی ویندے ہیں۔

ہک لحاظ نال افسانہ ''حاصل جمع'' وی اہمیت دا حامل ہے جو ایندے اچ ڈو کردار حالات تے واقعات دے نتیجے دچ کھٹے تھی ویندن پر اُنہاں وچ ہک نکا جیا اختلاف اُناں ڈوہاں کو ہک ڈوجے کنوں دور کر ڈیندے۔ پرائے نکھیڑا وی اُنہاں کوں انج نئیں کر سکدا۔ایندا انجام عجیب جیا ہے۔جواو خوبصورت مرد ہک کالے رنگ دی عورت نال پرنیج ویندے تے او خاتون ہک نیگرو نال شادی کر گھندی اے تے ڈوہاں دی اولاد دا رنگ وی کالا ہوندے تے ایں پوائنٹ تے اُنہاں ڈوہاں دا اکٹھا تھیون وی خوب لگدے۔

غرض حفیظ خان دے افسانے اساڈے آنپڑیں وسیب دے افسانے ہن جنہاں دے کرداراں کوں آساں آنپڑیں چار چفیر ٹردے پھردے الیندے بلیندے ڈیکھدے ہیں۔اُنہاں کرداراں دی گرفت اُنہاں دے ڈونگھے مشاہدے دا پکا پکا ثبوت ہے۔اے افسانے سرائیکی ادب اچ یقیناً ہک بہوں اہم مقام دے حامل ہن تے قاری تے نویں آون آلے افسانہ نگاریں تے یقیناً اثر چھوڑیسن۔

O

(15 ردسمبر 1989ء)

ویندی رُت دی شام...... ہِک ادبی سوکھڑی

ظفر لاشاری

سرائیکی افسانہ حالات دی کھر بن وچوں دھابے دھوڑے کھاندا تے ہن انہاں راہوں تے اگونہیں پندھ کریندا نظر آندے جتھاں پاکستان دی قومی زبان اردو یا علاقائی زباناں دا افسانہ پندھ کریندا پئے۔ سرائیکی افسانہ ادبی منزل دی تریہویں بُرزی کو جتھاں مشکلاں تے اوکھائیاں نال ہتھ لاتے اگوں تے ودھے او کہیں توں او ڈھر کائنی۔ ذرائع ابلاغ دی کمی، پڑھن والیاں دی بے روحی، اشاعتی اداریاں تے لکھاریاں دی تھوڑ۔ ہن اللہ دا فضل ہے جو کل تئیں سرائیکی افسانہ لکھاریاں دی چیچے جیڈی فہرست ہُن، گٹھیں تے دِگھر گئی اے تے حفیظ خان ایں فہرست وچ اپنا نویکلا مقام رکھیندن۔

حفیظ خان دی اصل سنجان تاں سرائیکی ڈرامہ ہے۔ آپ سرائیکی ڈرامے دی موہری لکھاری ہن تے پہلے صاحب کتاب ڈرامہ نگار ہن پر افسانہ، ڈرامے توں وی پہلے دا لکھدے پئن۔ حفیظ خان اعلیٰ تعلیم یافتہ تے انصاف دی کرسی تے بہہ تے لوکاں دے نیاں چکاون والے انسان ہن۔ لوکاں دے مسائل وسیب وچ چھک تان دے اسباب، جھیڑ یا جھٹیاں دے نتیجے تے انسانی زندگی کوں پیش آون والے دھکے دھوڑے ہر ویلے انہاں دی میز تے ڈھگ لگے رہندن۔ آپ انہاں مسائل تے

مشکلات دا نہ چھڑا مطالعہ تے مشاہدہ کریندن۔ بلکہ انہاں بارے سوچ وچار کرتے انہاں دا حل
گلیندن۔ سوچ وچار دی ایہا ٹِک انہاں دے اندر دے حفیظ خان کوں شعور فہم، ادراک دے
ڈھیر سارے سوجھل رستیاں دا سونہاں کرڈتے جو کہیں وی وسیبی مسئلے دا کُھرا پیرا چاتے اوندے
تئیں پُجدیاں انہاں کوں اوکھ نیں تھیندی۔

افسانہ مسائل دا اولنا ہوندے۔ ہر افسانے وچ کوئی نہ کوئی نکتہ ہوندے جیکوں افسانہ نگار لفظاں
دے غلیفاں اچ کج تے قاری کوں پیش کریندے۔ حفیظ خان ہوریں وی ڈھیر سارے نکتے، ڈھیر
سارے مسئلے رنگ برنگی بشکیاں اچ ویڑھ تے ساڈے سامنے رکھن۔ انہاں وچ اندرون خانہ زندگی
دے مسئلے وی ہن۔ انسان دی ذات دے اندر وچ قیامت مچیندے جذبیاں دی قیل مقال وی ہے۔
دردرد دھکے کھاندی، رے سینکی انسانیت دا درد وی ہے۔ محبتاں دی اُسار تے بھن تروڑ وی ہے تے
حوصلیاں دا درس تے ٹسکے وات جذبیاں دا انجام وی ہے۔ انہاں سارے عناصر دے اظہار واسطے
حفیظ خان جیہڑی زبان ورتی اے تے جیہڑا اسلوب اختیار کیتے ہیں بغیر کہیں رہ رواتے وٹب دے
ایہہ اکھن وچ حق بجانب ہوساں جو ایہہ روایت کنوں ہٹ تے ہے انہاں پہلی واری سرائیکی افسانے
کوں اتنی سلونی تے چسولی زبان عطا کیتی اے۔ افسانے دا مزاج ہمیشہ سنجیدہ تے ایندے متھے تے
تریڈھی رہی ہے پر حفیظ خان روایت دے سارے بت تروڑ تے جمل جہان دیاں مسکاراں اپنے
افسانیاں دے لفظ لفظ اچ ستھ ڈتن۔ گلی تے بوتے کوں چھوڑ تے باقی ہر افسانے کوں پڑھدیں ویلے
تہاکوں تہاڈی مُسک ٹہکاریاں دے ویس وٹیندی تاں نظر آسی پر متھے تے گھنڈی پوون دا احساس نہ
لبھسی۔

حفیظ خان کول عام زبان وچ بولے ونجن والے مخصوص لفظاں دا ہک خزانہ موجود ہے تے
انہاں لفظاں دے مناسب استعمال دا فن وی ہے۔ انہاں دے ایہہ لفظ ڈُنی وے آسوں پاسوں
لکھاں کچھاں وچ کتکالیاں کڈھیندیاں اوانگلیں ہن جنہاں دے جلول تے سروراگوں بندہ بے وس
تھی تے مُرک پوندے۔ انہاں سنجیدہ توں سنجیدہ نکتے کوں وی ایڈے بھانوے انداز وچ پیش کیتے جو
پہلے آپ مہانی کھل آویندی اے جہڑی جھلیاں نہیں جھلیندی، پر افسانہ مکدیاں مکدیاں اکھیں د...

تلے ہنجو یں دی سیکل نال پُس چکے ہوندن تے ہوٹھاں توں ٹھڈے ساہ پئے جھر دے ہوندن ۔حفیظ خان اپنے قاری کوں ہک اَنجھی عجیب جاہیں کیفیت وِچ مبتلا کر ڈیندن جو اوٹھکارے دی مریندے تے ٹھڈے شکارے وی بھریندے تے جذبات نگاری دا ایہو فن کہیں لکھاری دے فن دی عظمت دا ثبوت ہوندے۔''ویندی رُت دی شام''،''قابل''،''مائی بڈھی دا گھوڑا'' تے ''جنت حور قصور'' وِچ حفیظ خان دا اے فن اپنے پورے عروج تے نظر آندے۔

حفیظ خان دے افسانیاں وِچ زندگی دا احساس واضح طور تے نظر آندے اُنہاں دے افسانیاں دے کردار اپنی سا گی اصلی شکل صورت وِچ ساکوں اپنے آسوں پاسوں بھجدے ڈُرکدے نظر آندن ۔انہاں دا ہر کردار اپنی جاتے ہک علامت ہے۔ہک استعارہ ہے جہڑا حفیظ خان دے مقصد دی ترجمانی کریندا معلوم تھیندے۔گگی ،اپا پیپ ،مولوی قدوس ،تیلی پہلوان،''مائی بڈھی دے گھوڑے'' دا قصولی تے ''بھاتی پھتکی'' دی نسیم ۔ایہہ سارے کردار اساں روز ڈیہدے تاں ہیں پر انہاں وِچوں کتنے ہن جہڑے ساڈی محبت ،شفقت ،ہمدردی ،اللہ ترسی تے رہنمائی تے حقدار ہن ، حفیظ خان دے افسانے ساڈی توجہ ایں پاسے کرویندے، چھانٹے دی لٹری ہن۔

''بوتے'' ایں مجموعے دا بہوں خوبصورت تے سنجیدہ افسانہ ہے جیکوں پڑھدیاں ہوئیاں بت دیاں کنڈ یراں کھڑیاں تھیون لگ پوندن ۔اینویں لگدے جیویں روپے دی ترسی روح اجھو ساڈو آئی۔ڈر تے خوف دی ایں کیفیت دا وسواس لکھاری دے فن منظر کشی دا کمال ہے۔افسانے دے ایں نکڑے جہے کینوس وِچ اُجاڑ روہی دی اندھی رات تے روح دی دہشت دی جیویں منظر کشی تے روہلیاں دے اعتقاد دی ترجمان کیتی گئی اے او لکھاری دی روہی نال تے روہیلے وسیب نال گہری عقیدت ،محبت تے سدھ بدھ دی نشانی اے۔ایں افسانوی مجموعے دا ایہہ بہرا افسانہ نرا پُرا چھرکیاں کڈھاون دی دلیل ای نہیں بلکہ خوف دی کالی رات اچ مقصد دا جہڑا چندر چڑھایا گئے اوندا سوجھلا سارے ڈر ڈکل دور کر ڈیندے۔ایں افسانے دا مرکزی خیال ایہوای ہے جو دنیا ہک اجاڑ روہی دی مثال ہے جتھاں قدم قدم دے بھلی پوون دا ڈر ہے جو مسائل دے اُچے اُچے ٹبے ہن ۔روپے دی روح جیہاں خوفناک دنیاوی ڈائنیں دے چمڑن دا اُلکا ہے۔بے نرواری دا اندھارا ہے اُکرس ہے۔

تریہہ ہے جے انسان انہاں قوتاں دے تلے لگ تے حوصلے ہار بہے تاں زندگی، موت دا روپ دھار
گھندی اے۔ ایں افسانے وچ ساڈے واسطے ہک سنیہا ہے۔ ہک پیغام ہے جو زندگی تاں نال دی
مقصد دا ہے۔ جستجو دا ہے۔ ایہہ جستجو دے جذبے تے منزل تونی پجن دا شوق ای ختم تھی ونجے تاں
انسان مٹی دے بے جان بوتے توں ودھ کجھ کائینی۔

حفیظ خان دی مشاہداتی آکھ بہوں سجاک تے سوجھل ہے۔ اووسیب دیاں محرومیاں، بے
نرواریاں، کھپاریاں تے وسیبی لاہی چاڑھی کوں بہوں کولھوں کنوں ڈیکھدن۔ اوندا تجزیہ کریندن تے
''نیٹ رزلٹ'' قاری کوں پیش کرڈیندن۔ انسان دیاں خواہشاں، اُمنگاں آرزوآں، سکاں، سہجاں
کوں بیان کرن دا انہاں کول ہک خاص انداز ہے تے حالات دی نقشہ لکائی ایں کریندن جیویں او
خود اوں کیفیت وچوں گزر چکے ہوون۔

سچا ادب اپنے وسیب دا عکس ہوندے۔ اوادب بے مقصد تے اجائی سمجھیا ویندے جیندا اپنے
وسیب نال اپنے تل نال کوئی گانڈھا نہیں ہوندا تے او تخلیق یہوں جلدی اپنا مقام ونجا بہندی اے جہڑی
قاری دی سدھ بدھ کنوں کئی ہتھ اُچی ہووے۔ سرائیکی وسیب دیاں اپنیاں نویکلیاں قدراں
ہن۔ اپنے تقاضے ہن۔ تے حفیظ خان انہاں تقاضیاں کوں پیش نظر رکھیندیاں ہوئیاں وسیب دی اپنی
زبان وچ گالھ کیتی اے۔ انہاں کہیں جاء وی اوپری تے گنجھڑی ہوئی زبان نی ورتی۔ انہاں دا لہجہ عام
فہم، سادمرادا تے چسولہ ہے۔ ہک اواویلہ وی آ گیا ہا جو سرائیکی افسانہ اوپرے لگھے پاتے اپنی شکل ونجا
بیٹھا ہا۔ چھڑے لفظ باقی آ بچے ہن، کہانی ناں دی کوئی چیز افسانے وچ نظر نہ آندی ہئی پر ''ویندی رُت
دی شام'' اوں روایت کوں تروڑتے لفظاں دی کھیڈ وچ کہانی دی واری آ ولائی اے۔ حفیظ خان
اپنے افسانیاں وچ کہیں جاء دی علامت دیاں گھوڑیاں دا سہارا نی گھدا۔ اُنہاں جہڑی گالھ وی کیتی
اے چھڑی چھنڈ کی کیتی اے۔

مُکدی گالھ اے جو ''ویندی رُت دی شام'' ہک انجھی بنگری پنگری شام ہے جیندے وچ
ادب دے سارے رنگ، ذوق دے سارے سوجھلے، زبان دے سیکے چرھار تے فن دیاں سبھیاں
خوشبوئیں محفوظ ہن۔ ''ویندی رُت دی شام'' ہک حساس شام ہے جیندی ہلکی ہلکی للائی وچ ٹوبھے دی

من تے بہہ تے، پانی بھریندیاں نینگریں دے سر تے ہتھ پھریندے مراددیاں سکاں دے نکے نکے وین، وسیب دی چنے کیتی گئی دی قربانی، روپے دی روح تے اُساری گئی مقصد بھری حیاتی دا سینہا، تیلی پہلوان دے زٹل، چھورے چھنے رے سینکے اپا پیپ دا کچھ وچ ہتھ ڈے تے کلکتی چلاون دی کاؤتے ول نہر دی بھرتے بہہ تے ماسی دے گھر دوڑ تُرڈ یکھ تے روون دی پڑڈو، جنت، حور تے مولوی عبدالقدوس دیاں نمکوئما گالھیں دی چلبل ہمیشہ سُنڑ یندی راہسی۔

تساں کلہے ہووتے موجھے بیٹھے ہووتاں ''ویندی رُت دی شام'' دو ہک نظر ضرور مارو۔ یقیناً تہاڈے تھوڑاں تے مُسک کھنڈ ویسی۔ ''ویندی رت دی شام'' قارئین واسطے ہک سوکھڑی ہے، ہک تحفہ ہے تے سرائیکی ادب دا سنگھار ہے۔

O

(تحریر 16 فروری 1990ء، پیش لفظ ''ویندی رُت دی شام'')

حفیظ خان......ہِک عجب کہانی کار

رفعت عباس

سرائیکی دی نویں کہانی داپندھ ڈھیر پرانا کینی۔ جڈن حفیظ خان کہانی لکھن شروع کیتی ایں راند کوں رسے 7,5 سال تھئے ہن۔ غلام حسن حیدرانی، احسن واہگہ، عامر فہیم کہانی دی ٹور ترکھی کر چکے ہن۔ حفیظ خان دی کہانی توں پہلے اساں ڈیدھے ہیں جو اِنہاں کہانی کاریں سرائیکی کہانی دا کیا مہاندرا بنائے جوڑے۔

غلام حسن حیدرانی دی کہانی کہیں وی تل وسیب وچ جاگن والی ہِک روایتی کہانی ہے جیندے وچ قصہ تے اوندے کردار ساڈے اپنے جانوں۔ تے سوہنیں ہوندن۔ تے انہاں دی کیتی کرتی وی اساں پہلے کُجھی ہوندی ہے۔ ایہہ کردار اپنی کرنی تے ہِک ڈوجھے دے ٹکرادے نال کہانی کوں ونڈیندن تے خیر تے شر دی ایں ونڈ اچ، اساں نیکی دی کہیں وڈیائی تئیں پجدے ہیں۔ ساڈے رڑھ واہی دے سماج وچ ایں طرحاں دی کہانی اپنی ریت نال بدھی ہوئی کہانی بنڑدی ہے۔ ایہہ آپ وی اگونہی نی ٹُردی تے لوکیں کوں وی کہیں وڈی تبدیلی دا سونہاں نہیں کریندی۔

عامر فہیم دی کہانی جینکوں سرائیکی وچ علامتی کہانی داناں ڈتا گئے، پر کیا ایں کہانی، ایں زبان اچ کہیں وڈی علامت کوں جگائے۔ اساں اپنے ورھیاں بدھے سماج توں اُٹھی تے کوئی وڈی جھاتی پاتی ہے۔ کہیں صنعت جُڑے سماج دے نال ساڈی کوئی سونہہ جُڑی ہے یا رڑھ واہی تے صنعت جڑے

سماج دے وچکار پھتے لوکیں دا کوئی بھوگ اساڈے سامنے آئے۔ ایں سانگے ساڈی حیاتی وچ کوئی نواں استعارہ کوئی نواں معنی پیدا تھئے۔ کوئی گالھ اساکوں نئی طرحاں سمجھ آئی ہے۔ ساڈے سوچن، ڈیکھن تے ورتاون دے کیں ڈھب وچ فرق پئے۔ میں ایہو جانڑداں جو ہر وڈا کہانی کار ساڈی حیاتی وچ ہک نویں رمز دا وادھا کریندے۔ اساں اگاں ٹردے ہیں یا گھٹ توں گھٹ پچھاں مڑ تے ضرور ڈیدھے ہیں۔ عامر فہیم دی کہانی جیندا ں اُنہاں دی کتاب ''جاگدی اکھ دا خواب'' چھپن دے پلے بہوں چرچا تھیا ساڈی حیاتی وچ نی ہنڈی۔

حفیظ خان توں پہلے احسن واگہ او کہانی کار ہے جیڑھا کہانی دی واہند دے نال نال ایندے بِنت بدلدے فریم دا وی جانوں ہے۔ واگہ دی کہانی ساڈے وسیب دی ''سائیکی'' وچوں نکھتی ہے۔ او ایں تل دیاں بہوں ساریاں پرتاں دا سونہاں ہے۔ آسوں پاسوں نت تھیندیاں ہویاں تبدیلیاں دی خبر رکھدے تے ایہہ وی جانڑدے جو ساڈے ایں ٹُرندے بھجدے سماج وچ انہاں تبدیلیاں دی کیا جاء بنڑدی ہے۔ سبھ توں وڈی گالھ ایہہ ہے او ول کھادیاں ہویاں گالہیں کول ول ڈے تے آکھن دی اٹکل جانڑدے تے اینویں ساڈی حیاتی دے بہوں سارے ڈِنگ وَل نکل ویندن۔

احمد اسماعیل احمدانی دی کہانی کوں ہک نئی طرحاں ڈیکھن دی لوڑ ہے۔ اُنہاں دی جدید تکنیک کہانی وچ وقت دیاں پرتاں پچھاں ہٹیندی تے اگاں ودھدی ہوئی ہک وڈی چھولی تے شعور دی رو نال ٹردی ہوئی قصے دی ہک وڈی راند، ساڈی حیاتی وچ بہوں کجھ شامل کریندی ہے۔

حفیظ خان ہک عجب کہانی کار ہے۔ اوندی خوبی ایہہ جانن ہے جو او کیڑھے تل وچ کنہاں لوکیں کیتے کہانی پیا آہدے۔ ایں سانگے او بہوں پچھونہاں یا بہوں اگونہاں نئیں تھیندا۔ او علامت کوں اینویں نئیں ورتیندا جو پروں نظرے کہانی کتھاہوں تھڈ تے اِتھاں لائی گئی ہے۔ خیر تے شر دی ہک پرانی راند رساون پاسے وی اوندی توجہ کوئے نی۔ اوندے کیتے حیاتی ہک وڈی پڑدی پُتلی ہے جیندے پچھوں بہوں سارے نظر نہ آون والے دھاگے کم پئے کریندن۔ ایہے اُو دھاگے ہِن جیڑھے حفیظ خان ڈیدھے، انہاں ہتھیں کوں وی ڈیدھے جیڑھے پچھوں انہاں دے ہلدے وِن۔ سرائیکی وسیب دی ہک ازلی مونجھ، ہک وڈا بھوگ تے وڈی تس جیڑھی ایں ول کھادے سماج وچ ہک جنسی دب دا باعث بنڑدی ہے، کوئی زور آور تے سیانے لوک جیڑھے بہوں سارے لوکیں کوں ''اپاپیپ''

کرڈیندن' اودھا گے تے اوہتھ ہن، جیڑھے حفیظ خان اپنی کہانی دے پچھوں رکھدے۔

حفیظ خان دی کہانی حیاتی کولوں پرہاں نئیں تھیندی۔ ایہہ کہانی گلی کوچیں وچوں گھریں وچ وڑدی ہے تے گھر دی اوں جاتئیں پجدی ہے جتھاں ڈھا لگدی ہے جتھاں سیم چڑھدے۔ وت اے کہانی بندے وچ ٹرپوندی ہے تے بندہ جتنا اَہر کر گھندے ایہہ نہیں چکدی، اونکوں بئے بندیاں پچھوں اپنے گھر دیاں کندھاں پچھوں میں آکھساں جو اپنے کپڑیاں پچھوں وی نئیں لُکن ڈیندی۔

ایں طرحاں دی اندر ٹردی ہوئی کہانی یورپ وچ وی لکھی گئی ہے تے ساڈے اتھاں اردو وچ وی پر حفیظ خان دی کہانی ایں پاروں انج ہے جو ایہہ اپنے تل تے اپنے کرداریں دی کہانی ہے۔ ''تیلی'' ہووے''، ''اپاپیپ'' ہووے ''یا گگی'' حفیظ خان انہاں کوں اپنے تل دی مٹی نال گندھے۔ او احمد پور شرقیہ دا رہون والا ہے تے اونکوں پتہ ہے تل دی مٹی نال کینویں نازک تھاں بنڑائے ویندن، پر ایں تل دی مٹی وچ ہک شے بئی وی گندھی ہوئی ہے تے او ہے اپنے عہد دا سہنپ، جیڑھا شے کوں آپڑیں تل وسیب توں باہر گھن آندے، اُچا چا گھندے تے وڈے حوالے نال توں وانجے ہن۔ او یا تاں کہانی کوں بہوں دور پریں دے استعارے یا علامت نال جوڑتے اوپرا کرڈیندن یا اصلوں اپنائیت دی مار ڈیندن۔ تھیندا ایہہ ہے جو اوّل تاں کہانی لکھن والے دے اپنے اندروں باہر نی ٹردی یا ٹروی پووے تاں شہر دی فصیل تئیں پندھ اوکھا کریندی ہے۔ شمیں دی سمجھ آون لگ پوندی ہے۔ حفیظ خان دے نال دے بہوں سارے کہانی کار ایں ہک سنہپ

حفیظ خان دا افسانہ ''ویندی رت دی شام'' گھروں ٹرتے، گلیاں وچوں لنگھ تے شہر دے وڈے بوہے توں لنگھدا کیہہ تئیں ونج پجدے، ایہہ ڈیکھن حفیظ خان دی کہانی کوں سمجھن والی گالھ بنسی۔ حفیظ خان دی کہانی ڈو طرحاں سمجھ آندی ہے، پہلے ہک قصہ، اپنی اکھ دے سامنڑیں پڑ تماشے وچ تھیندا ہویا تے وت ہک وڈی سکرین تے چلدی ہوئی کوئی کھیڈ۔ جیڑھی سرائیکی لوکیں تے انہاں دے تل کوں دنیا دے بئے لوکیں تے اُنہاں وسیب نال جوڑ ڈیندی ہے۔

O

(تحریر: 1989ء، لیاقت پور)

ویندی رت دی شام

رفعت عباس

سرائیکی ادب دا نواں موسم ہے، شاعری ہووے یا افسانہ ہک معاصر ڈکشن اپنا رنگ روپ پیا کڈھیندے۔ نواں لکھن والا ایہہ گالھ جان گے جو اوندا مخاطب ہُن کون ہے تے اوہ اے ساری کھیڈ کیندے پاروں پیار رچیندے۔ جینکوں اساں معاصر ڈکشن آکھسوں او ہن لکھن تے پڑھن والیاں دی ک سانجھ ہے، ہک راند ہے جیڑھی اورل مل پئے رسیندن۔

ساکوں ایہا کھیڈ، ایہو تماشا حفیظ خاں دے افسانیاں وچ نظر دے۔ اوہ اپہنے ایں کم کار وچ اپنی سنگت دے نال کھڑے۔ اینویں لگدے اوندے افسانے ساڈے وس وسیب اچوں آپے ڈُس پن۔ کہانیاں وچ آون وایل کردار اپنی گالھ آپ پئے اگاں ٹریندن تے اپنا مچ آپ پئے بکھیندن۔ حفیظ خان کہیں ڈکھ کوں سکھ تے کہیں شام کوں سویل کرنا دا اَہری نی کیتا۔ اوں تاں بس اپنی اَنگلیں دی چیتر بہار ورتی ہے باقی چاک تے مٹی ایں وسیب دی اپنی ہے۔

O

(27/مارچ 1990ء)

ویندی رُت دی شام

حسین شاد

''ویندی رُت دی شام'' حفیظ خان دیاں سرائیکی رنگ دیاں کہانیاں دا خوبصورت مجموعہ اے۔اے کتاب پاکستان سرائیکی رائٹرز گلڈ ملتان نے شائع کیتی اے تے ایں چہ حفیظ خان دیاں لکھیاں گیارہ کہانیاں شامل نیں۔نویں زمانے دی ٹٹ بھج تے ابھے ساہ لیندی حیاتی دی کُکھ چوں پھٹن والی سوچ جیویں اپنے آل دوالے کھلری لوکائی نوں تک سکدی اے'اوس دا بیان کس طرح کہانی بن دا اے'ایہی حفیظ خان دا ہنر اے۔گوہڑا مشاہدہ،حیاتی نال لکھاری دی سانجھ، لہجے دا حسن تے زبان دی مٹھاس نے ایہناں کہانیاں نوں دل وچ اترن والیاں کہانیاں بنا دتا اے۔

O

(روزنامہ جنگ لاہور،29 جنوری 1991ء)

حفیظ خان دے افسانے

رحیم طلب

سرائیکی دے اگر موہری افسانے نگاراں دا ذکر تھیسی تاں جتھاں غلام حسن حیدرانی ، تحسین سبائے والوی، مسرت کلانچوی تے ظفر لشاری دے ناں آسن تاں اُتھاں حفیظ خان دا ناں وی ضرور آسی۔ایں ناں کوں سرائیکی نثر نگاراں دی موہری قطار اچوں کوئی انج نی کر سگدا۔

حفیظ خان دے افسانیاں تے غور نال نظر پاؤں تاں انہاں دے پروکے افسانے وی اج دے افسانے لگدن تے اج دے افسانے انہاں دے مستقبل دے ویلے کوں وی لِھیٹی کھڑن۔ایندے نال نال انہاں دی نظر دور بین دے علاوہ خورد بینی وی ہے۔ایں ظاہری دنیا دے داخلی احساسات جتھ عام انسان کوں محسوس نی تھیندے انہاں کوں حفیظ خان مائیکروسکوپک صورت وچ آپنی حس دی صاف ستھری سلائیڈ تے ڈیہدن۔

ایں گالہہ توں کوئی انکار نہیں کر سگدا جو سچا ادب اپنے عہد دی عکاسی کریندے۔تے آپنے عہد کوں اگلے عہد تائیں گھن آون والے ادیب ای سچ دا پیر ثابت تھیندن۔سیّں حفیظ خان دے افسانے نیچرل فطرت یا پلاٹ توں مبرا کوئنی۔ہر افسانے دا تانا پیٹا عام جیہا ہے لیکن بالکل روایتی ای کائنی۔انہاں روائتاں توں بغاوت کر کے نویں انداز دے نویں افسانوی ڈکشن کوں ادب وچ

متعارف کرائے۔ لیکن ول وی افسانوی طرز انداز توں ئی ہے جیڑھا ادب دا خاصہ ہے۔ انہاں دا افسانہ ''حاصل جمع'' سرائیکی ادب وچ INNOVATION نال داخل تھیسے تے ایہ افسانہ انہاں دے بیاں افسانیاں توں ہک وکھری ٹائپ دا افسانہ ہے۔

حفیظ خان دے افسانیاں دے کردار سرائیکی وسیب دے کردار ہن تے وسیب وچ موجود ہن انہاں کوں ڈیکھ گئی ہے تاں حفیظ خان دی حساس اکھ ڈیکھ گئی ہے۔ انہاں دے کردار بالکل عام ہن لیکن ہن جدید ابلاغیات دے دور وچ جتھوں پتہ لگدے جو ایہہ کردار سدھے سادے ہوون دے نال نال ملک تے بیرون ملک دے حالات دی اونہہ سونہہ وی رکھیندن۔ مثلاً انہاں دا افسانہ ''تیجا'' دا کردار تیلی پہلوان ہے۔ اوندے تاثرات ملاحظہ فرماؤ۔

''بس ول کیا ہا، دنیا دے سارے رنگ ہک ہک کرتے مک گئے، پرائے نہ ٹلے تھی سکیا جو لیڈی ڈیانا دے انڈرویئر دا رنگ کیڑا ہے۔ بابے او! کیوں شور پیندے ہو۔ لیڈی ڈیاناں تاں انڈرویئر پیندی ای کائنی۔''

حفیظ خان دے افسانے دے انہاں کرداراں بارے جتھاں انہاں دے سدھے سادے ہوون دی نشاندہی تھیندی ہے۔ اتاں ابلاغی اثر دے نال نال طنز و مزاح تے اجوکی عینگرانہ تُھرک وی شرموشری جھات کریندی ہے۔

ول ایہو کردار مزید اگوں تے ٹُلیندے تے ہک اگوانی فلسفیانہ طرز دی صورت اچ سامنے آندے۔ تے گالھ سدھے لہجے وچ دانشمندانہ تھی ویندی ہے۔ مثلاً

''ہولے بولو بزرگو! ایہہ سارے مندے گالھیں تے لعنتاں آپنے کول رکھو، جے فرانس والیاں نے سن گھدیاں تاں ساکوں ایٹمی پلانٹ نہ ملیا تے جے ایٹمی پلانٹ نہ ملیا تاں اساں ایٹم بم کیویں بنیسوں، تے بھارت دا مقابلہ کیوں کریسوں؟''

انجھی کردار نگاری توں پتہ چلدے جو ایہہ کردار قلمی گھڑت دی پیداوار نہیں، ڈونگھے مشاہدے تے حیاتی دے کیمرہ دی اکھ نال کورے کاغذ تے اتارے گن۔ جتھاں انہاں کرداراں دی دانش سامنے

آئی ہے۔اتھاں طنز دا تیروی اجا چیت چھنک تے دھد ڑچھیئ ذہن دی چادر تے بٹک تھیند ے۔

ایں طرح حفیظ خان وسیب دے واسیاں دے خارجی معاملات اتے حرکات تے نظر رکھن دے نال نال داخلی اوکھیاں لیہیاں چاڑھیاں تے وی نظر رکھدن۔آؤ ذرا اُتلے ذکر کردہ افسانے دی سیکس سائیکلوجی دے حوالے نال ڈیکھوتاں اے مشاہدہ آپنے آپ کہیں حساس قلمکار دی قلمکاری دی چغلی کریندے۔

''تابعدار تے فرمانبردار رشیدہ ہُن سارا ڈینہہ کھڑوے تے پئی راہندی تے آلساں بھنیدی رہندی۔ہک ڈینہہ یکدم لوکاں دے منہ ول کھل گئے۔رشیدہ کہیں لمبے تڑنگے گھبرو نال ولدی ول آئی۔لکھے اچ اوڈوں کنوں اڈے خبر کھنڈ گئی

''جواو پہلے اوندا یار تے ہن پئے ہس۔''

ایں افسانے وچ حفیظ خان عدم از دواجی ہم آہنگی دے اسباب علل ہک ہک کر کے قاری تے واضح کیتن۔لیکن باریک مہین پردے در پردے دے اولے۔چھیکو اچ پتہ لگدے جو قابل صرف ناں دا ای قابل ہے لیکن او کہیں قابل نہ ہا۔تہوں رشیدہ کہیں نال ٹرگئی ہئی۔

حفیظ خان جیڑھے ویلے وسیب دے بنے دگ تے سڑکاں گلیاں وچ ٹردے تاں جھکی جھون سٹ تے نی ٹردا۔بلکہ دل دی حساس اکھ دا فوکس آہروں باہروں دے کرداراں تے اجتماعی وی تے انفرادی وی ہر سطح تے فٹ رکھیند ے ہوئیں آرام نال نالوں لنگھ ویندے۔انہاں دا مشاہدہ گہرا ہے لیکن روایتی گہرا نہیں۔انہاں دے کرداراں بارے مشاہداتی سطراں پورے افسانے وچ چس رس دا سامان نبیڑدن۔ملاحظہ ہووے۔

''رب سائیں آں!

ساریاں سوہنیاں عورتاں شہر وچ کٹھیاں کر چھوڑے نی

انہاں وچوں ہک ادھ ساڈے کول ای بھیج ڈیویں ہا''(تن من سیس سریر)

''مراد کوں اوبینگر یں اسمان توں لتھیاں پریاں جاپدیاں ہن جیڑھیاں تپیاں تپیاں لال انگارہ تھی اپنے اپنے سنہپ دی بھاہ وچ سڑدیاں نظر آندیاں ہن۔انہاں دا بھرواں بھرواں وٹیندا جوبن ڈیکھ کراہیں مراد داتر ساہو یا دل دھڑکن دی حد ٹپ

ویندا۔"   (تن من سیس سریر)

"اتنی لمبی تانگھ نے مرادکوں اُجاڑ پجاڑ ڈتا۔سر دے وال چٹے تھی گئے۔اوندی چٹی چمڑی بھوری تھی کراہیں کئی جاتوں جھرڑیاں بن تے لٹک گئی۔نینگر جوان ہن بھوگڑی بیر بن گیا ہا۔آکڑے تاکڑے بت دی جا کہی چیل تے ڈنگیاں ہڈیاں نے گھن گھدی۔۔۔شے تے بڈھیپے داراج ہا۔"(تن من سیس سریر)

"جھوہر جیس ویلے باریک بوچھن دا گھنڈ کڈھ کراہیں مراد دے پیریں کوں ہتھ لاون واسطے آئی تاں مراد بۃ اتھی گیا۔ایہہ تاں بالکل اوندے خواباں دے وانگ ہئی۔روہی دی چانئی رات دی چانئی اچ دھاتی ہوئی شہزادی،اوہا غلابی رنگت اوہو نک نقشہ تے بالکل اونویں پاوّلی دے تانے وانگوں چھکیا چھکیا بت،جیویں اوندیاں سوچاں بہہ لیک لکیندیاں ہن۔"(تن من سیس سریر)

انہاں پیراگرافاں توں لکھاری دے نوک وار قلم دا اندازہ تھیندے تے اُوں نے آپݨے کرداراں کوں قاری دے ذہن تے ان مٹ اکیرن سانگے کتنی صفائی تے ذہنی یکسوئی تے ڈونگھے مشاہدے نال کرداری بتاں کوں تراشے تے پورا نقشہ بلیندی تصویر بن کے تشبیہاتی سنہپ دی چولا پاتے قاری دے سامنے آویندے۔

حفیظ خان دے افسانیاں دے کجھ ہے مشاہداتی پکے پینٹڈ منظر ملاحظہ فرماوٗ:

"دے تیڈا اشوکدے دے پیر کیوں نہ آیا وے۔میں تاں تیڈی اطلاع سنڑاں ہا۔تیڈا مویا منہ ڈیکھاں ہا۔ہن کیویں ڈیکھاں پہاج دے منہ کوں۔"

(جنت حور قصور)

"کیڑھا گن ہے تیڈے پتر وچ،لولھا لنگرا بدصورت،ساڈی دھی دی چیل تونیں دی نی پُجدا،کھٹن کماون تومحتاج،میلا چکڑ۔اساں کیویں ڈیہدیں ہوئیں وی آپنی دھی کوں دوزخ اچ سٹ ڈیووں،مویا اپاہیپ اپنے لیلوں تاں پونجھ نی سکدا

،ساڈھی دھی کوں کتھوں کھویسی پویسی۔'' (ویندی رت دی شام)

ایں منظر نگاری وچ اے آکھ سگدوں جو منظر نگاری دی نہ صرف اکھ حساس ہے، بلکہ کینوس وی رنگ برنگے نفسیاتی تے وسیبی آہنگ نال سنگھریا ہوئے ۔جیہڑھا قاری کوں ،ناظر کوں اپنے ڈو چھکیندے۔

حفیظ خان دے افسانیاں وچ کیفیت نگاری کوں بہوں اہمیت حاصل ہے۔ایں کیفیت کو اہل دل تے اہل بصیرت قاری حضرات اپنے دل دی آواز سمجھدن، آپنے ذہن دی پڑ ڈوآکھن تے مجبور تھی ویندن۔ایں کیفیات کوں محسوس کرنا تاں محسوس کرن، قلمبند کرنا وی اوکھا ہے۔ایہہ ملکہ وی حفیظ خان دے حصے آئے۔مثلاً

''بھرواں جسم اوندیاں پھٹیاں ہویاں رگاں وچ خون دی ٹور کوں چھانٹے مریندا پیا ہا تے ول مردار دی زبان وی گئی۔'' (تن من سیس سریر)

''اوکھٹ توں اٹھی بیٹھا ،اکھیں دے چنے اندھارے وچ بیاوی رتار تا سیک کھنڈاون لگ گئے۔ہن تے اوندا بت ٹھرتے برف آلی کار تھڑکدا پیا ہا جیویں تیز اندھاری وچ سوی کھاداون لوڈے کھاندے۔منزل کوں نیڑے ڈیکھ تے مرادا دا دل ٹھاکے کرن لگ پیا'' (تن من سیس سریر)

''میکوں تاں شام بھاندی ہے ۔سانولی سلونی،دل کریندے جو آلھنیاں ڈوولدے پکھیاں دی جھار اچ رل مل ونجاں۔'' (حاصل جمع)

میکوں اپنا وجود تیزی نال بکھردا ہویا محسوس تھیا جیویں پکھے دی ہوا تلے برف بکھردی ہے۔برف بکھر دی گئی اتے دل کافی دیر بعد میکوں احساس تھیا جو میں سارا بکھر گیاں تے صرف پوچھڑا آ بچے۔'' (مائی بڈھی دا گھوڑا)

غرض حفیظ خان دے افسانیاں وچ روایات توں ہلکی پھلکی بغاوت، آزادی خیال، وسیبی اُچ نقشے، کرداراں دے داخلی تے خارجی احساسات دی سچی عکاسی اہل دل دیاں پکیاں

گالھیں، پکاوت نال سامنے آندن۔ میکسم گورکی دے قول دے مطابق ایہہ وی آکھ سکدوں جو حفیظ خان دے افسانیاں وچ رومانیت دی فضا فعال تے متحرک ہے جیڑھی انسان دے زندہ ہوون دی خواہش کوں تقویت ڈیندی اے۔ ایں حال احوال دے نال نال موصوف کوں جذبات دی مصوری، وسیبی احساسات تے، انسان دی نقاب کشائی دا ڈھنگ وی آندے۔ انہاں دے افسانیاں اچ کڈاہیں صداقت افسانے توں زیادہ حیران کن لگدی ہے تے کتھاہیں افسانہ صداقت توں زیادہ دلچسپ، انہاں دا مقصد کہانی دے تابع ہے تے قلم مشاہدے دے تابع۔

مُدا حفیظ خان' موہری افسانہ نگاراں دے نال نال اجو کے افسانہ نگاراں دے موڈھے نال موڈھا رلائی کھڑے تے رلائی رکھسی۔''

O

(ماہنامہ سرائیکی ادب ملتان، جنوری 1991ء)

اندر لیکھ دا سیک

محمد اسلم رسول پوری

اندر لیکھ دا سیک ،دیاں کہانیاں انسان دے اندر کوں نشابر کریندن بلکہ اے انسان دے اندر کو چیر پاڑ تے رکھ ڈیندن ۔انسان جیڑھے چہرے سجائی ودے او سارے ڈکھاوے ہن اتے اندر کجھ بیا اے ۔حفیظ خان اندر دا او سبھ کجھ کہانیں داناں ڈے تے اساڈے اگوں رکھ ڈیندے ۔

حفیظ خان دے افسانے انسانی کردار دے انہیں پرتیں دا اظہار کریندین جنھیں تے ظاہری طور تے ساڈی نظر نی پوندی یا وت اساں انہیں کنوں اکھیں نوٹی رکھدوں ۔اے ساریاں پرتاں یا تاں نسل انسانی دیاں جبلی کمزوریاں تھی سگدین یا وت انفرادی نفسیاتی الجھناں ۔میڈا خیال اے ،اندر لیکھ دا سیک دیاں کہانیاں اساڈیں انہیں کمزوریں بلکہ بعض اوقات اساڈیں منافقتیں کنوں جنم گھندین ۔

ایہہ بہادری نال لکھیاں ہوئیاں اینجھیاں کہانیاں ہن جینکوں میں انسان دے داخل وچ بھری ہوئی گندگی دا معالجانہ آپریشن آکھ سگداں ۔ایہہ کہانیاں اساڈے معاشرے دی بدصورتی کوں اساڈے اگوں پیش کرتے انہیں دے خاتمے واسطے سوچن تے مجبور وی کریندن ۔

حفیظ خان دے موضوعات رلے ملیے ہن ،او صرف انسان دے منفی جذبیں کوں نشابر نہیں کریندا بلکہ او مجموعی حیاتی دی عکاسی کریندے جیندے وچ چنگائی تے خرابی موجود اے ۔

نفیس احمد ہک اینجھا کردار اے جیڑھا ساری زندگی محبت دی یاد وچ لنگھا ڈیندے ۔ او دنیاداری کنو
بے نیاز، وفا دا ہک اینجھا پتلا اے جیڑھا نا کردہ گناہیں دی سزا بھگتیندے ۔ اے کہانی اپنے کئی حوالیں نال
ہک وڈی کہانی اے ۔ ایہہ کہانی ہندوستان دی تقسیم کنوں پیدا تھیون والیں ہزاراں المیں وچوں ہک ایجھے
المیے دا حال ڈیندی اے جیڑھا نہ صرف جوانی دیں محبتیں کوں برباد کر ڈیندے بلکہ خاندانیں نال انسانی
قدریں کوں وی اجاڑ ڈیندے ۔ ایہہ کہانی جتھاں سادہ لوح محبت دے مارے دی کہانی اے اتھاں مذہب
دے ناں تے مفاد پرستی، خباثت اتے ملاں تے اوندے شاگردیں دی سینہ زوری دی وی ہک کہانی اے ۔
ایندے نال ایہہ کہانی کوڑی مقدمہ بازی اتے پرائی جائداد تے ناجائز قبضے دی کہانی اے ۔ ایہہ کہانی ہر
حوالے نال ہک سچی کہانی اے جو اینجھے کردارا تے المیے روزانہ ساڈے سامنڑیں لنگھدن ۔

حفیظ خان دے موضوعات وچ انسانی مجبوریاں، کوڑے روپ، انتقام، جنس اتے ظلم دے
انجام دے علاوہ بے شمار بے موضوعات وی شامل ہوندن ۔ او ہک کہانی وچ انسانی زندگی دیاں نہ سمجھ
آون والیاں کئی پرتاں کھولیندن ۔ نزہت ہک اینجھی نہ سمجھ آون والی خاتون اے، جیڑھی ہک محبت
کرن والے انسان دی محبت کوں صرف اپنی ہم جنس دے ساڑ کنوں رد کر ڈیندی اے بلکہ اپنی عصمت
وی کوڈی دے مل وچیندی اے، اتے اوایندا جیڑھا جواز ڈیندی ای اووی نہ سمجھ آون والا اے ۔ اتھاں
انسانی مزاج دا ہک اینجھا پہلو سامنڑیں اندے جیندے بارے ایہہ کہانی اوں ویلھے بہوں ڈراکلی بن
ویندی اے جیڑھلے کہیں ماتحت خاتون ملازم دی نوکری وی ایں مجبوری کوں نشابر کریندی اے جو ہک
تنخواہ واسطے اونکوں اپنے باس دے اگوں عزت دا سودا وی کرنا پوندے ۔ اتے ایں سودے دے نتیجے
وچ اوندا حیاتی بھر دا سارا غرور اتے انا مٹی وچ رل ویندی اے تے اوندے نزدیک عصمت دا کوئی مل
نہیں رہندا اتے اوا اونکوں ہر رات ویچن شروع کر ڈیندی اے ۔

تساں اگر مکافات عمل تے یقین رکھدو تاں اندر لیکھ دا سیک، ناں دی کہانی تساڈے ایں یقین
کو پکا کر ڈیسی ۔ اے شاید مصنف دا کوئی انفرادی یا اتفاقی مشاہدہ ہووے مگر عام طور تے اینویں نہیں
تھیندا یا شاید ایہہ کوئی انسانی خواہش ہووے ورنہ عام طور تے صدیاں کنیں اتھاں جاگیردارانہ نظام
لوکیں دی رت پیتی ویندے مگر لوکیں وچ بغاوت دے کوئی آثار وی کینی ۔

البتہ چوری چھپے کنوں انتقام دی ہک کہانی ،منشا تے میاں منشا ، وچ ملدی اے ، بلاشبہ اے کہانی جاگیردارانہ خباثت دے ہک بئے پہلو کوں نشابر کریندی اے ،مگر ایندے وچ سَندھاوندے اپڑیں گھر وچوں لگدی اے ۔اینویں وی گھروں ہک بئی سَندھ بیوروکریسی دے ہک نمائندے کوں ،ناز و نکھیلا ، وچ لگدی اے ۔میں اتھاں شاید مصنف نال اختلاف کرن دی پوزیشن وچ کینمیں ، کیونجو مسلسل مکافات عمل دیاں ایہہ کہانیاں واقعی انہیں دے کئی مشاہدیں دے نتیجے وچ سامنے آیاں ہوسن لیکن میڈا اے خیال ضرور اے جو اے محض اتفاق ہوندن اتے کڈاہیں کڈاہیں اے عمل سرزد تھیندن ۔البتہ مصنف دا ایہہ کمال ضرور اے جو اوں انہیں Rare واقعات کنیں اینجھیاں کہانیاں تخلیق کیتن جیڑھیاں اساکوں خراب کمیں دے انجام کنوں خبردار کریندن ۔

اساں فرائیڈ دے موقف کوں منوں یا نہ منوں ،جنس انسان دے نال اتے حفیظ خان دے افسانیں دا اے وی ہک موضوع اے ۔مگر اے روایتی انداز کنوں ہٹ تے ہے ،گھمن گھیر دا گھیر ، ہک اینجھی کہانی اے جیڑھی انسانی جنس دے پیچیدہ پہلوئیں نال بحث کریندی اے ۔جنس دا بکھ اتے خوشحالی نال کیا تعلق بنڑدے ۔اے سوال نسل انسانی دے ہر دور وچ سر کھادی رہ گیے لیکن حفیظ خان جتلا آسانی نال اینکوں ہک کہانی وچ بیان کیتے شاید کوئی سکالر وی بیان نہ کر سگے ۔بکھ تے بالیں دے عذاب کنوں جنس دا کیا حال تھیندے اتے رج ویلھے او کیا کیا روپ وٹیندی اے ،ایندا جواب ایں کہانی وچ میکوں لبھیے ۔

جنس دا ہک بیا روپ تو ڑیں جو نز ہت دے کردار وچ ملدے جیندا پہلے ذکر آ گئے لیکن ایندا بیا روپ اساکوں ،جھات دے اندر گھات وچ ملدے ۔ہک شخص جیڑھا کہیں بالڑی کوں آپڑیں دھی وانگوں پلیندے بڈھیپے وچ جنس دے اگوں کیویں بے بس تھی ویندے ،اتے زرینہ دی جنسی ناواقفیت شادی ویلھے کیا کیا رنگ گھن آندی اے ،ایہہ کہانی جنس دے ایں پہلو کو نشابر کریندی اے ۔

سماجی مسائل کنوں ہٹ تے حفیظ خان دے کئی افسانے انسانی حیاتی دے بعض بنیادی فلسفیانہ سوالیں دا جواب وی ڈیندن ،مثال دے طور تے انسانی آزادی دا سوال اتے زندگی دی معنویت وغیرہ ۔

کلہا جاگدا ہویا آدمی ،انسانی آزادی دے سوال نال بحث کریندے ،فطری مجبوریں کنوں ہٹ تے کیا سوسائٹی انسان کوں آزادی نال کم کرن ڈیندی اے یا نہ ،اے کہانی پڑھ تے میکوں اینویں لگے

جواے سماج انسان کوآزادی نال کوئی کم نہیں کرن ڈیندا۔ انسان تاں ایندے اگوں محض مجبورا ے۔

ڈکھادم سہائی دا، ہک بیاانجھا افسانہ اے جیڑھا انسانی زندگی دی معنویت دا سوال چیندے۔ انسانی حیاتی دا کیا مقصد اے؟ کیا اے بے معنی اتے انسان اینویں عذاب کھا کھا تے مروینی یا ایندا کوئی مقصد وی ہے۔

کہیں کہیں ویلھے میڈے سامنڑیں ایہہ سوال کھڑا اتھی ویندا اے جو کہانی مصنف خود لکھدے یا کہانی اوں کنوں خود کوں لکھویندی اے۔ ایں کہانی کوں پڑھدیں ہوئیں میکوں اینویں لگیے جو کہانی خود کوں لکھوائے۔

میکوں پتہ کیے نی جوزندگی بارے مصنف دا کیا نکتہ نظر اے لیکن اے کہانی پڑھ تے تاں محسوس تھیندے جو زندگی بے معنی اے۔ اگر مصنف زندگی کوں بامعنی سمجھدے تاں ول اوں اپڑیں تخلیق وچ جیڑھی غیر جانبداری ورتی اے، اوانکوں بالزاک دے مرتبے دا تخلیق کار بنڑا ڈیندی اے، جیڑھا اپنڑی تخلیقات اتے نظریات وچ کمال دی غیر جانبداری ورتیندا ہا۔

بلاشبہ حفیظ خان اردو تے سرائیکی دا ہک وڈا افسانہ نگار اے اتے اوایں فن دے تقاضیں کنوں وی پوری طرح واقف اے۔ او ہر جاتے اپڑیں گالھ کوں کہانی دے انداز نال ٹریندے لیکن، منشاء اتے میاں منشاوچ، ہک جاتے میکوں اینویں لگئے جو او کہانی وچ داخل تھی گئے اتے زندگی دا فلسفہ بیان کرن پئے گئے۔

حفیظ خان کہانی بیان کریندے ہوئیں زبان دا انداز سادہ تے بیانیہ رکھدے، اوندے علاقے بہاولپور دے لکھاری جیڑھی سنگری پنگری زبان استعمال کریندن اوا وں فریب وچ گرفتار نہیں تھیندا ، یا دت وادی سندھ دی پرانی زبان دے ورتن دے شوق وچ اپڑیں قاری کوں کہیں نویں عذاب وچ مبتلا نہیں کریندا۔

میں سمجھدا اندر لیکھ دا سیک دا مطالعہ میڈے واسطے ہک بہترین مطالعہ ہا۔

O

(تحریر 22 جون 2004ء، مطبوعہ روزنامہ 'خبریں' ملتان، 6 مئی 2005)

سرائیکی نثری ادب دے وَدھاوِچ حفیظ خان دا کردار

پروفیسر ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز

پروفیسر شمیم عارف قریشی لکھدن:

''حفیظ خان سرائیکی ڈرامے اور کہانی کے مُتقد مین میں سے ہیں'' مزید لکھدن: ''حفیظ خان کی کہانی سرائیکی زبان کے جدید عہد کی اوّلین کہانیوں میں سے ہے۔'' (ح۔۱)

آؤ پہلے ایندا جائزہ گھنوں:

حفیظ خان خود لکھدن:

'' سترہ (17) برس کی عُمر میں (1973ء) جب پہلی با قاعدہ کہانی ایک قومی سطح کے جریدے میں طبع ہوئی...... (ح۔2)

ریڈیو پاکستان بہاولپور دی نشریات دا آغاز یکم جولائی 1975ء (صحیح تاریخ یکم اگست) دا ذکر کریندیں لکھدن:

''ریڈیو سے میرا تعارف صدا کار سے پہلے کہیں قوی تر سرائیکی افسانہ نگار کی حیثیت سے موجود تھا۔'' (ح۔3)

ایندی وضاحت اوا ایں طرحاں کریندن:

''1975ء ہی میں نصراللہ خان ناصر کے ادبی پروگرام ''بُھوار'' (جیکوں مُحمد سیہ قاسم نے ''سرائکی افسانے دافنی ویورا'' وچ صفحہ 145 تے ''روہی دے راستے'' لکھے) میں میرا سرائیکی افسانہ ''ہیرے تے ککرے'' نشر ہُوا۔'' (ح۔3الف)

ہک بئی وضاحت جو حفیظ خان دی کتاب ''حفیظ خان کی کہانیاں'' وچ افسانہ ''داؤ اور گھاؤ'' (جیندا عنوان اُنہاندے ڈُوجھے سرائیکی افسانوی مجموعے ''اَندر لیکھ داسیک'' مطبوعہ 2004ء وچ ''جھات دے اندر گھات'' اے) دے چھیکڑ تے لکھت داسال ''1974ء'' چھاپیا گئے۔ (ح۔4)

نتیجہ ایہہ جو حفیظ خان 1973ء کنوں پہلے یا اوندے نیڑے تیڑے اُردو کہانیاں لکھن شروع کر ڈتیاں ہَن۔ جٹیں ویلے کہ پہلا سرائیکی افسانہ اُناں نے جڈاں وی لکھیا ہووے، پر ریڈیو پاکستان بہاولپور توں پڑھ تے پہلی واری 1975ء وِچ سُنایا۔ اَتے 1974ء دے لکھے ہک بئے افسانے ''جھات دے اندر گھات'' (جیہڑھا پہلے اُردو وِچ لکھیا گیا یا سرائیکی وِچ) کُوں آپنے ڈُوجھے سرائیکی افسانوی مجموعے ''اندر لیکھ داسیک'' وِچ شامل کیتا۔ *

ایہہ تاں ہئی سرائیکی افسانہ نگاری وچ حفیظ خان دے مونڈی پندھ دی گالھ، ہُن سرائیکی ڈرامہ نگاری دے حوالے نال ڈیکھوں تاں اُنہاندی آپنی لکھت مُوجب:

> ''اِس انتخاب میں شامل ڈرامے بھی کسی قاری کے نزدیک بامعنی اور کسی کے تیئں بے معنی ہوں گے مگر اِن سے جُڑی ہوئی ایک بات ہمیشہ اِن کو اہم ترین کا درجہ دلواتی رہے گی کہ یہ اُس دَور میں لکھے گئے اور نشر ہوئے کہ جب الیکٹرانک میڈیا پر سرائیکی ڈرامہ اَبھی پاؤں پاؤں چلنا بھی سیکھ نہ پایا تھا۔ اُس دور کے کچھ طویل دورانئے کے ریڈیو ڈرامے میرے سرائیکی کے اوّلین انتخاب ''کچ دیاں ماڑیاں'' (مطبوعہ 1989ء) میں شامل ہوئے اور یوں سرائیکی ادب میں طبع زاد ڈراموں کی پہلی کتاب منظرِ عام پر آئی۔'' (ح۔5)

ایں لکھت وچ اگوں چَل تے لکھدن:

---

* افسانہ 'جھات دے اندر گھات' دا اُردو ترجمہ پہلے 'بندیا' کے عنوان سے ماہنامہ 'سورج' ڈائجسٹ کراچی' کے شمارہ مئی 1974ء میں شائع ہوا تھا۔ (مرتب)

''بطور ڈرامہ نگار میں نے سب سے پہلا ڈرامہ ''سنہری گلاب'' (۱۹۷۵ء) اکرم شاد کے لیے لکھا جو کہ بچوں کے سرائیکی پروگرام میں نشر ہوا..... ''ٹنگل پیسہ'' اور ''رُلتڑے پندھ'' 1977ء میں نذیر بلوچ مرحوم نے ریڈیو ملتان سے خواتین کے پروگرام'' عورتاں دی محفل'' میں پیش کیے۔''ایویں وی تھیندا ہوندے'' بھی ''عورتاں دی محفل میں 1977ء میں نشر ہوا''۔(ح۔6)

یعنی حفیظ خان 1977ءتوں پہلے سرائیکی ڈرامے لکھن دا مُنڈھ وی بدھ چُکے ہَن۔ جے تونی طبع زاد سرائیکی ڈرامیاں دی پہلی کتاب دا دعویٰ اے، ایندا حوالہ پروفیسر دلشاد کلانچوی مرحوم دے سرائیکی ادبی خبرنامے وِچوں گھندے ہیں:

''سرائیکی دے نامور ادیب، شاعر، تے ریڈیو دے سابقہ پروڈیوسر حفیظ خان دے ڈراماں دا مجموعہ ''کچ دیاں ماڑیاں'' سرائیکی اکیڈمی ملتان دے زیر اہتمام چھپ چکے''۔(ح۔7)

یاد راہوے اِیں خبر دے تلّے ای ''مسرت دے ڈرامے'' دے عنوان نال اے خوشخبری وی ڈتی گئی اے جو:

''سرائیکی دی نامور افسانہ نگار مسرت کلانچوی دے ڈراماں دا مجموعہ عنقریب سرائیکی ادبی مجلس دے زیر اہتمام چھپن آلا اے۔ ڈرامے دے میدان وِچ ایہہ ڈُوجھی کتاب ہوسی''

حفیظ خان دے سرائیکی افسانے تے سرائیکی ڈرامے وچ لکھن دے سالاں تے کتابی اوّلیت دے طے تھیون توں بعد اَتے اُنہاں دے مطبوعہ کتاباں دی توضیحی کتابیات اَتے فکر و فن تے گالھ ٹورن توں پہلے اُنہاندی سوانح دا ہک مُختصر خاکہ ڈیدے چلوں:

''خان منزل، محلّہ باکھری احمد پُور شرقیہ ضلع بہاولپور دے واسی حفیظ اُللہ خان، سئیں امان اُللہ خان (بہشتی) دے گھر ڈیرہ نواب صاحب (ریاست بہاولپور) وِچ ترائے اکتوبر 1956ءکوں جائے۔ 71-1970ء وِچ انٹر کالج بہاولپور دے سال اوّل دے طالب علم ہَن جو بیت بازی دا مقابلہ جِتّین تے اُردو دے پروفیسر سُہیل اختر دی طرفوں انعام وِچ

مِلے ہِک رسالے (سب رنگ ڈائجسٹ) دیاں کہانیاں تے اُوں توں پہلے والد صاحب دی ذاتی لائبریری وچ پیاں افسانوی ادب دیاں کتاباں نے کہانی ڈو راغب کیتا۔1975ء وچ بہاولپور وچ ریڈیو اسٹیشن نے کم شروع کیتا تاں آپ ایس ای کالج بہاولپور وچ بی ایس سی کریندے پئے ہَن ۔لہٰذا ریڈیو بہاولپور توں پہلے بطور اناؤنسر، صداکار تے ڈرامہ نگار جون 1975ء توں اکتوبر 1976ء تے وت جولائی 1979ء توں فروری 1980ء توڑیں وابستہ رہے ۔بطور صداکار پہلا ڈرامائی فیچر اکرم شاد دی زیر ہدایت اگست 1975ء وچ کیتا۔ایں براہ راست نشر تھیون آلے فیچر کوں بیگم شان گیلانی لکھیا۔حفیظ خان دے نال بئے صداکار بتول رحمانی تے شعیب احمد ہَن ۔ایل ایل بی تے ایم اے مُلتان یونیورسٹی توں کیتا تے اِیں دوران اکتوبر 1976ء توں جون 1979ء تائیں ریڈیو مُلتان توں بطور اناؤنسر، کمپیئر، فیچر نگار تے ڈراما نگار بھرویں سُنجان بنائی۔ اے او دور ہا جیندے وچ حفیظ خان نے طویل دورانیے دے ڈرامے لکھن آلیاں وچوں وی شہرت حاصل کیتی۔مقابلے دے امتحان وِچ ریڈیو پروڈیوسر مُنتخب تھی تے فروری 1981ء وِچ اسٹاف ٹریننگ اسکول اسلام آباد پہنچے تاں پہلے اسلام آباد تے وَل جون 1981ء وچ ریڈیو پاکستان مُلتان تے پروڈیوسر دی حیثیت نال ملازمت دا مُنڈھ بدھیا۔ایں دور یعنی مئی 1982ء وچ ڈیرہ غازی خان کُوں ڈویژن دا درجہ مِلّن دے سلسلے وچ جنرل ضیاء الحق دے دورے دی لائیو کوریج بطور اوبی انچارج کیتی۔بطور ریڈیو پروڈیوسر سرائیکی وسیب بارے دستاویزی پروگرام بنائے جیڑھے عالمی سطح تے سنجان دا باعث بنے۔میوزک پروڈیوسر دے طور تے روائتی موسیقی وچ نویں تجربے کیتے جیڑھے بہوں مقبول تھئے۔ایں طرحاں درجناں سرائیکی فیچر اُتے ڈرامے لکھ اُتے پروڈیوس کرتے سرائیکی ادب کوں ڈھیر سارا قیمتی سرمایہ دان کیتا تے ایں توں علاوہ سرائیکی ڈسک جوکی پروگرام ''کرن سویر'' ''جمہور دی آواز'' ''عورتاں دی محفل'' اتے بالاں دے پروگرام ''پھلواری'' کوں وی مقبولیت دی عروج تئیں پُجایا۔ ایں توں پہلے 1980ء وچ حفیظ خان نے کُجھ عرصے توڑیں احمد پور تے بہاولپور وچ وکالت وی کیتی ۔ 17 جولائی 1982ء توں نومبر 83ء تئیں رحیم یار خان وچ سول جج دے عہدے تے وی کم کیتا۔

جنوری 1984ء وچ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور وچ شعبہ قانون دے لیکچرار وی رہے۔
1984ء وچ پی سی ایس کرن توں بعد پنجاب سول سروس وچ بطور ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن افسر شمولیت کیتی۔ CSS کیتا تے بارھویں کامن کورس وچ پہلے پوسٹل تے ول آڈٹ اکاؤنٹس گروپ وچ مُلازمت دی پیشکش وی تھئی پر جائن نہ کیتا تے ول 1985ء وچ دوبارہ پی سی ایس جوڈیشل کرن توں بعد واپس بطور سول جج عدلیہ وچ شمولیت اختیار کیتی۔ایں دوران فیڈرل جوڈیشل اکیڈمی اسلام آباد وچ ڈائریکٹر ریسرچ تے پنجاب گورنمنٹ وچ ایڈیشنل سیکریٹری لاء دے طور تے تعینات رہے۔حفیظ خان اَج کل بطور سینئر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج لیاقت پور ضلع رحیم یار خاں وچ فرائض منصبی ادا کریندے پیئن۔'' (ح۔8)

ہُن سرائیکی افسانے تے سرائیکی ڈرامے دے حوالے نال چَھپ تے آوَن آلیاں اُنہاندیاں کتاباں دا توضیحی اشاریہ تے کتابیات کُجھ ایں ہے۔

الف ۔افسانے

1۔وینداں رُت دی شام

ایہہ پہلا سرائیکی افسانوی انتخاب پاکستان سرائیکی رائیٹرز گلڈ ملتان دی طرفوں فروری 1990ء وِچ چَھپ تے آیا۔ 104 صفحیاں دی ایں کتاب وچ نووَں (9) افسانے (1) قابل (2) تَن مَن سِیس سرِ یر (3) حاصل جمع (4) مائی بُڈھری دا گھوڑا (5) ھاتی پُھتکی (6) بوتے (7) جنت حور قصور (8) وینداں اُت دی شام تے (9) گگی شامل ہن۔آراء ڈیون آلیاں وچ عامر فہیم، ظفر لشاری تے رفعت عباس شامل ہَن۔پس ورق ڈاکٹر مہر عبدالحق تے اقبال بانو لکھے۔ایں کتاب تے ''اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد'' صدارتی ایوارڈ وی ڈِتا۔

2۔اَندر لیکھ دا سیک

ایہہ ڈوجھا سرائیکی افسانوی انتخاب اے جیکوں اَلحمد پبلی کیشنز لاہور نے مارچ 2004ء وِچ چھاپے۔ 142 صفحیاں دی ایں کتاب وِچ حفیظ خان نے تقریباً 14 صفحیاں دا تعارفی مضمون ''میری کہانیاں'' دے عنوان نال اُردو وِچ خود لکھے۔نووَں افسانیاں وِچ (1) گھُمر گھیر دا

گھیر (2) جھات دے اندر گھات (3) مُکدی نہیں نبھدی نہیں (4) اندر لیکھ دا سیک (5) کلہا
جاگدا ہویا آدمی (6) منگل دے ڈینہہ ناغہ ہوسی (7) نازو بگھیلا (8) ڈُکھا دم سَمھائی دا (9) مَنشا تے
میاں مَنشا'' شامل ہِن۔

3۔حفیظ خان کی کہانیاں

اُونویں تاں حفیظ خان دے اُردو کہانیاں دا مجموعہ ''یہ جو عورت ہے'' نومبر 1997ء اِچ
ملوہا پبلشرز ملتان چھاپیا ہا جیندے وچ چوڈاں افسانے شامل ہَن تے صفحے 143۔ پر اے کتاب
''حفیظ خان کی کہانیاں'' جیکوں ''وادی سندھ کی عورت کا نیا مقدمہ'' دا ذیلی عنوان دی ڈِتا گئے، دُو
مطبوعہ سرائیکی افسانوی مجموعیاں وچوں منتخب افسانیاں دا اُردو رُوپ اے۔ 160 صفحیاں دی ایں
کتاب کوں ملتان انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ ملتان نے جون 2007ء وچ چھاپے۔ ایں
کتاب وَچ شمیم عارف قریشی نے 20 صفحیاں دا ہک مضمون ''حفیظ خان کی سرائیکی کہانی'' اُردو وچ
لکھے۔ جون 2007ء وِچ چھپی اِیں کتاب وچ کُل بارھاں (12) افسانے ہِن۔ میڈے تیار کردہ
گوشوارے مُوجب پہلے سرائیکی مجموعے وِچوں: افسانہ نمبر 5 ''گرفتگی'' (اَصل عُنوان'' پھاتی
پَھتکی'') افسانہ نمبر 6 ''بوتے'' افسانہ نمبر 8 ''جاتی رُت کی شام'' اَتے افسانہ نمبر 9 ''گگی'' یعنی
کل چار افسانے اَتے ڈُوجھے سرائیکی مجموعے وچوں افسانہ نمبر 1 ''اِک اور بھنور گرداب میں'' افسانہ
نمبر 2 ''داؤ اور گھاؤ'' (اصل عُنوان ''جھات دے اندر گھات'') افسانہ نمبر 3 ''مکتی نہیں نبھتی نہیں''
افسانہ نمبر 4 ''جہنم جاگتا ہے'' (اَصل عنوان ''اندر لیکھ دا سیک'') افسانہ نمبر 5 ''اکیلا جاگتا ہوا آدمی''
افسانہ نمبر 6 ''منگل کے روز ناغہ ہوگا'' افسانہ نمبر 7 ''نازو بگھیلا'' افسانہ نمبر 9 ''مَنشا اور میاں
مَنشا'' یعنی کُل آٹھ افسانے شامِل ہِن۔

کتاب وِچ ترائے افسانیاں دا سال تحریر درج ہے: یعنی جہنم جاگتا ہے (2003ء)
گرفتگی (1982ء) اَتے داؤ اور گھاؤ (1974ء)۔ ایں چھیکڑی افسانے دا اُردو ترجمہ، ایں مجموعے
(مطبوعہ 2004ء) دے چھپن توں پہلے، ''بندیا'' دے عنوان نال مئی 1974ء دے ماہنامہ ''سورج
ڈائجسٹ'' کراچی وچ وی چھپ چکیا ہا۔ میڈے تیار کردہ اشاریاں مُوجب حفیظ...

افسانے اتے ڈرامے ماہنامہ ''سرائیکی ادب'' ملتان دے علاوہ ''سوجھلا'' (مدیر ممتاز حیدر ڈاہر مرحوم) سہ ماہی ''سرائیکی'' بہاولپور اَتے ''سمل'' وچ وی چھپدے ریہن۔ ماہنامہ ''سرائیکی ادب'' وچ ڈو(2) افسانے ''مامتا داڈنگ'' جنوری 1976ء تے ''آصفہ'' نومبر 1976ء اَتے پنج(5) ڈرامے ''ٹنگل پیسہ'' نومبر 1977ء ''رُٹھڑے پندھ'' مارچ 1978ء ''ماسی سیانی'' اکتوبر 1987ء ''سنگھار'' دسمبر 1988ء ''آزادی دا سجھ'' دسمبر 1989ء وچ چھپن۔ ہک ٻئی قابل ذکر گالھ ایہہ ہے جو حفیظ خان نے ''ویندی رُت دی شام'' (ٹائٹل افسانہ) دی ڈرامائی تشکیل وی ''اَپا بیپ'' دے عنواں نال پاکستان ٹیلی ویژن سنٹر لاہور دے سرائیکی پروگرام دے آغاز تے 1990ء وچ کیتی ہئی۔

ب۔ڈراما

1۔ کَچ دی دیاں ماڑیاں

''کچ دیاں ماڑیاں'' نہ صرف حفیظ خان بلکہ سرائیکی وچ وی ریڈیائی ڈرامیاں دا پہلا مجموعہ اے جیکوں سرائیکی اکیڈمی ملتان نے جون 1989ء وچ 256 صفحیاں دی کتابی صورت وچ چھاپیا۔ ایندے وچ چھی (6) ڈرامے ہن۔ پنج(5) ڈرامے ریڈیو ملتان توں تے ہک یعنی ترتیب دا ڈوجھا ڈرامہ ریڈیو بہاولپور توں نشر تھیا۔ ترتیب تے کتاب تے چھپی سال وار ترتیب کُجھ ایں اے۔ پہلا ''ڈو ڈونڑیں ہک'' (اکتوبر 1977ء) ڈوجھا ''پچھانویں'' (1979ء) تریجھا ''کَچ دیاں ماڑیاں'' (1977ء) چوتھا ''ریشم دی کلھی تند'' (1978ء) پنجواں ''بھر دی گردھ'' (جون 1978ء) تے چھیواں ''پیلے پتراں دی بہار'' (15 جنوری 1978ء)۔ (ح۔9)

کتاب دا تعارف اکیڈمی دے سیکرٹری خان رضوانی مرحوم نے لکھیا تے پس ورق ڈاکٹر انوار احمد تے امجد اسلام امجد نے، جیہڑے جو تاثرات رحیم طلب تے فرحت نواز دے ہن۔ ڈاہ صفحیاں دا اردو مضمون ''حفیظ خان کا فن ڈرامہ نگاری'' ڈاکٹر اے بی اشرف دی لکھت ہے۔ طویل ریڈیائی ڈرامیاں دے ایں مجموعے کوں کئی اعزاز حاصل تھئے۔ ایکوں اکادمی ادبیات پاکستان دی طرفوں صدراتی ایوارڈ نال نوازیا گیا۔ (ح۔10)

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور دے ایم اے سرائیکی دے نصاب وچ 1990ء توں
کتاب دا ڈرامہ ''بھر دی کندھ'' (ح۔11) تے وت 2004ء توں بی اے سرائیکی دے نصاب
وچ ٹائیٹل ڈرامہ '' سچ دیاں ماڑیاں'' شامل نصاب کیتا گیا۔ایں کتاب دی تعارفی تقریب دی
صدارت شہید جسٹس محمد منیر خان سابق جج سُپریم کورٹ آف پاکستان تے اُوں وقت دے صوبائی
محتسب نے کیتی۔ پاکستان ٹیلی ویژن سنٹر لاہور نے آپنے پروگرام ''پنجاب رنگ'' وچ ایں بارے
22 دسمبر 1989ء کوں 25 منٹ دا خصوصی پروگرام ٹیلی کاسٹ کیتا۔

2۔ماماں جمال خاں

''ماماں جمال خاں'' ریڈیو ملتان توں 1979ء وچ نشر تھئے بالاں دے پروگرام
''پُھلواری'' واسطے لکھی گئی سیریز دے ترائے ڈرامیاں دا مجموعہ اے۔72 صفحیاں تے مشتمل ایں
کتاب کوں پاکستان سرائیکی رائٹرز گلڈ ملتان نے جون 1990ء وچ شائع کیتا۔اے سرائیکی دے
بال ادب وچ ڈرامے دے حوالے نال پہلی کتاب اے۔ڈرامہ نگار دے اپڑیں بقول:''بچوں کی
ڈرامہ سیریز'' ناماں جمال خان'' کے تین اپی سوڈ اِسی نام سے شائع ہوکر (1991ء) سرائیکی میں
بچوں کے ڈراموں کی پہلی کتاب کا اعزاز پا گئے''۔(ح۔12)

3۔خواب گلاب

سرائیکی ادبی مجلس بہاولپور نے مئی 2003ء وچ 144 صفحیاں دا بالاں کیتے ریڈیائی
ڈرامیاں دا ایہہ مجموعہ چھاپیا۔ایں کتاب وچ 7 ڈرامے ہِن۔ جنہاں وچوں ریڈیو ملتان توں
''آخری غلطی'' اگست 1976ء وچ ''غلطی میڈی ہئی'' جنوری 1977ء وچ ''شرارت'' جون
1977ء وچ ''سنگھار'' اکتوبر 1977ء وچ ''نکا سائنس دان'' نومبر 1977ء وچ ''پھول شہزادہ''
دسمبر 1979ء وچ اَتے ریڈیو بہاولپور توں ''خواب گلاب'' جنوری 1976ء وچ نشر تھئے۔

4۔رُٹھڑے پندھ

حفیظ خان دے ڈرامیاں دا اے چوتھا مجموعہ ملتان انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ
ملتان نے دسمبر 2005ء وچ چھاپے 200 صفحیاں دی ایں کتاب وِچ سَت ڈرامے (1) ''کون

دلاں دیاں جانے'' (2) ''ٹنگل پیسہ'' (3) ''ایویں وی تھیندا ہوندے'' (4) ''ماسی سیانی'' (5) ''زخمڑے پندھ'' (6) ''اَپا پیپ'' تے (7) ''چھیکڑی جھمر'' شامل ہِن۔ کتاب وچ ڈاہ صفحیاں دا اردو وچ مضمون ''ماضی کی مسافت'' ڈرامہ نگار نے خود لکھے۔ کتاب مُوجب پہلا ڈرامہ بہاولپور ریڈیو توں نومبر 1979ء وچ نشر تھئے۔ ڈوجھا مارچ 1977ء، تریجھا 9 اپریل 1977ء چوتھا جنوری 1979ء تے پنجواں جنوری 1978ء وچ ریڈیو ملتان توں نشر تھئے۔ جیہڑھے ویلے جوایں کتاب وچ چھیکڑی ڈو ٹیلی پلے ہِن تے پاکستان ٹیلی ویژن سنٹر لاہور توں ٹیلی کاسٹ تھئے۔ کتاب وچ پہلا 1989ء تے ڈوجھا 20 جولائی 2001ء چھاپیا کھڑئے۔ پرمیڈی تحقیق مُوجب سرائیکی پروگرام ''رُت رنگیلڑی'' وچ پہلا ادبی پروگرام (پھوار) 3 اپریل 1990ء کوں ریکارڈ تھی تے 11 اپریل 1990 کوں اُتے پہلا ڈرامہ ''نویں پیڑھی دا سچ'' تحریر اصغر ندیم سید'' 2 مئی 1990ء کوں ڈکھایا گیا ہِ۔ تہوں اے چھیل سال ''اَپا پیپ'' (1989ء) درست کائینی۔ خود لکھاری منیندن:

''اَپا پیپ 1989ء میں، میرے سرائیکی افسانے ''ویندی رُت دی شام'' کو بنیاد بنا کر پاکستان ٹیلی ویژن لاہور سنٹر کے پروگرم ''رُت رنگیلڑی'' کے لیے لکھا گیا جو کہ اُن دنوں شروع کیا جانا مطلوب تھا۔ مگر (غالبًا) مقصود گلیمر نہ ہونے کے سبب اُس کی بجائے اپنے پیارے شاہ جی (اصغر ندیم سید) کا سرائیکی ڈرامہ ٹی وی پر دکھایا جانے والا پہلا ڈرامہ کہلایا اور یوں ''اپا پیپ'' کی باری چند دنوں کے بعد آئی۔'' (ح۔13)

ہُن پہلے حفیظ خان دے سرائیکی افسانیاں دا جائزہ گھندے ہیں۔*

1990ء وچ چھپن آلا حفیظ خان دا سرائیکی افسانیاں دے مجموعے ''ویندی رُت دی شام'' کوں اکیڈمی آف لیٹرز نے ایوارڈ ڈے تے آپنی سند دی مہر لا ڈتی۔ راقم الحروف ایندے بارے لکھیا ہا:

''لکھاری دی آپنی لکھت ''ڈوجھی گالھ'' موجب اے 1975ء توں پہلے دے افسانیاں تے مشتمل اے۔ جیہڑھے پندرہاں سال بعد ایں شکل وچ پڑھن آلیاں کوں ملے۔ زمانہ بدلیا، شہیں بدلیاں، سوچاں بدلیاں، پر جیویں چنگائی دے اصول نی بدلنے چاہیدے، ایویں سرائیکی افسانے دا نویکلا اتے نہوکڑا اَسلوب وی نی بدلنا چاہیدا۔ کیوں جو ایہہ

اسلوب اساڈی ریتیل تے اساڈے تل دی سنجان اے''۔ کتاب اندر ظفر لشاری نے ''ہک ادبی سُوکھڑی'' ناں دے دیباچے وچ لکھے۔

''ہک اوہ ویلہا وی آ گیا ہا جو سرائیکی افسانہ اوپرے گکھے پاتے آپنی شکل ونجا بیٹھا ہا۔ چھڑے لفظ باقی آ بچے ہن۔ کہانی ناں دی کوئی چیز افسانے وچ نظر نہ آندی ہئی۔ پر ''وینڈی رُت دی شام'' اوں روایت کوں تروڑتے لفظاں دی کھیڈ وچ کہانی دی واری آ وَلائی اے۔ حفیظ خان آپنے افسانیاں وچ کہیں جاوی علامت دیاں گھوڑیاں دا سہارا نئی گھندا''(صفحہ 15)

آپنی سانجھ دے نال نال زمانے کٹھے پیر رلاون دی لوڑ ہوندی اے تے بنہاں لا چنگیاں ریتاں وی گھن گھنٹیاں چاہیدیاں ہن۔ لہذا علامت نگاری دی تحریک جیکوں سرائیکی افسا وچ عامر فہیم نے ''جاگدی اکھ دا خواب'' دی شکل وچ سونہاں کرایا ہا، دے اثرات ظفر لشاری دی لکھی گالھ دے باوجود حفیظ خان دے افسانیاں وچ وی نظر آندن مثلاً

''کھیر...... سوجھلے دی علامت ہے تے قہوہ اندھارے دی...... جے سوجھلے اچ اندھارا رلایا ونجے تاں...... شام تھیندی ہے تے ول رات بن ویندی ہے...... موت دی علامت...... تے میکوں رات کنوں ڈر لگدے...... اتے جے قہوے اچ کھیر رلایا ونجے تاں اندھارے اچ سوجھلا گھلدے، تے جیں ویلے اندھارے وچ سوجھلا گھلے تاں سویر تھیندی ہے، سویر...... جیہڑھی زندگی ہے''۔(صفحہ 40)

ایں مجموعے وچ حفیظ خان نے بہوں حساس تے سنجیدہ موضوعات تے وی قلم چاتے پر اُنہاں آپنے لکھتاں کوں بے جا سنجیدہ نئی بنایا۔ حفیظ خان دا مشاہدہ بہوں تیز اے۔ عملی زندگی دے حوالے نال اوجتھاں وی رہن، انہاندا منصب اینجھا رہیے جو اُنہاں کوں لوکاں کوں بہوں قریب توں ڈیکھن دا موقع ملے۔ انہاں، اُنہاندے دے اندر جھاتیاں پاتن تے وت اساکوں اُنہاں لوکاں دے اندر جہان دا سونہاں کیتے۔

*ڈراموں کے سلسلے میں حفیظ خان کی پانچویں کتاب ''کوئی شہریں جنگل گوکدا'' 2008ء میں شائع ہو چکی ہے جو کہ 13 اقساط کے سرائیکی ٹیلی ڈراما سیریل پر مبنی ہے۔ (مرتب)

اِنہاندے افسانیاں کوں ورلی ورلی کرتے پڑھوتاں ''حاصل جمع'' ہک خوبصورت افسانہ اے جیندے وچ ہک سینا ہے جیکوں ریاضی دے اصول ''جمع نفی برابر ہے نفی اتے نفی جمع برابر ہے نفی'' آکھ سگدوں۔ گالہے اپا پیپ دی کہانی ''ویندی رُت دی شام'' اتے گالہی گگی دی کہانی ''گگی'' بہوں اثر کرن آلے افسانے ہن''۔ (ح۔14)

ایویں ای آپنی کتاب وچ ایں کتاب اندرفنی خوبیاں داذکر ئیں ایں طراحاں وی کیتا ہا:

''تیلی پہلوان'' وچ تیلی جیندی ڈدھ ڈہی دی دُکان اے۔ رعایت لفظی دیاں چساں ڈیکھو۔

''دل کیتا کہیں دی تحریک التواء دامکھن کڈھ چھوڑیا یا موڈ بنیا تاوڈے کنوں وڈے مسئلے دی ڈدھ پتی بناڈتی'' (صفحہ 18)

''ڈینہہ رات پونم دیاں گالھیں کر کرتے ٹھڈے ساہ بھریندارا ہندا تے ڈُدھ کوں گرم تے لسی کوں ٹھڈا کریندارا ہندا'' (صفحہ 21)

جتھاں حفیظ خان نے'' سُہنپ دی بھاء'' تے ''انگلیں داسیک'' جیہاں نفیس ترکیباں استعمال کیتن اُتھاں نویاں نرویاں تشبیہاں وی چَس وی ڈکھائی اے۔ مثال طور:

1۔ مینہہ وچ پُسی ہوئی وان دی کھٹ وانگوں چھکی تڑ یں جوانی

2۔ پولی دے تانے وانگوں چھکیا چکھیا بُت

حفیظ خان پڑھیا لکھیا لکھاری اے تے شہر دار وی اے، پر اُوں کتاب وچ سرائیکی دیہات دی بھر پور عکاسی کیتی اے۔ ایہہ تونی جو اُنہاندے کرداری وچ اساکوں پیراں ڈتے تے سُکھاں لدھی جہے ناں وی نظر آندن تے جے کر لغت ترتیب ڈیون ویلے چیتوں لتھے سرائیکی لفظ گولنے ہوون تاں حفیظ خان دی ایں کتاب وچ اتھے کئی ویہاں لفظ لبھ ویسن''۔ (ح۔ 15)

سئین قُدسیہ نیر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور شعبہ سرائیکی کیتے آپنے ایم اے دا مقالہ ''سرائیکی افسانے دافنی ویورا'' لکھیا ہا جیہڑھا کتابی شکل وچ وی چھپ تے آ گئے۔ سئیں حفیظ خان دے فن افسانہ نگاری بارے مقالہ نگار لکھدی اے:

''حفیظ خان دا سبھ توں وڈا کمال اے ہے کہ اُنہاں عام لوکیں دے مسائل خود اُنہاں دی زبان وچ بیان کیتن''

''حفیظ خان دا سبھ توں وڈا کمال اے ہے کہ او کردار دے عمل دے ذریعے پوری کہانی کوں سمجھا ڈیندن''

''حفیظ خان انسانی نفسیات کوں بہوں چنگی طرح جانڑدے ہن، جتھوں اُنہاں نے انسان دی نفسیات کوں بیان کیتے''

''جتھاں حفیظ خان نے انسانی نفسیات جیہے وڈے وڈے موضوعات تے قلم چاتے اُتھاں معمولی جیہے واقعات، عام گھریلو، جیہڑے ہر گھر دا مسئلہ ہن، اُنہاں کوں وی آپنے موضوعات بنڑائے''

''حفیظ خان دے افسانیاں وچ زندگی دا احساس واضح طور تے نظر آندے......حفیظ خان بڑی خوبصورتی نال قاری دی توجہ اوں پاسے گھن ویندے جیہڑے پاسے کہیں دا کڈاہیں دھیان نہیں گیا ہوندا'' (ح۔ 16)

حفیظ خان دے ڈراماں دا مطالعہ کرن توں پہلوں جان گھنو جو سرائیکی ڈرامے دا جدید پندھ ریڈیو ملتان دے آغاز نشریات 21 نومبر 1970ء تے ریڈیو بہاولپور دے آغازِ نشریات کم اگست 1975ء دے بعد پاکستان ٹیلی ویژن سنٹر لاہور دے سرائیکی پروگرام آغاز نشریات 11 اپریل 1990ء توں تھیندے۔ ریڈیو تے ٹی وی کیتے خوبصورت ڈرامے لکھے ونجن لگے۔ انہاں دی اشاعت اخبارات تے رسائل دے نال کتابی شکل وچ وی شروع تھئی۔ 1989ء دا سال سرائیکی مطبوعہ ڈرامے دی تاریخ دا اہم سال اے، جیندے وچ ڈو خوبصورت مجموعے کتابی شکل وچ سامنے آئے۔ راقم سرائیکی ڈرامہ نگاری دے ارتقاء بارے آپنی ہک لکھت وچ لکھیا ہا۔

''حفیظ خان دے سرائیکی ڈراماں دے مجموعے'' کچ دیاں ماڑیاں'' دا پہلا ڈرامہ'' ڈو ڈونریں ہک'' حفیظ خان دے ریڈیو بہاولپور تے ملتان توں ڈراما نگاری دے پندھ دے تناظر وچ ابتدائی سرائیکی ڈراماں وچ 1977ء اندر ہک سنگ میل ڈسدے۔ ایں ڈرامے وچ کوڑی شان و شوکت دا مظاہرہ کرن آلیاں دا پول کھولیا گئے۔ جیہڑے لوک آپنی اوقات توں ودھ تے اُچی اُڈاری مارن دی کوشش کریندن، مُنہ دے بھر ڈھاندن۔

ایہہ ہک ظاہر دار ننگر دی کہانی اے۔ ڈسیا گئے جو چھوہیر کیتے چھوآر دی امیری وچ کشش اے تے ایں طراحویں چھوآر وی چھوہیر دی دولت دا دیوانہ اے پر چھیکو تے پتہ لگدے جو ڈوہیں ہک بئے کو دوکھا ڈیندے پئے ہن۔ مجموعی طور تے ایہہ ڈراما سماجی جبر دیاں مختلف صورتاں دے رومانی تے دلچسپ اظہار نال وی سانگار رکھدے، جیکوں حفیظ خان جہیں ڈرامہ نگار نے فنکارانہ چابکدستی نال لکھے۔

ڈوجھا ڈرامہ ''پچھانویں'' اے۔ ایہہ ہک خودغرض، حرصی ننگر دی کہانی اے جیہڑا معذور تھی ویندے تے اُوندی امیر محبوبہ اوکوں چھوڑ ویندی اے پر غریب منگیتر سہارا بندی اے۔ بکے وقت وچ کوڑے پیار تے سچی محبت دی کہانی اے۔

ٹائٹل ڈرامہ '' کچ دیا ماڑیاں'' دا نمبر تریجھا اے۔ ایندا موضوع وی جبر تے عدم مساوات بندن۔ ایہہ ڈرامائی سچویشنز کنوں پر کہانی اے۔ ایندے وچ چھوآر دی محبت وی بناوٹی اے تے چھوہیر دی وی۔ ڈوہیں دے آپنے آپنے مکے ہوئے مقصد ہن۔ اجکل دے ننگریں دی نفسیات دا اظہار اے۔ معروضی حقائق دے نتیجے وچ اُبھرن آلی نفسیات . داذکر اے۔

چوتھا ڈرامہ ''ریشم دی کلھی تند'' اتھے چھوآر تے چھوہیر دی کہانی اے جنہاں ندی محبت صرف اظہار دی جرات نہ ہوون پاروں ناکام تھی ویندی اے۔ ایندے ست منظر ہن۔ تھیم ایہہ ہے جو دل وچ محبت دا روگ گھن کراہیں گھُٹ تے مرن آلے لوک ناکام راہندن۔ محبت جرات اظہار دا تقاضا کریندی اے۔ سلیمان تے عزیز متضاد کردار ہن۔ مثالیت پسندی تے فعالیت پسندی دا موازنہ اے جو اساڈے معاشرے وچ شریف تے بے زبان انسان گھاٹے وچ راہندن۔

چھیواں ڈرامہ '' پیلے پتراں دی بہار'' ہک بزدل چھوہیر شہلا تے ہک بے وفا چھوآر عمران دی ناکام محبت دا واقعہ اہے۔ شہلا دا کردار رومانی تے کمزور اے جیں وچ توانائی کائنی۔ اوہ حالات دا سامنا کرن دی صلاحیت توں عاری اے۔ عمران شوخ، ذہین مگر چالاک تے دغا باز چھوآر اے۔ اُوں وچ ہیرو دیاں خوبیاں کائنی۔ عام جیہا ننگر اے۔ ڈرامے کوں فلیش بیک دی تکنیک نال چسولا بنایا گئے۔ ریڈیائی تکنیک دے اعتبار نال ایہہ معیاری ڈرامہ اے۔ کہانی وچ ڈسایا گئے جو شہلا دی شادی قیصر نال تھی ویندی اے تے اوہ آپنی پہلی

محبت چھوڑ نہ سکن پاروں طلاق گھن تے ول آندی اے تے اُوں ڈیہہ گھر وچ عمران دی شادی دا کارڈ آیا ہویا ہوندے۔ ایہو او ہو عمران ہیں جیں دی حیات اُڈیکن دا وعدہ کیتا ہا پچھی پیسے دی نال رَجھ سگیا۔ فرحت نواز نے لکھے:

"حفیظ خان جو کجھ لکھے آپوں گھڑتے نہیں لکھیا۔ اُنہاں اپنے کردار زندگی دے معمولات تو کشید کیتن ہیں راتگے اوساکوں اوپرے نئیں لگدے"۔ (صفحہ 8)

فرحت نواز دی گالھ دا ثبوت یا ایندی مثال ڈراما "پیلے پتراں دی بہار" ای اے۔ ڈرامے دی ہیروئن شیلا سرائیکی معاشرت دی نمائندہ اے۔ اوہ مرضی دے بغیر شادی ویلے عام تے بے وس تھیوہیر ثابت تھیندی اے۔ خواب ڈیکھن دے نال رووݨ دھووݨ وی اوندی عادت اے"۔ (ح۔17)

مجموعے دے بیا توں اہم ڈرامے "بُھر دی کندھ" بارے بہوں کجھ لکھیا گئے۔ راقم دی ہک طویل تجزیاتی لکھت توں ہک اقتباس کجھ ایں اے۔

"ایہ ڈرامہ 1978ء وچ لکھیا گیا جیہڑھا کتاب دے 35 صفحیاں (185-220) تے کھنڈیا ہویا اے۔ ایہ ریڈیائی ڈرامہ اے اتے اسٹیج تھیوݨ ممکن کائنی۔ کیوں جو جاہ جاہ تے فلیش بیک اے اَتے ماضی دے مناظر دکھائے گئن۔ ایہ چار منظراں تے مشتمل یک بابی ڈرامہ اے۔ ایہ ہک نفسیاتی ڈرامہ اے تے ایندے وچ ذہن جیکوں دماغ چا آکھوں تاں دل تے دماغ دی کشمکش اے جیندے وچ انسانی رویاں دی ترٹ بھج نظر آندی اے۔۔۔۔ دیباچہ نگار ڈاکٹر اے بی اشرف نے دیباچے وچ باقی پنج ڈرامیاں تے کُھل تے گالھ کیتی اے پر "بُھر دی کندھ" تے نی کیتی۔ یا تاں ایہ ڈرامہ اُنہاں دے مطالعہ وچ نی آیا یا وت اُنہاں ایکوں اہمیت نی ڈتی۔؟

ڈرامے دا موضوع کجھ ایں اے کہ ڈرامے وچ زوالوجی دے حوالے نال بحث اے مثلاً ڈاگ فش دا ڈائی سیکشن کرن، ڈاگ فش دے کرینئل نروز لبھن وغیرہ۔ اساکوں لکھاری دے ایں موضوعات تے معلومات بارے حیرانی کائنی۔ اساکوں ذہن وچ رکھنا پوسی جو حفیظ خان نے ایس ای (S.E) کالج بہاولپور توں زوالوجی دے نال بی ایس سی B.Sc کیتی ہوئی اے۔

ایں ڈرامے دا مرکزی خیال ڈرامے دے ہک مکالمے دا اُو فقرہ اے جیہڑھا پروفیسر رحمٰن دا ذہن اوکوں آہدے:

''محبت آپنے ہم عمر نال سوہنی لگدی اے۔ بھلا کھلدی کلی تے کملاندے پھل دا کیا جوڑ''۔ (صفحہ۔214)

ایہہ گالھ کوں اُساں مس شازیہ تے ثمرین دے رحمان نال مکالمیاں وچ مزید واضح انداز وچ ڈیکھ سگدے ہئیں۔

1۔مس شازیہ: میڈی عمر ڈٹھی، 24 سالاں دی ہاں.....پورے ڈاہ سالاں دا فرق.....(صفحہ202)

2۔ثمرین بارے ذہن آہدے:

''ثمرین تے تیڈی عمراں وچ ستاوی سلاں دا فرق اے۔(صفحہ 214)

اِتھاں ایہہ نتیجہ جو''صحیح وقت تے صحیح فیصلہ ضروری ہوندے'' کھل تے سامنے آندے۔

ایں ڈرامے وچ سرائیکی وسیب دے قدراں دے پیش نظر جذبیاں دی ترٹ بھج تے ٹریجڈی نظر آندی اے۔ مس شازیہ آپنے 14 سالہ اسٹوڈنٹ رحمٰن کوں آپنی تصویر تاں نئیں ڈے سگدی پر پکنک آلے ڈینہہ مس نجمہ کوں دریا دے کنڈے تے ایہہ آکھ باہندی اے:

''رحمٰن میکوں ایڈا چنگا لگدے جو اگر ایہہ وڈا ہووے ہا تاں میں ایندے نال شادی کر گھنا ہا۔''(صفحہ202)

پورے ڈرامے دی کہانی دی بنیاد ایہو ہک فقرہ اے۔ جے رحمٰن ایہہ فقرہ نہ سُندا تاں مس نال اظہار محبت کرتے شادی دی پیشکش نہ کریندا تے مس دے ڈاٹن تے وڈا آدمی بنن دے جنون وچ جوانی دی عمر نہ لنگا باہندا تے ایں ایہہ کہانی جنم ای نہ گھندی۔

ڈرامے دی کہانی کجھ ایں اے۔ پہلے منظر وچ پروفیسر رحمٰن دیر نال گھر آندے۔ اوندی بھین اوندے انتظار وچ ہوندی اے۔ اوندی بھین اوندی شادی کرن بارنے گالھ کریندی اے لیکن پروفیسر رحمٰن توں انکار کر ڈیندے۔ ڈوجھا منظر ثمرین دے کمرے وچ داخل تھیون نال شروع تھیندے۔ اے کمرہ پروفیسر رحمٰن دا ہے۔ جیہڑا زوالوجی دا ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ اے۔ ثمرین آپنے گالھیں نال ظاہر کریندی اے جو او پروفیسر کنوں کافی حد تائیں متاثر اے تے

اینڈے نال پروفیسر کوں ماضی یاد آویندے۔ اسکول وچ مس شازیہ نال محبت دا اظہار، ذلیل تھی تے نکلن، اوندی گالھ دے ردعمل وچ تمام تر توجہ پڑھائی تے ڈیندے ہوئیں ڈاکٹریٹ کر گھنن۔ پر ایں دوران اوندا تربیت کنوں نفرت تھی ونجن۔ ایں منظر وچ پروفیسر اپنے ذہن اگوں اعتراف کریندے جو اوکوں ثمرین نال محبت اے۔ تریجھے منظر وچ پروفیسر شادی کرن تے راضی تھی ویندے۔ اینڈے نال نال اوندی نفرت وی عورت کنوں ختم تھی ویندی اے۔ جیندا اوخود اعتراف کریندے۔ ثمرین دے مکالمے اوندے ذہن اچ آندن۔ چھوتھے منظر وچ پروفیسر ثمرین نال آپنی محبت دا اعتراف تے شادی دی خواہش اظہار کریندے تے ثمرین ایں خواہش کوں بری طرح ٹھکرا ڈیندی اے''۔(ح۔18)

ہن حفیظ خان دے سرائیکی ڈرامیاں دے ہک بئے اہم مجموعے ''رُٹھڑے پندھ'' دا مطالعہ کریندے ہیں۔ ایں مجموعے دے ڈرامیاں دے موضوعات وی جیندے جاگدے پر مُردہ معاشرے وچ وسن آلے انساناں دے مسئلیاں تے مبنی ہن۔ انہاں ڈرامیاں دے کرداراں دے مکھڑیاں تے وی گلیمر دی لالی تاں کائنی پر اکھیں وچ حیاتی دی کسک تے رَت وچ انسانیت دی تاپش ضرور اے۔ ڈرامہ ''کون دِلاں دیاں جانے'' پہلی واری تاں 1979ء وچ ریڈیو بہاولپور توں براڈ کاسٹ تھیا پر ایہہ کئی واری نشر تھی چکے۔ ایں ڈرامے وچ سرائیکی ڈررامہ نگاری دے ڈو اہم ناں مُسرت کلانچوی تے بتول رحمانی مرحومہ نے بطور صداکار کم کیتا ہا۔

1977ء وچ حفیظ خان نے تربیتیں دے پروگراماں کیتے مختصر دورانیے دے کئی ڈرامے لکھے۔ جنھیں کوں نذیر بلوچ مرحوم پیش کیتا۔ ایں سلسلے دا پہلا ڈرامہ تاں 15 جنوری 1977ء کوں ''مینوا'' دے ناں نال چلیا پر اینڈے بعد دے ترائے ڈرامے ''ٹنگل پیسہ'' (26مارچ1977ء) ''ایویں دی تھیندا ہوندے'' (9اپریل1977ء) تے ''رُٹھڑے پندھ'' (7مئی1977ء) ایں مجموعے وچ شامل ہن۔ ''ٹنگل پیسہ'' دا مرکزی خیال ایہہ ہے جو ہک پڑھی لکھی ذال (بیوی) کیویں گھر کوں جنت بناسگدی اے۔ اینڈے وچ منگنی دے مسائل وی چھیڑے گئین تے مناسب رشتے دی وکالت وی کیتی گئی اے تے زیور تعلیم نال آراستہ تھیون دی تلقین وی موجود اے۔ ''رُٹھڑے پندھ'' دا موضوع نونہہ تے سس دے جھیڑیاں دا گھر دی بربادی دا موجب بݨن اے۔ تھوں پئے کوں

شک شک شبے دے حالات توں بچن دی نصیحت ملدی اے۔(ح۔19)

''ماسی سیانی'' کتاب وچ صفحہ 16 اُتے ریڈیو پاکستان ملتان دے دیہاتی بھایاں دے پروگرام ''جمہوری آواز'' وچ 1981ء وچ نشر تھیا۔ایں سلسلے دا ڈراما ہر ہفتے کوئی نواں گھریلو مسئلہ کوئی نکا جیہاں جھیڑا یا کوئی بے ضرر جہیں اُلجھن دے بارے ہوندا ہا،جیندا حل چھڑا ماسی سیانی کنے ہوندا ہا۔ ایہہ کردار معروف صداکارہ روبینہ ناز نے ادا کیتا ہا۔لکھاری لکھدے:

''باوجود کوشش کے اس سلسلے کا صرف ایک مسودہ دستیاب ہوسکا،جسے شامل کرلیا گیا ہے''۔

(ح۔20)

صورتحال ایہہ ہے جو میں جیہڑے ماہنامہ ''سرائیکی ادب'' ملتان دا معاون مدیر ہم،ایہہ ہک ڈرامہ اکتوبر 1987ء دے شمارے وچ صفحات 19 توں 123 بقیہ صفحہ 12 تے چھاپ ڈتا ہا، تہوں محفوظ تھیا تے شامل کتاب تھی سکیا۔

چھیکڑی ڈو ڈرامے ٹیلی پلے ہن۔''اَپا پیپ'' بارے ''توضیحی کتابیات'' وچ کجھ تفصیل آ چکی اے۔مزید،لکھاری لکھدن:

> ''ایں ڈرامے وچ اپا پیپ دا یادگار کردار عاشق راہی مرحوم نے کیتا جیہڑا اوندا پہلا ٹی وی ڈرامہ ہا۔ایں طرحاں شبو تے زرینہ دا ڈبل رول فلمسٹار نور دی وڈی بھین حسینہ نے ادا کیتا۔اوندی وی ایہہ پہلی پرفارمنس ہئی''۔(ح۔21)

ڈرامہ ''چھیکڑی جھمر'' وڈے شاہریں دی مصروف گذرگاہویں دے کنڈے ٹولیاں دی صورت اُڈیکدے،زردے رنگے دھوتی کُرتے پاتی،جھومریاں دی حیاتی دا المیہ اے۔جیہڑھا اندھارے مستقبل دے سامنے کھڑے،آپنے ماضی تے حال دے وچکار،معاش دی سولی تے لٹکے ہوئے ہن۔بھوئیں دی بھنوالی نال جُڑے ایں فن کوں نویں نسل معاشی بدحالی تے بے عزتی پاروں چھوڑن چاہندی اے۔پر پرانی نسل ایکوں آپنے کیتے سنجان تے وڈائی دا موجب سمجھدی اے۔اناں ڈو نسلاں دی چھک تان دے پچھوکڑ وچ انہہ ڈرامے دے علاوہ ہک بیا ٹیلی ڈرامہ ''ڈو تھے'' وی ہے جیندے اُتے 2003ء دا پی ٹی وی ایوارڈ وی ملیا،جیہڑھا کہیں سرائیکی ٹی وی ڈرامے کوں ملن آلا پہلا

ایوارڈ ہا۔ اے ڈراما اسکرپٹ نہ مل سکن پاروں ایں مجموعے وچ شامل تھیون توں رہ گئے۔

حفیظ خان دے سرائیکی ڈرامے دے حوالے نال ڈو بئے گالھیں وی قابل ذکر ہِن۔ ہِک دا ذکر منور سُلطانہ (سرائیکی افسانہ نگار تے ڈرامہ نگار صبیحہ قریشی دی ڈیرانی) کریندے ہوئیں لکھدی اے:

''قومی سطح دے ڈرراما نگاریں نال رابطہ قائم کیتا گیا تے انہاں دے اہم ڈرامے مقامی زبان سرائیکی وچ ترجمہ کرتے نشر کیتے گئے، مُترجمین وچ حفیظ خان وی شامل ہِن''۔(ح۔22)

ڈوجھا حوالہ جیوں جو اُتے عاشق راہی یا حسینہ دائی وی ڈرامے دے حوالے نال ذکر آ چکے، حفیظ خان دے ریڈیو ڈرامیاں نے وی کئی صدا کاریں کوں نہ صرف متعارف کرایا بلکہ مقبول کیتا۔ مثلاً تسنیم بھٹی جیہڑھی بعد وچ فلمی دنیا وچ بازغہ دے ناں نال سنجانی گئی (اج کل سرائیکی لوک گلوکار عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی دی گھر آلی اے) ڈرامہ ''ڈوڈو نڑیں ہِک'' وچ محض ہِک چھوٹا جیہاں کردار کیتا ہِس۔ ڈرامہ ''بُھر دی کندھ'' وچ ثمرین دا کردار ادا کرن آلی کوثر پروین (جیندا ایہہ پہلا ڈرامہ ہا) کوثر پروین توں ''کوثر ثمرین'' بن گئی نے وت ریڈیو دی مقبول صدا کارہ تے ہِن معروف براڈ کاسٹر، ٹی وی اداکارہ، شاعرہ تے سرائیکی دی سیرت نگار تک بن چُکی ہے۔

ہِن حفیظ خان دے ڈرامیاں تے خاص کر جیہڑے اُجن تائیں کہیں مجموعے وچ شامل نی تھئے اُتے انہاں اذکراں ایں مضمون وچ نی تھی سکیا، کجھ گالھ انہاں تے وی تھی ونجے:

''1976-77ء وچ ریڈیو پاکستان بہاولپور دے زراعتی پروگرام وچ سلسلے وار فیچر ''کھیت بنے بھاگ'' پروڈیوسر خالد چوہان (راجہ خالد محمود چوہان) نے پیش کیتا تاں ایں سلسلے دے کئی فیچر حفیظ خان نے لکھے۔ پاکستان دی سیاسی تاریخ دے پچھوکڑ وچ حفیظ خان دا لکھیا ہویا خصوصی فیچر ''نواں سجھ'' نذیر بلوچ مرحوم نے 6 فروری 1977ء کوں پیش کیتا۔ 1980ء وچ ریڈیو بہاولپور دے پروڈیوسر محمد خان (لغاری) نے حفیظ خان دے لکھے ہوئے تاریخی ڈرامے ''شہاب الدین غوری''، ''محمد بن قاسم''، ''طارق بن زیاد''، ''موسیٰ بن نصیر'' نشر کیتے۔ بالاں دا ڈرامہ ''ضِد بری بلا ہے'' 22 جون 1980 کوں نشر تھیا۔ ایں طراحویں ''یثرب دا ولی'' 1981ء وچ چلیا۔''(ح۔23)

حفیظ خان دا افسانہ ہووے یا ڈرامہ ''کہانی'' بولیندی اے۔ ایں گالھ دا اُنہاں کوں وی

احساس اے، تہوں لکھدن:

"کہانیوں سے کہانی کشید کرتا ہوں...... کردار گھڑتا نہیں، چُنتا ہوں، اُنہیں لکھتا نہیں، اُن کی تجسیم کرتا ہوں، اُن کے اپنے فطری تضادات کے ساتھ، فطری بہاؤ میں، باقی کہانی وہ خود بُن لیتے ہیں"۔(ح۔24)

حفیظ خان دا مشاہدہ کتلا گوڑھا اے، جذبے تے کیفیتیں کوں بیان کریندے لفظیں دی ڈٹھ دا نمونہ ڈیکھنا ہووے، حقیقتیں کوں، سچے تے کھورے جملیاں دی چس چاونی ہوئے سرائیکی یا اُردو افسانے، ڈرامے، فیچر تاں کئی ویہاں مثالاں دے امانت دار ہن۔ انہاں دی ہک اردو بیانیہ لکھت دا ہک ٹوٹا ڈیکھو حفیظ خان دا فن تے اسلوب آپے سمجھ آ ویسی:

"شادی بھی عجیب کھیل ہے کہ جس کے پہلے ہاف میں مرد اور دوسرے ہاف میں عورت حاوی ہوتی ہے۔ معاشرتی، معاشی، اور جسمانی طور پر قوی حریف کی قوتوں کے زوال کے انتظار کے ساتھ ساتھ مرد ہی کے نُطفے سے پیدا شُدہ اولاد کو اُسی کی کمائی پر اسطرح جوان کرتی ہے کہ وہ رہتے تو باپ کے گھر میں ہیں مگر ماں کے ذہنی تعصب کی زرہ بکتر میں ملبوس اور اُس کے جذبہ انتقام سے لیس"۔(ح۔25)

O

حوالہ جات

ح۔1۔''حفیظ خان کی سرائیکی کہانی'' مشمولہ ''حفیظ خان کی کہانیاں'' مطبوعہ مُلتان جون 2007ء صفحات 10، 28

ح۔2۔''میری کہانیاں'' مشمولہ ''اَندر لیکھ داسیک'' الحمد پبلی کیشنز لاہور مارچ 2004ء صفحہ - 9

ح۔3۔''میری کہانیاں'' مشمولہ ''اَندر لیکھ داسیک'' الحمد پبلی کیشنز لاہور مارچ 2004ء صفحہ - 12

ح۔3۔الف ''میری کہانیاں'' مشمولہ ''اَندر لیکھ داسیک'' الحمد پبلی کیشنز لاہور مارچ 2004ء صفحہ - 12

ح۔4۔''حفیظ خان کی کہانیاں'' ناشر مُلتان انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ ملتان صفحہ 159

ح۔5۔''ماضی کی مُسافت'' مشمولہ ''رُٹھڑے پَندھ'' مطبوعہ ملتان دسمبر 2005ء صفحات 14۔13

ح۔6۔''ماضی کی مُسافت'' مشمولہ ''رُٹھڑے پَندھ'' صفحات 9 تا 23

ح۔7۔خبرنامہ ''سرائیکی زبان'' بہاولپور شمارہ مئی جون 1989ء صفحہ 7

ح۔8۔استفادہ

(A) ڈائریکٹر سرائیکی مصنفین پاکستان مطبوعہ مظفر گڑھ دسمبر 1993ء صفحہ 115

(B) ''سرائیکی افسانے دافنی دیورا'' وسیب پبلیشرز بہاولپور اگست 2007ء صفحہ 145

(C) ''میری کہانیاں'' مشمولہ ''اندر لیکھ داسیک'' صفحات 9 تا 23

ح۔9۔ریڈیو توں گھدے معلومات موجب پہلا ڈرامہ 18 ستمبر 1977 تے تریجھا ٹائیٹل ڈرامہ 3 اپریل 1978ء دا اَتے پنجواں ڈرامہ جون 1978ء دا اے (راقم الحروف)

ح۔10۔''کچ دیا ماڑیاں'' (1989ء) تے ''وینڈی رُت دی شام'' (1990ء) ڈوہائیں کتاباں تے 1994ء دی اہل قلم کانفرنس وچ صدر پاکستان نے ڈو کتاباں تے ہِکے بعد دیگرے ڈو سالاں وچ ایوارڈ ڈِتے'' (اندر لیکھ داسیک صفحہ 21)

ح۔11۔''اندر لیکھ داسیک'' وچ لکھاری دی وی لکھت ''میری کہانیاں'' صفحہ 21 موجب کتاب دی اشاعت ایں ڈرامے دی سلیبس وچ شمولیت دی مرہون منت اے۔

ح۔12۔ پر کتاب تے صفحہ 4 اُتے جون 1990ء اُتے صفحہ 7 تے 2 جون 1990ء چھپیا ہویا اے۔

ح۔13۔ ''ماضی کی مسافت'' مشمولہ ''رُٹھڑے پندھ'' صفحہ 17

ح۔14۔ ''حفیظ خان دی ویندی رُت دی شام'' مطبوعہ ماہنامہ ''لہراں'' لاہور دسمبر 1990ء صفحات 131-132 سلور جوبلی نمبر 5

ح۔15۔ ''سرائیکی ادب ٹور تے پندھ'' مجلس سرائیکی مصنفین پاکستان مظفر گڑھ اکتوبر 1996ء صفحات 253-252

ح۔16۔ ''سرائیکی افسانے دا فنی ویورا'' قدسیہ قاسم ویب پبلشر بہاولپور اگست 2007ء صفحات 151,150,148,147,146

ح۔17۔ ''سرائیکی ڈراما کا ارتقائی پس منظر'' ماہنامہ تخلیق لاہور شمارہ اپریل 2005ء صفحات 107-108

ح۔ 18۔ ''سرائیکی ادب ٹور تے پندھ'' مجلس سرائیکی مصنفین پاکستان مظفر گڑھ اکتوبر 1996ء صفحات 272 تا 274

ح۔19۔ ریڈیو ریکارڈ موجب 13 قسطاں دا ایہہ سلسلہ 19 جنوری 1982ء توں چلیا ایندے پروڈیوسر حفیظ خان خود ہن

ح۔20۔ ''رُٹھڑے پندھ'' صفحہ 16

ح۔21۔ ''رُٹھڑے پندھ'' صفحہ 173

ح۔ 22۔ ''ریڈیو پاکستان بہاولپور سے نشر ہونیوے والے منتخب ڈراموں کا جائزہ'' مقالہ ایم اے اُردو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور صفحہ 59

ح۔23۔ ''سرائیکی ڈراما کا ارتقائی پس منظر'' ماہنامہ تخلیق لاہور اپریل 2005ء صفحہ 107

ح۔24۔ ''میری کہانیاں'' مشمولہ ''اندر لیکھ دا سیک'' صفحہ 22

ح۔25۔ ''ماضی کی مُسافت'' مشمولہ ''رُٹھڑے پندھ'' صفحہ 11

کتابیات (حوالہ جاتی ترتیب سے)

1۔ حفیظ خان ''حفیظ خان کی کہانیاں'' ملتان انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ ملتان جون 2007ء

2۔ حفیظ خان ''اندر لیکھ دا سیک'' الحمد پبلی کیشنز لاہور مارچ 2004ء

3۔ حفیظ خان ''رُٹھڑے پندھ'' ملتان انسٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ ملتان دسمبر 2005ء

4۔ دلشاد کلانچوی خبرنامہ ''سرائیکی زبان'' بہاولپور شمارہ مئی جون 1989ء

5۔ سجاد حیدر پرویز ''ڈائریکٹری سرائیکی مصنفین پاکستان'' مطبوعہ مظفر گڑھ دسمبر 1993ء

6۔ قدسیہ قاسم ''سرائیکی افسانے دافنی دیوار'' وسیب پبلیشرز بہاولپور اگست 2007ء

7۔ سجاد حیدر پرویز ''حفیظ خان دی ونیدی رُت دی شام'' مطبوعہ ماہنامہ ''لہراں'' لاہور دسمبر 1990ء سلور جوبلی نمبر 5

8۔ سجاد حیدر پرویز ''سرائیکی ادب ٹور تے پندھ'' مجلس سرائیکی مصنفین پاکستان مظفر گڑھ اکتوبر 1996ء

9۔ سجاد حیدر پرویز ''سرائیکی ڈراما کا ارتقائی پس منظر'' مطبوعہ ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور شمارہ اپریل 2005ء

10۔ منور سلطانہ ''ریڈیو پاکستان بہاولپور سے نشر ہونے والے منتخب ڈراموں کا جائزہ'' مقالہ ایم اے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

O

(تحریر دسمبر 7

حفیظ خان بطور کہانی کار

قدسیہ قاسم

حفیظ خان 1956ء وچ ڈیرہ نواب صاحب وچ جمے۔ بی ایس سی، ایس ای کالج بہاولپور توں کیتی، ایل ایل بی زکریا یونیورسٹی ملتان توں تے تاریخ وچ ایم اے وی ملتان توں کیتا۔ عملی زندگی دا آغاز 1980ء توں وکالت نال کیتے۔ 1982ء وچ سول جج دے عہدے تے کم کیتا۔ جنوری 1984ء وچ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور وچ شعبہ قانون دے لیکچرار بن گئے۔ ستمبر 1984ء توں ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر دے عہدے تے کم کیتا۔ 1985ء وچ دوبارہ بطور سول جج عدلیہ وچ شمولیت اختیار کر گھدی تے اجکل ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ہن۔

حفیظ خان نے 1985ء تک ریڈیو پاکستان بہاولپور تے ریڈیو پاکستان ملتان وچ بطور صداکار تے ڈرامہ نگار تے وی کم کیتا۔ بے شمار ڈرامے لکھن جیڑھے ریڈیو توں پیش تھیندے رہ گئین۔ سرائیکی ڈرامیاں دی کتاب ''کچ دیاں ماڑیاں'' جون ۱۹۸۹ء وچ چھپی ھے۔ ایندے وچ چھ ڈرامے شامل ھن۔ ایں توں علاوہ سرائیکی افسانیاں دی کتاب ''ویندی رت دی شام'' جیڑھی ۱۹۹۰ء وچ چھپی۔

حفیظ خان نے بطور صداکار تے پروڈیوسر جولائی 1982ء تک کم کیتا تے 15 جولائی 82ء کوں اے عہدہ چھوڑ ڈتا ہا۔ 1981ء وچ ریڈیو پاکستان بطور پروگرام پروڈیوسر جائن کیتا تے

17 جولائی 1982ء کوں پی سی ایس کرن توں بعد سول جج بݨ کے ملازمت دسمبر 1983ء
چھوڑ ݙتی تے جنوری 1984ء اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور دے شعبہ قانون دے لیکچرار
جیہوں ستمبر 84ء وچ ملازمت چھوڑ ݙتی تے PCS(Executive) کرن توں بعد
وچ ای ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر بن گئے۔(1)

حفیظ خان نے پہلا افسانہ 1971ء وچ لکھیا 'بیرے تے گرے' ریڈیو
بہاولپور توں 1975ء وچ نشر تھیا۔ ایں توں علاوہ حفیظ خان دے افسانے 1972ء توں
تک ماہنامہ آداب لاہور، شباب لاہور، شمع کراچی، سب رنگ ڈائجسٹ کراچی، سورج
کراچی، ماہنامہ ملاقات فیصل آباد، دھنک لاہور تے ملن لاہور وچ چھپدے رہے۔(2)

بحیثیت افسانہ نگار انہاں سبھ توں پہلا افسانہ ۱۹۷۵ء وچ لکھیا جیڑھا ریڈیو پاکستان
پور دے پروگرام ''روہی دے راجے'' وچ ''بیرے تے گرے'' دے عنوان نال نشر تھیا
انہاں بے شمار افسانے لکھن۔

حفیظ خان سرائیکی ادب وچ ہک نویکلا مقام رکھیندن۔ انہاں دا تعلق ہک ایہو جئے شعبے نال
اے۔ جتھاں انہاں دا تعلق ہزاراں لوکیں نال رہندے۔ انہاں دے مسائل انہاں دیاں
ہک ذوجھے نال زیادتی وغیرہ وغیرہ ساریاں چیزاں کوں نہ صرف نیڑے کنوں ݙٹھے بلکہ انہاں دے
فیصلے کرن دی ذمہ داری وی انہاں تے ہے۔ لہٰذا ہک ایسا انسان جیندے چارے پاسوں وسیب
تھیون والے مسائل کھنڈے پئے ہوون جیکوں روز نویاں کہانیاں سݨن کوں ملن او بندہ حساس دل
مالک وی ہووے تے ہک لکھاری وی تاں ول اے کیویں تھی سگدے کہ اوندے قلم دی چج وچوں
وسیب دیاں گالھیں نہ نکلن۔ انہاں اپنیاں افسانیاں وچ لوکاں دے
مسائل وسیب دے چھک تان دے اسباب جھیڑے جھٹیاں دے نتیجے وچ انسانی زندگی کوں
پیش آون والے دھکے دھوڑے بیان کیتن تے انہاں کوں موضوع بناون دی کوشش کیتی اے۔

---

(1) تاریخ ہائے وکوائف مطابق حقائق نہ ہونے کے سبب درست کیے گئے۔(مرتب)

(2) ایضاً

حفیظ خان دے افسانیاں وچ انسانی رویاں دے درمیان جیڑھی کشمکش رہندی اے اساکوں ادھا نظر آندی اے اور ویئے جیڑھے عام طور تے نظر انداز کرڈتے ویندے ہن مثلاً ماء پیوء دے درمیان، میاں بیوی دے درمیان، بھین بھراء دے درمیان جیڑھے چھوٹے چھوٹے مسائل پیش آندن حفیظ خان نے انہاں کوں اپنا موضوع بنائے۔

حفیظ خان دا سبھ توں وڈا کمال اے ہے کہ انہاں عام لوکیں دے مسائل خود انہاں دی زبان وچ بیان کیتن۔ اوندی وجہ ایہ وی تھی سگدی ھئے کہ انہاں کول عام بول چال دے لفظاں دا بہوں وڈا خزانہ موجود ہے۔ تے انہاں کوں لفظاں دے استعمال دا فن وی آندے۔

حفیظ خان دے افسانے بارے پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی لکھدن!

''حفیظ خان دے افسانے پڑھ تے احساس تھیندے کہ سرائیکی افسانہ اگوں تے ٹُرپئے''۔

حفیظ خان دی کتاب ''ویندی رت دی شام'' دا پہلا افسانہ ''قابل'' ہے ایں افسانے وچ افسانہ نگار نے جنس تے نفسیاتی مسئلے کوں بیان کیتے۔ عام طور تے سرائیکی افسانہ نگار بہوں گھٹ ایہوجئے مسائل پیش کیتن۔ اردو وچ منٹو تے عصمت چغتائی دے بے شمار افسانے ہن جیندے وچ جنس کوں موضوع بنایا گئے۔

انسان دے ڈھیر سارے خواب ہوندن انسان انہاں خاباں دی تعبیر منگدے۔ بعض اوقات کہیں مجبوری دے تحت انسان دے خواب پورے نہ تھیون تاں اوندی شخصیت وچ ہک ادھوراپن پیدا تھی ویندے۔ اوں روح دی خوشی ختم تھی ویندی ہے۔ او ہک سکی سڑی ٹنگلی والی کار خوشی تے مسرت دے شگوفیاں کوں ترسدا رھندے۔ ایہو احساس محرومی اوندی موت دا سبب بن ویندے۔ حفیظ خان اپنے ایں افسانے وچ جسمانی پسماندگی کوں موضوع بناتے ہک انتہائی نازک موضوع تک قلم چاتے۔ اے المیہ جیڑھے جمیل اختر دی خانگی زندگی وچ اپنے چھنے پوڑیندے تاں سبھ کجھ سڑتے سُوا تھی ویندے۔ اوندی ذات ہک کیری دی مٹھ بن ویندی ہے اتے ایں کیری وچ زندگی دی کوئی چنڑگ دی گول توں مایوس تھئی، جمیل دی ذال اپنے واسطے جیون دا ہک نواں رستہ تلاش کریندی اے تے او خود نیلا تھوتھا کھاتے خودکشی کر گھندے۔

حفیظ خان دا سبھ توں وڈا کمال اے ہے کہ او کردار دے عمل دے ذریعے پوری کہانی کوں ڈیندن۔ چاہے اُو کردار مونہہ توں کجھ وی نہ بولے لیکن او جیہڑھا عمل کریندے قاری کوں اویں محسوس تھیندے جیویں پوری تصویر اوندے سامنے آ گئی ھووے۔ مثلاً ایں افسانے وچ مختلف جائیں ایسیاں آندن۔

”تیلی دی اے عادت ھئی جو گلی محلے دی کہیں ننگر نال ٹا کرو تھی ونجے ہا تاں اوکوں نوا تے ہک پاسے تھی ویندا۔“

”ہک قانون اساڈے کول ای بن ونجے ہا تاں بس ـــــ حرا ـــــ ای آ ونجے ہا ـــــ ساڈے جیہاں دی تاں عید تھی ونجے۔“

”نصیب تاں میڈے سڑ گئین جو مردے دے پلے پئے گئی ہاں۔ سارا ڈینہہ ٹل وچ جتی راھندی ہاں تے صلے وچ لعنت ملدی ہے۔“

”رشیدہ رووݨ لگ پئی۔ اماں میں کیا کریندی اوا وتاں شروع کتوں ای شادی دے قابل کائینا ہا۔“

حفیظ خان انسانی نفسیات کوں بہوں چنگی طرح جانڑدے ہن لہذا انہاں نے انسان دی نفسیات کوں بیان کیتے۔ انسانی رویئیاں دی کشمکش آپنے کرداراں دے ذریعے بیان کیتی اے انہاں دا افسانہ ”تن من سیس سریر“ ہک نمائندہ افسانہ ہے۔ جیندے وچ انہاں مرد دی نفسیات کوں بڑی خوبصورتی دے نال واضح کیتے۔ ایندے وچ ہک ایہو جئے مرد دی کہانی بیان کیتی اے جیہڑھا حسن پرست ہوندے اور اوندی خواہش ہوندی اے کہ اوندی ذال وی سوھنی ہووے پر اوندے خوا باں دی تعبیر نہیں ملدی۔ اوندی بیوی بڑی بدصورت جئی ہوندی ہے گو او کجھ عرصے بعد مر ویندی ہے۔ بس اوکوں پتر دی پرورش کرنی پے ویندی ہے۔ لیکن ہر سوہنی چھوکری اوندی کمزوری ہوندی اے۔ ایں حد تک کہ او بڑھاپے وچ قدم رکھیندے۔ اور ہک وقت ایسا آندے کہ اوکوں اوندے خواباں دی شہزادی مل ویندی ہے۔ پر اوندی نونہہ دی صورت وچ۔ ایں افسانے دا سبھ توں وڈا المیہ جیہڑھا افسانہ نگار نے بیان کیتے او کردار دی کشمکش ہے۔ انسانی نفسیات کوں افسانہ نگار زبردست طریقے نال بیان کیتے۔ مثلاً:

”رب سایاں ساریاں سوہݨیاں عورتاں شہر وچ کٹھیاں کر چھوڑے ہم اتہاں وچوں ہک اودہ میڈی وتی نچ ڈیویں ہا۔“

"ایہا تانگھ تکھیندے ۔ ویہہ سال گزر گئے ...... ہر شئے تے بڑھیپے دا راج ہا۔ پروانداں سوچاں اونویں دیاں انویں جوان ہن ۔ اونداں اکھیں وچ چمکار وی اونویں ہا۔ کہیں ننگر کوں ڈیکھدا تاں دل دے نال نال اوندا بت وی ڈکن لگ پوندا۔"

"مراد سویرے سویرے اٹھی تے وستی دے ٹوبھے تے ونج بہندا ہا۔ جتھ وستی دیاں ننگریں پانی بھرن آندیاں ہن ۔" اوانہاں دے سر تے ہتھ پھریندا چیل توں ویں گھن ونجے ہا، جتھوں ننگر دا بت نویں پوڑی چڑھدے پر ایں توں اگوں اوندا بڈھا بت ڈک ڈک کے ارداساں کرن شروع کر ڈیندا......"

اگوں ونج تے افسانہ نگار نے انسانی نفسیات تے اوندی نفسانی خواہش کوں بیان کیتے ۔ تے رشتیاں دے احترام دے درمیان ہک کشمکش سامنے آندی اے یعنی اساڈے معاشرے وچ نونہہ تے سوہرے دے درمیان جیڑھا پاکیزہ رشتہ ہوندے بعض اوقات نفسانی خواہش اوں رشتے تے حاوی آون دی خواہش کریندی ہے یعنی نفسانی خواہش اتنی شدید ہوندی اے کہ او رشتیاں کوں وی نہیں ڈیکھدی اتھاں افسانہ نگار نے ضمیر تے انسانی خواہش دے درمیان چھک تان تے جنگ ڈکھائی ہے۔

"بڈھا مراد سولی تے لٹکیا کھڑا ہا۔ اوندی حیاتی دا خواب جیندے خیال وچ اوں نے زندگی گزار ڈتی جیندی سک وچ اوں جوانی دیاں سکاں کوں مندھ چھوڑیاں ہا سکھاں دے دیس وچ اُوندے سامنے بے سدھ پیا ہا۔"

جتھاں حفیظ خان نے انسانی نفسیات جہے وڈے وڈے موضوعات تے قلم چاتے اتھاں معمولی جہے واقعات عام گھریلو جھیڑے ہر گھر دا مسئلہ ہن انہاں کوں وی موضوعات بنڑائے۔ ہک افسانہ "مائی بڈھڑی دا گھوڑا" اے ہک عام جہی کہانی ہے کہ عورت کہیں طرح مرد دی ذات تے شک کریندی رہندی اے ۔ ایں کہانی وچ افسانہ نگار نے مرد دا المیہ بیان کیتے ۔ کہ جڈاں مرد دی بیوی شکی ہووے اوں مرد دی زندگی عذاب بن ویندی ہے۔ ایں افسانے وچ افسانہ نگار "تڈے" کوں بنیاد بنائے جیں طرح "تِڈے" دی مادہ اوکوں آہستہ آہستہ کھا ویندی ہے تے اونکوں پتہ وی نہیں لگدا۔ ایویں عورت مرد کوں ختم کر چھڑیندی ھے۔ مرد دیاں چھوٹیاں چھوٹیاں سکاں وی بعض اوقات بیوی پچھوں قربان کرنیاں پوندن ۔ ایں افسانے وچ مکالمے بڑے شاندار ور تے گئین ۔ تے ایویں

لگدے جوڑو میاں بیوی آمنے سامنے بہہ تے بولیندے بیٹھن۔

''ہا......ایڈی وی بھولی کائینی میں سبھ سمجھدی ہاں ساری منافقت ہے۔میں،میں جیں ویلے ایں گھر وچ آئی ہم یاد ہے میڈا روپ سنگھار تے ہن میڈی تاں رت پی گھدی اے تہاڈے گھر نے۔پہلی ڈوڑا......ایوں ہم......''

''کیا آکھے وے گل وچ پئی گیاں ہاں۔ہا ہن تاں گل دا گلانواں بنساں تے اوموئی دولو فرزانی بندی جو دماغ تے چڑھی ودی ہے۔ہک دا گھر اجاڑیس۔طلاق گھدی ہس تے ذلیل کمینی ہن میڈے گھر کوں تکی بیٹھی ہے۔''

''ڈیکھ بیگم......میکوں جو کجھ آکھیں......آکھ گھن......پر کہیں بئے دی دھی بھین دے اتے ناحق الزام تراشی مناسب کوئینی۔''

حفیظ خان دی ایں افسانہ نگاری دے متعلق پروفیسر عامر فہیم آہدن!

''حفیظ خان دے قلم وچ اے طاقت ہے جو کردار نگاری ویلھے نکے نکے جذبات کوں وی اپنی اکھ توں اوڈھرنی تھیون ڈیندا۔مشاہدے تے اوندی گرفت ہے، کردار دی سیرت بیان کریندے ہوئے او اوندا پورا سراپا بیان کر ڈیندے۔''

حفیظ خان دے افسانیاں وچ زندگی دا احساس واضح طور تے نظر آندے انہاں دے افسانیاں وچ جیڑھے کردار ہن او اپنی اصل صورت وچ اساکوں اپنے اردگرد جیندے جاگدے نظر آندے ہن۔انہاں دا ہر کردار اپنی جاء تے علامت ہے ہک اشارہ جیڑھا حفیظ خان دے مقصد دی ترجمانی کریندے۔

حفیظ خان بڑی خوبصورتی نال قاری دی توجہ اوں پاسے گھن ویندے، جیڑھے پاسے کہیں دا کڈاہیں دھیان نہیں گیا ہوندا۔انہاں دے افسانیاں کوں پڑھن دے بعد احساس تھیندے کہ اے چیز تاں بڑی اہم ہئی۔انہاں دے تمام افسانیاں دے کردار بڑے مضبوط ہن۔انہاں دا ہک افسانہ ہے ''بوتے''۔اے بہوں سوہنا افسانہ ہے۔ایں افسانے وچ سسپنس تے خوف پیدا کیتا گئے۔ایکوں پڑھدے ہوئے بت دیاں کنڈیراں کھڑیاں تھیون لگ پوندن۔خوف تے ڈر دی ایں کیفیت دا احساس لکھاری دے فن تے منظر کشی دا کمال ہے۔ایں افسانے وچ افسانہ نگار نے ہک پاسے ایہو جئے سنسان علاقے دی منظر نگاری کیتی ہے کہ اتوں رات دا اندھارا۔ایہو جئی خوف ناک کیفیت پیدا کیتی

قاری دے رونگٹے کھڑی تھی ویندے ہن۔ ایں افسانے دا مرکزی خیال اے ہے کہ دنیا ہک اجاڑ روہی ہے جتھاں قدم قدم تے بھل پوون دا ڈر ہے۔ جو مسائل دے اچے اچے ٹبے ہن۔ روپے دی روح جیہاں خوفناک دنیاوی ڈائین دے چمبڑن دا الکا ہے، نرواری دا اندھارا ہے گرمی ہے تریہہ ہے، اگر انسان انہاں طاقتاں تلے دب تے حوصلہ ہار بہے تاں زندگی موت دا روپ وٹا گھندی ہے۔ جے انسان ہمت کرے تاں اوکوں اپنی منزل مل ویندی ہے۔ ایندے وچ ڈو کردار ہن ہک مایوسی نا امیدی بے ہمتی دی علامت ہے تے جیندا اختتام موت ہے۔ تے ڈوجھا ہمت حوصلہ جدوجہد دی علامت ہے۔ جیکوں اوندی منزل مل پوندی ہے۔ ایں افسانے وچ منظر کشی بہوں شاندار ہے بنیادی طور تے اے ہک تاثراتی افسانہ ہے جیندے وچ ماحول دے ذریعے خوف پیدا کرن دی کوشش کیتی گئی ہے۔

"جیپ نے ہک ڈو قدم بئے بھرے ہک بیابوتا پیا ہویا نظر آیا۔ رضوان دا دل سینہ تروڑ تے باہر آون لگا۔ ول تیزی نال تلے لتھا۔ اے لاش ہئی الطاف دی۔ لگدا ہا جیویں روہی دے دیہہ نے اوندا ساہ پی گھدا ہووے۔ رضوان دیاں اکھیں وچوں ہنجوں وہے کہ الطاف دے ہوٹھاں نے آڈ ٹھے۔ او بولیا"۔ "دوست زندگی تاں مقصد دا ناں ہے، جستجو دا ناں ہے تے جے اے وی نہ ہووے تاں اساں کیا ہئیں۔ مٹی دے بے جان بوتے ہئیں......"

سچا ادب او ہوندے جیڑھا آپنے وسیب دی عکاسی کرے۔ جیندا تعلق اپنے وسیب نال نہ ہووے او بے مقصد سمجھیا ویندے۔ تخلیق اُوہا سمجھی ویندی ہے جیڑھی اپنے لوکیں دے ڈکھ سُکھ بیان کرے تے اپنی زبان وچ کیتی ونجے۔

حفیظ خان ایں لحاظ نال ہک کامیاب افسانہ نگار ہے کہ انہاں سرائیکی تل وسیب دے حوالے نال اپنیاں تخلیقات سرائیکی ادب دی جھولی وچ پاتن۔ انہاں دی مشاہداتی اکھ بہوں سُجاک تے سوِجھل ہے۔ او وسیب دیاں محرومیاں بے نرواریاں کھپاریاں تے وسیبی لاہی چاڑھی کوں بہوں کولوں کنوں ڈیکھدن، اوندا تجزیہ کریندن انسان دیاں خواہشاں، امنگاں، آرزواں، سکاں کوں بیان کرن دا انہاں کول ہک خاص انداز ہے۔ جیڑھا انہاں کوں ڈوجھے لکھاریاں کنوں منفرد حیثیت عطا کریندے۔

جتھاں حفیظ خان دے کجھ کردار سماجی بجھ ترٹ دا نفسیاتی اظہار ہن اتھاں نویں سماج دے آغاز

تے تعمیر کیتے نویں جذبے نال سرشار کرداروی ملدن۔ جسمانی نقص دے باوجود ''اپا پیپ'' ہک باہمت تے حوصلہ مند کردار ہے۔ جیڑھا آپنی کمزوری کوں مسئلہ نہیں بنڑیندا۔ بلکہ جدوجہد کریندے تے اپنی ذات دی تکمیل اللہ ڈیوائے دی شکل وچ کریندے لیکن آخر وچ رووی پوندے۔ ایہ ہجوں اوندیاں محرومیاں دے خلاف کوشش وچ کامیاب وی تھی سگدن۔ تے انہاں ناکامیاں تے ادھوریاں خواہشاں دا پورانہ تھیون دی وجہ وی۔

''شادی تھی گئی سب آئے گئے تھی گئے تاں روز آلی کار آیا پیپ بنے تے پہنچیا۔ اج اوندے نال ڈوایا تے اوندی ذال ہئی، اونے نہر دے اوں پار ڈٹھا تاں روپیا۔ پٹکے دے پاندنال اکھیں پونجھ تے پتر نے نونہہ کوں سینے نال لاگھدس تے آکھن لگا ''پتر اج میں خوشی کنوں روپیاں۔''

ایویں لکی دا کردار ہک معصوم تے زندگی نال سچی محبت کرن والا ماما دے جذبے نال سرشار ہے۔

''تیلی پہلوان ہووے، بھانویں رشیدہ نسیم ہووے بھانویں لکی، مولوی عبدالقدوس ہووے تے بھانویں حور بی بی، جام مراد ہووے تے بھانویں اپا پیپ، سبھ کردار توڑیں معذور ہوون تے توڑیں جنسی عدم تسکین دا شکار، زندگی دے تسلسل کوں قائم رکھن کیتے فطری تقاضیاں توں اگوں نہیں ٹپدے اونکوں ہر حالت وچ قائم رکھن دی کوشش کریندن''۔

حفیظ خان دے تمام افسانیاں کوں پڑھ تے اندازہ تھیندے کہ انہاں کردار نگاری تے زیادہ زور لاتے۔ انہاں دچ کتھائیں وی تصنع نظر نہیں آندا۔ او حقیقی ہن اساڈے اردگرد دے ہن۔ ساڈے دسیب دا حصہ ہن۔ حفیظ خان سرائیکی افسانوی ادب وچ ہک کامیاب افسانہ نگار ہن۔

O

(سرائیکی افسانے دا فنی ویورا'' صفحہ 145 تا 154، مطبوعہ 2007ء)

امر افسانیاں دا خالق: حفیظ خان

ظفر الاشاری

سیانیاں دا آکھن اے کہانی ایں کائنات اچ انسانی ہُر چلے دے نال ای ہوند وچ آ گئی ہئی، جڈن ایں دنیا دے اصلوں پلیٹھے ڈینہاں وچ کہیں انسان نے اپنی ہڈ بیتی چوچوڈاں وچ سنائی ہوسی۔ ہڈ بیتی کنوں جگ بیتی دا پندھ شروع تھیا تے ول ایہو جیہاں گالھیں سُنڑن سناوَن اوں دور دے رل بیٹھے لوکاں دا وطیرہ بن گیا۔ ویلے رخ روا ب بدلایا تاں سوچ اچ وی تبدیلی آئی فکر اُتو نہی تھئی۔ خیال دگھرے، ابلاغ دے دائرے مو کلے تھئے تے اظہار دے پینترے بدلن شروع تھی گئے۔ لوکاں دے دھیان دیاں راساں اپنے بیان ڈو موڑن سانگے، حال حویلے کوں مرچ مصالحہ تے دھڳاری لاون دا رواج پیا۔ عام موہانیاں گالھیں وچوں نکے نکے قصے پھُھڑوے تے ول قصیاں دگھرتے ونج ویند دا ستاناں دی شکل وٹا گھدی۔ ہوا وچ اڈ دیاں مخلوقاں، دیہہ، جن، بھوت، پریاں تے زور بادشاہاں دے گنجڑے ہوئے تذکریاں دے ول کھلیند یاں کوڑیاں داستاناں حقیقت پسندی دا روپ وٹایا تے ایں جیندی جاگدی دنیا دے بھجدے درکدے، کھلدے روندے انساناں دیاں محبتاں، نفرتاں، محرومیاں، مجبوریاں، ڈکھ سکھ تے ڈوجھے مسائل نال چتری ہوئی لمبی کہانی کوں ناول دا ناں ڈے ڈتا گیا۔ ناول ہک لمبے عرصے تائیں لوکاں دے ذوقِ قرأت تے حکومت کیتی پر آبادی ودھن دے نال نال جیویں مسائل ودھے، لوڑاں ڈوڑیاں تھیاں، تاں ویلہ سُسن شروع تھی

گیا۔ وقت دا تانا پیٹا ڈیہنوں ڈیہنہ سنگوݨ کار، سر کھڈن دی واندنہ رہی تاں بھیکن ناولاں دی بجائے نکڑی کہانی دی ریت ٹُر نکلی۔

افسانہ نثر وچ قصے دی مختصر تے نویں نکور قسم ہے جیندے وچ قصولی قلم دی پُنج نال ویلے دا سیڑ چھلور تے موجودہ دور دے انسان دے مسائل نشابر کریندے۔ افسانہ دنیا دیاں ساریاں زباناں وچ کڈوکناں لکھیندا اپئے تے ہمیشہ لکھیندا رہسی پر سرائیکی افسانہ سن سٹھ دے ڈہاکے وچ باقاعدگی نال لکھیجن شروع تھئے تے ایں ویلے افسانہ، سرائیکی ادب دی سب توں سلوݨی، مَن چھیندی، لوک پسند تے سب توں زیادہ پڑھی ونجن والی صنف ادب ہے۔ سرائیکی ادبی ہاٹھ وچ افسانہ سنگر پنگر تے آون والی بھانویں جو ہک نویں سوکھڑی ہے پر بقول ڈاکٹر نصر اللہ خان ناصر:

"سرائیکی نثر دے پندھ" تے پاڑاں بہوں پرے تائیں کھنڈیاں ہوئیاں ہن لیکن افسانے دیاں مسافتاں مختصر ہووݨ دے باوجود ایندی بُکل وچ اوساریاں چنگائیاں موجود ہن جیہڑھیاں ایں صنف ادب دی جان سنجان سمجھیاں ویندیاں ہن۔"

ڈٖھاونجے تاں ڈھیر ساری ہتھ سوڑ تے گھٹے نپے وسائل دے باوجود سرائیکی افسانے ڈھیر سارا پندھ نبیڑے۔ کل تائیں ساڈے کول ہاوی کیا۔ چھڑی سرائیکی ادبی مجلس بہاولپور تے ملتاں منوتیاں نال چھپدا اُوندا "سہ ماہی سرائیکی" یا عمر علی خاں بلوچ دا مہینے وار "سرائیکی ادب"۔ ریڈیو سٹیشن تا ڈوہیں بعد وچ آئے جتھاں افسانہ نگاراں کوقسمتی واری ملدی ہئی۔ ذرائع اشاعت و ابلاغ دی تھوڑ پاروں قاری وی اُٹے اچ لُون دے برابر ہَن۔ انھاں ساریاں کمیاں کوتاہیاں دے باوجود سرائیکی افسانے ایں ادھی صدی دے پندھ کوں پورے اُشاک قدماں نال جھاگے۔ غلام حسن خان حیدرانی، اختر بلوچ تے تحسین سبائے والوی کنوں گھن تے اچ دی گھڑی تائیں افسانہ نگاراں دی ہک دکست موجب بلھا نگاں مریندی نظر آندی اے۔ ایں وہر دے موہری پیرڑیاں وچ ہک جانیاں سنجانیاں تے مہر لگاناں حفیظ خان دا وی ہے۔

حفیظ خان ڈھیر سارے خوبصورت افسانیاں دا خالق قلمکار ہے۔ اردو افسانیاں دے علاوہ انہاں ہن تائیں پنجھاہ توں ودھ آلو آل دے سرائیکی افسانے لکھن تے اتنی سوہنی ڈھاوں ڈھک نال لکھن

جوہرافسانہ ڈوجھے کنوں اُترمنگدے۔ حفیظ خان جہیں افسانہ نگاراں دی ذات سرائیکی ادب واسطے اللہ سیں دا بہوں وڈا انعام ہے۔ ایہہ اُنہاں لوکاں وچوں ہن جنھاں ان سونہیں راہاں دی بُلبن اچ بانبڑو بوندے افسانے دی انگل پکڑ تے ٹرن سکھایا تے اپنی واجبی شکل صورت پاروں، شرموں کچھاں اچ منہ لکھیندی، ایں میلی کچیلی صنف دا سیندھ سرمہ کر، ون سونے موضوعات دے بسمے غازے لا، بھِنے ہوئے لفظاں دیاں رنگ برنگیاں چولیاں چُنیاں پوا تے وڈی کیٹر نال قدم اگونہے ودھاون داماں بخشیا۔

حفیظ خان ہک پڑھیاں گڑھیا تے سیانا سَوّڈھا انسان ہے۔ اوندی تعلیم اوندی سوچ دے گوپیاں کوں شعور دے چوپے ڈے چمکائے۔ اوندی فکر کوں نویں پر، نویاں پروازں ڈے تے انگاساں تے چڑھائے تے اوندی اوں فکر اوندیاں لکھتاں کُوں اوندے آڑے پاڑے تے رل وسدیاں دے تخلیقی پورھے اچ نہ چھڑا انشا بر کیتے بلکہ گھ چیہ اُجاوی کر چھوڑے۔ حفیظ خان ہک افسانہ نگاروی ہے تے ڈرامہ نگاروی۔ آپ کڑا کے دار کالم وی لکھیندن تے شاعری وی کریندن۔ ایہہ تبصرہ نگاروی ہن تے سرکاری دی طرفاں لوکاں دے جھیڑ یاں جھٹیاں دانیاں چکاون والے منصف وی۔ ایہہ منصفی بھانویں جوانہاں دی روٹی روزی دا مسئلہ ہے تے انہاں دی شاعری وی پردے دار بی بی وانگوں زیادہ گھنڈ اچ رہی اے پر انہاں ڈونہاں دا حفیظ خان دی نثر کوں دھو مانجھ نے نکھارن اچ وڈا ہتھ اے۔ ججی نے جے کر کہیں مسئلے کوں وچورن، وِلی وِلی کرتے پرکھن تے اوندے تَل تائیں پُج تے اوندا انت لہن دا شعور بخشے تاں شاعری دے ادراک نے اوندی گالھ کوں ہک خاص ترکیب ترتیب نے نویکلی اُٹکل ڈے تے چسولہ بناڈتے۔

''ویندی رُت دی شام''، ''اندر لیکھ داسیک''، ''حفیظ خان کی کہانیاں''، ''یہ جو عورت ہے''، ''کوئی شہریں جنگل کوکدا''، ''کچ دیاں ماڑیاں''، ''اس شہر خرابی میں''، ''رُٹھڑے پندھ''، ''خواب گلاب''، ''کچ دیاں ماڑیاں''، ''ماما جمال خان''، ''پہلی شب تیرے جانے کے بعد''، ''رفعت عباس کی سرائیکی شاعری''، ''خرم بہاولپوری'' تے ہن ''جج صادق'' دی ترتیب و تشکیل ایں عطا دے خوبصورت تے ہر دل کوں بھاونے شہکار ہن۔ حفیظ خان دی کہیں وی نثری صنف کوں چاؤ، چس ہکو سویں آندی اے۔ افسانہ، ڈرامے کنوں اُترمنگدے۔ ایں پاروں جو اوندا ڈرامہ، افسانے کنوں چنگا ہوندے تے

اُنہاں دے ڈرامے وچ افسانہ ہوندے تے افسانے وچ ڈرامہ ہوندے۔ قاری انہاں دا ڈرامہ
افسانہ پڑھدیاں ویلے ہٹہ مزہ چیندے۔ میکو حفیظ خان دے ڈرامے وی چنگے تاں لگدن کیوں جو حفیظ
خان سرائیکی دے موہری ڈرامہ نگاراں وچوں ہن۔ انہاں ڈرامے کوں ہک نواں راہ عطا کیتے تے ایہ
پہلے ڈرامائی مجموعے ''کچ دیاں ماڑیاں'' دے صدارتی ایوارڈ یافتہ مصنف دامان وی رکھیندن، پر ہک
گالھ ایہہ ہے جو میڈا روح انہاں دے افسانیاں وچ زیادہ لگدے۔ پچھلے چالھی سالاں توں میں خود وی
سرائیکی افسانیاں وچ ٹُتھ مُتھ کریندا آنداں۔ افسانہ لکھیا وی ڈھیر سارا ہے تے افسانہ پڑھیا وی لکھ
بھگ سارے افسانہ نگاراں دا ہے پر حفیظ خان دے افسانے میکوں ہاں دے وچ بھاندن۔ ایں پاروں
کائناں جو حفیظ خان میڈا دوست ہے، ایں پاروں وی کائناں جو او ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ہے تے
میکوں کہیں نیہاں وچ انہاں دی وٹب دی لوڑ پوسی۔ بھل ایں سانگوں جو میکوں آپ کوں اینویں اُڈیل
دی حدتک افسانے دی سنجان ہے۔ ایندے نال چھتریں لا دا گانڈھا ہے۔ افسانے دی بسم اللہ توں گھن
تے ہن تائیں دی پندھ ویہائی دا میں عینی شاہد ہاں۔ سرائیکی افسانے دے ایرے میڈے سامنے رکھے
گئن۔ ایکوں سوہنیاں بنبٹیاں والی ماڑی دی شکل کیویں ڈتی گئی اے۔ ایندی اُساری وچ کہیں کہیں
حصہ گھدا۔ کہیں کتنا کم کیتا۔ کتنا عرصہ کم کیتا تے کتنی اہر نال کیتا۔ ایندا وی میں اکھیں ڈٹھا گواہ
ہاں۔ سرائیکی افسانے دا سمورا ماضی میڈی دید وچ اُکریا کھڑے۔ ایں گالھوں میں پورے اعتماد نال
آکھ سکداں جو حفیظ خان دا افسانہ سرائیکی افسانیاں دامان ہے۔

قاری دے دل دماغ وچ مٹھا مٹھا جلول کریندے، حفیظ خان دے، افسانیاں دا سب توں وڈا
وصف ایہہ اے جو ایہہ اپنے تل وسیب دے مسائل دا اولنا ہوندن۔ وسیب دی عام ورتیندی زبان وچ
ہوندن تے قاری دی ذہنی سوچ دے لانویں سانویں ہوندن جھاں کوں پڑھیدیاں ویلے قاری ہک
عجیب جاہیں چس محسوس کریندے تے پڑھن دے بعد ایندے بارے دیر تائیں وِپرے وات وی
رہندے، نی تاں ہک ویلہ او وی آ گیا ہا جو ریسل ذہناں جدت پسندی دے شوق پاروں ایکوں
تجریدی آرٹ دج گنجڑیا ہو یا نمونہ بنا چھوڑیا ہا تے ایکوں لنڈے دیاں لتھاں لہویاں، سُنیاں
سنگویاں چوتکیاں پواتے نہ صرف کہیں سرکس دا گھٹرا جو کر بنا ڈتا بلکہ ہک نہ سمجھ آون والی بجھارت

اچ بدل ڈتا۔افسانے وچوں کہانی وان وٹینڈی گئی، چھتڑے لفظ باقی آ بچے۔ڈھاؤں ڈھک اوپری، اندازاوپرا۔خود افسانوی مسلک دے لوگ حیران ہن جو ایں مذاق دا نتیجہ کیا نکلسی بتے دل ہر کہیں ڈیکھ گھدا جواو بھارتی افسانہ سر دے اُتوں اُتوں لنگھدا رہیا تے قاری دے ذہن وچ او مقام پیدا نہ کرسکیاں جیڑھا حفیظ خان، اسلم قریشی تے مسرت کلانچوی دے افسانے کوں نصیب تھیا۔

ہر علاقے دیاں اپنیاں جغرافیائی لوڑاں ہوندن۔اوندی دھرتی، اوندا ہوا پانی، اوندا ماحول، اوندی ثقافت، اوندی وسوواں تے اوں وسوواں دی زبان۔سرائیکی افسانہ نگار پہاڑاں، گلیشر اں، وادیاں یا ساحلاں تے سمندراں دی گھٹ گالھ کریندے۔او کریندے تاں تھل، روہی، ریت، تریہہ، گوپیاں گریڑیاں یا وت جاگیرداری نظام تے طبقاتی اُچ جھک دی گالھ کریندے تے حفیظ خان دے افسانے انہاں جغرافیائی لوڑاں دا منہ مکھیندے نظر آندن۔اپنی دھرتی دے سارے تقاضے پورے کریندے ڈسدن۔پروفیسر عامر فہیم دے آکھن موجب جو:

> ''حفیظ خان دے افسانے ساڈے وسیب دے افسانے ہن جنھاں دے کرداراں کوں اساں اپنے چار چوفیرے ٹردے پھردے، الکیندے، بلیندے ڈیکھدے ہیں۔انہاں کرداراں اُتے انہاں دی گرفت انہاں دے مشاہدے دا پکا پکا ثبوت ہے، ایہہ افسانے سرائیکی ادب وچ یقیناً ہک بہوں اہم کردار دے حامل ہن تے قاری تے آون والے افسانہ نگاراں تے یقیناً اثر چھوڑین'' واقعی حفیظ خان دے افسانے دا اج دے افسانے نگار تے گہرا اثر ہے۔اُوپری تکنیک دی بجائے حفیظ خان دا ہچکلگ بنن وچ فخر محسوس کریندے۔''

ایہہ درست ہے جو کہیں وی زبان دے لفظ اوندے بولن والیاں واسطے ہکو سویں ہوندن۔ترتیب، ترکیب تے معنی مفہوم وی اپنی اپنی جاتے ہکو جہیں ہوندن پر اصل فن لفظاں دے استعمال وچ ہوندے تے حفیظ خان کوں بھنے ہوئے لفظ گول گول تے ورتن دا مکمل ادراک ہے۔حفیظ خان دے قلم وچ ہک سلیقہ تے قرینہ ہے۔او ہک جڑیے دی مثال ہے جیڑھا ہر گھو گہنے واسطے مُجو دے چھکدے نگاں دی چون کرتے وڈی مہارت نال جڑیندے۔اُنہاں اپنے افسانیاں دے ابلاغ واسطے جیڑھی زبان ورتی اے تے جیجھے اسلوب دی چون کیتی اے، میں بغیر کہیں رورعایت یا وٹب

دے اکیساں جوایہہ روایت کنوں ہٹ تے ہے۔ انہاں پہلی واری سرائیکی افسانے کوں اتی سلونی تے مرکئی زبان عطا کیتی اے۔ ساڈے پاسے افسانے دا مزاج ہمیشہ گک مک، رکھاڑ کھاتے ایندے متھے تے تریڈھی رہی اے پر حفیظ خان اوں روایت دے سارے بُت تروڑ تے جمل جہان دیاں سُرکاراں اپنے افسانیاں دے لفظ لفظ اچ سترھ ڈتن۔ انہاں دے او لفظ کگھاں کچھاں اچ گُرکالیاں کڈھیندیاں انہاں انگیں دی مثال ہن جنہاں دے جلول تے سُرکار پاروں بندہ بے وس تھی تے مُرک پوندے۔

"مزاجاً تیلی بہوں کھر اہا، کہیں دی کیا مجال جو کوئی دکان دے اگوں لنگھے تے تیلی نال سلام دعا کیتے بغیر لنگھ ونجے۔ ایں بٹ کڑاک تے آدھر بھاوچ وکری گھٹ تھیندی تے آوَجی زیادہ پر تیلی پہلوان دیاں مہمان داریاں وھدیاں ویندیاں ہن۔ اوندی دکان تے وزیراعظم دے اختیارات کنوں گھن کراہیں گلی اچ بوہاری ڈیون والی جمعدارن دی جوانی توڑیں ہر شے کھلم کھلا زیر بحث آندی۔ جتھاں آلواں دی مہنگائی دا تذکرہ تھیندا، اتھاں نکر آلے مکان دی کرایہ دارن دیاں گلہاں دی سرخی وی موضوع ہوندی تے ایں سارے بحث مباحثے وچ تیلی سپیکر دے فرائض سرانجام ڈیندا۔ لسی ولڑیندے ولڑیندے اجھی اجھی رولنگ ڈیندا کہ یا تاں شور مچ ویندا تے یا دل چُپ تھی ویندی۔ تیلی رولنگ ڈیندے ویلے کہیں رول آف بزنس یا ضابطے دا خیال نہ کریندا۔ جئیں ویلے دل کیتا کہیں تحریک التواء دا مکھن کڈھ چھوڑیا یا موڈ بنیاں تاں وڈے کنوں وڈے مسئلے دی ڈدھ پتی بنا ڈتی۔ ہک دفعہ بحث تھئی جو لیڈی ڈیانا کیڑھے رنگ دا انڈر ویئر پیندی ہے۔ بس ول کیا ہا۔ دنیا دے سارے رنگ ہک ہک کرتے مک گئے پر ایہہ طے نہ تھیا کہ ڈیانا دے انڈر ویئر دا رنگ کیڑھا ہا کہ یکدم تیلی بولیا۔ بابے او کیوں شور مچیندے او۔ لیڈی ڈیانا انڈر ویئر پیندی ای کائنی۔" (افسانہ "قابل")

آہدن تحریر دا اصل لطف اوندے عنوان وچ ہوندے۔ عنوان ای کہیں لکھت دا مختصر ترین خولاصہ تے تعارف ہوندے۔ حفیظ خان دے افسانیاں دے عنوانات وی بہوں دلکش تے معنی خیز ہوندن۔ اکثر عنوانات بذات خود ہک تلمیح ہوندن جھاں دے اولے وچ ہک مکمل کہانی آلساں کھڑی

جیویں جو ''مائی بڈھڑی دا گھوڑا''۔ ایں افسانے وچ بندے دی اندرون خانہ گزر بھندی ہوندی اے
گزران تے سوجھلا پاتا گئے۔ ذال پئے دا رشتہ ڈھاوے نجے تاں بہوں سلونا، محبتاں بھریا تے ساریاں
مونجھاں لہا ڈیون والا رشتہ ہوندے۔ راز داری والا رشتہ ہوندے۔ سارے تھکیڑے دور کرڈیون
والا۔ ذال کھل تے الاوے تاں حور نئیں تاں بلدا تنور۔ احساس چھالے چھالے تھی ویندے۔ ان
تھنی گزران والی وی بھلا کوئی زندگی اے۔ جیویں تنجن اچ لپ ریت دی چا سٹو۔ نری کریای
کریز اٹھنے ویلے رکر رکر۔ اٹھدیاں بہندیاں طعنے، مینہڑیں، سٹھڑیں، شک وشکوک، رُس رنج،
جیویں ہر ویلے دی کُرکُرکُنی دا پانی سُکا ڈیندی اے، اینویں گھر دی وَرلن دے اندر دیاں خوشیاں کوں
وی رڑک ویندی اے۔

''ہا۔ ایڈی وی بھولی کائنی میں، سب سمجھدی ہاں۔ ساری منافقت ہے۔ میں
جئیں ویلے ایں گھر وچ آئی ہم، یاد ہے میڈا روپ سنگھار تے ہن میڈی تاں رت
پی گھدی ہے تہاڈے گھر نے۔ پیلی ڈُڈا۔ اینویں ہم، گلھاں وچوں رَت وٹیندی
ہئی۔ خواب ڈٹھے ہم شادی دے بعد عیش عشرت دے۔ ساوی سوکھی ہوساں۔
نوکر چاکر ہوسن۔ کُٹھڑے تے بہہ تے حکم چلسیاں پر تھیا کیا۔ کوئی کرای تاں ملد
اہے۔ ساریاں سِکاں دل وچ رہ گیاں تے میں وی اُنہاں سکاں آلی کار کُرڑ تیج
گئی ہاں۔'' ذال میڈی نے ہن رووݨ والے ہتھیار نال یکا یک برسٹ مارن
شروع کرڈتے.....'' (مائی بڈھڑی دا گھوڑا)

حفیظ خان دا آکھن اے جو تن تانی تاں ہر کوئی ڈیہدے پر من وچ جھاتی کون مریندے۔ ایہہ
گالھ اپنی جاچ ہوسی پر حفیظ خان دی ایہہ آپ دی عادت ہے جو اپنے افسانیاں دے کرداراں دے من
وچ جھاتیاں پاتے انہاں دی سکریننگ (Screening) کریندے۔ اندر دیاں کیفیتاں دے رنگ،
جذبیاں دی کوڑ کبٹ، آساں دی گاتر جھات، دل وچ اُبرن والیاں خواہشاں دی ادھور، جیڑھی حیاتی
دے پھیکوی ساہنواں تائیں انسان دے خیالاں وچ چپلا مچائی رہندن، او اتنی فنی سچائی نال تحریر کریندن
جو حیرت کنوں پٹی ہوئی اکھ او تحریر کوں تصویر سمیت تخیل دی سکرین تے ڈیہدی پئی ہوندی اے۔
''مراد سویرے سویرے اُٹھے ہاتے وستی دے ٹوبھے تے ونج تے بہہ راہوے ہا جتھ

کروہتی دیاں نینگریں پانی بھرن آندیاں ہن۔ مراد کوں ڈیکھ تے او اُوندی دعا گھنن تے سر تے ہتھ پھرواون آونجن ہا۔ اُنہاں دے بھرویں جوبن تے مینہ اچ پُسی ہوئی وان دی کھٹ وانگوں چھکی تنڑیں جوانی کوں ڈیکھ تے مراد دا دل یکدم دھروکڑی لا ڈیندا تے سارے بت وچ کمباٹ پئے ویندا۔ بھنیاں ترٹیاں سکاں کوں ریل پیل کرن سانگے اُو اُنہاں دے سر تے ہتھ پھریندا اچیل تونی گھن ونجے ہاں جتھوں نینگر دا بت نویں پوڑی چڑھدے''۔ حفیظ خان ایں کردار دی اگلی کیفیت ڈسیدن۔

''چھوہر جئیں ویلے باریک بوچھن دا گھنڈ کڈھ کراہیں، مراد دے پیریں کوں ہتھ لاون واسطے آئی تاں مراد بوُ اتھی گیا۔ ایہہ تاں بالکل اوندے خواباں دے وانگ ہئی۔ روہی دی چاننی رات دی چاننی اچ دھاتی دھوتی شہزادی، اُوہا غلابی رنگت، اُوہو نک نقشہ تے بالکل اُوئیں پولی دے تانے وانگوں چھکیا چھکیاں بُت جیویں اوندیاں سوچاں بہہ لیک لیکیندیاں ہن۔ روہی دی چاننی رات نے اپنی شہزادی اِتھ آسٹی ہئی۔ مراد دیاں اکھیں دی لاٹ ہئی اُچی تھی گئی......'' (تن من سیس سریر)

انسان دے اندر وچ کہیں خواہش دا بِج پھُھڑ پووے پر اونکوں پھُل پھل نہ لگے تاں آنے بہانے احساس اچ چھیتوں پُڑ دیاں رہندن۔ انسان کہیں نہ کہیں رنگ اچ اوندی لازمی تکمیل چہندے بھانوے اوکوں سوڑے سنگاں دے جُٹیاں کوں وی کیوں نہ لتاڑ تے لنگھنا پئے ونجے۔ افسانے دے چھیکڑ دے پجدیاں تائیں جئیں ویلے جو مراد دے بڈھڑے ہتھ اوندیاں منہ زور خواہشاں دیاں لغاماں قابو نی رکھ سگدے تاں حفیظ خان دا انداز تحریر بیاوی پُر اثر تھی ویندے۔ کیا کمال دی جذبات نگاری ہے۔

''او کھٹ توں اٹھی کھڑا تھیا۔ اکھیں دے مچ اندھارے اچ بیاوی رتا رتا سیک کھنڈاون لگ گئے ہن تے اوندا بت ٹھرتے برف آلی کار تھڑکدا پیا ہا جیویں تیز اندھاری اچ سوی کھاداون لوڈے کھاندے۔ اوندی ورہیاں دی سک پوری تھیون والی ہئی۔ منزل کوں ایڈا نیڑے ڈیکھ تے مراد دا دل ٹھاکے کرن لگ پیا ہا جیندے وچ ترتیب باقی نہ رہی ہئی۔ اوندے پورے بت دا خون نچڑ تیج تے اوندیاں اکھیں اچ آ گیا۔ ڈیوے دی لاٹ بہوں ای مدھم ہئی۔ سکھاں نے نندر اچ لت مارتے

کھیس لہا گھتیا۔ مراد کوں اینویں لگا جیویں شہزادی آلساں بھیندی پئی ہووے تے
اُوندے اُتے جھکا تھیندا گیا۔ یکدم دھڑام دی آواز نے مراد دے دل کوں ہمیشہ
واسطے جھل گھدا۔ فرش تے ڈاہون آلے تھاں دے نال اوخود وی کھٹ دے نال
ڈھے پیا۔ کھڑکا سن تے سکھاں وِبل تے اٹھی بیٹھی۔ سامنے جو کجھ تھیا پیا ہا اوں نے
اوکوں بوا کرڈتا۔ وڈے دیگڑے دے نالوں بھجدی ہوئی بلی دے علاوہ، بڈھا مراد
،مویا ہویا فرش تے ڈٹھا اپنیاں ادھ کھلیاں اکھیں نال اوکوں اینویں ڈیہدا پیا ہا
جیویں حقے دے سوٹے بھریندا ڈیہدا ہا۔'' (تن من سیس سریر)

حفیظ خان انسانی رویاں دا کھوٹ تے مشاہدہ کرن دے حق وچ کائنی۔ او اکھیں بھال تے
زروئی دید نال حالات تے واقعات دے سوجھلے وچ انسان دے رویاں، اوندے اخلاقی اُچاڑ جھکاڑ،
کرداردی کیفیت تے اوندے اندر انسانیت دا مشاہدہ کریندے تے ول سب کجھ اپنے قلم دے مِلک
کرڈیندے۔ اُنہاں دا افسانہ ''جہات دے اندر گھات'' ایں حقیقت دی گواہی ڈیندے جو انسان
بنیادی طور تے خودغرض واقع تھئے۔ او اپنی لذتاں بھری غرض دی تکمیل واسطے جہان دیاں اکھیں اچ
مٹی سٹ تے چُنڈ گھُ دیاں ملاقاتاں، محبتاں دا اظہار، وعدے وعید، پیار دی رم جھم، پر اُنہاں
سہانیاں گھڑیاں دا بج پھُپھڑ تے پھل بن ونجے تاں اونکوں پونبلی کنوں تروڑ تے جھتاں، اروڑیاں،
گٹراں یا کھوہ کھڈ دے حوالے کرڈتا ویندے اتھاں حفیظ خان کنوں چپ نئیں رہیا گیا۔ انسان دی خود
غرضی تے ظلم تے اُوندا قلم اُسترے وانگوں ٹکے ڈیندا نظر آندے۔ بندے دے گھٹیلے رویاں بارے
اوندی طنز دا انداز اتنا پُر اثر ہے جو اگلے دے خلاف نفرت دے لمبے جھڑک پوندن۔

''ایہہ زرینہ اونکوں رستے وچوں لبھی۔ شہر توں باہر لکر اندآلی جھت وچ
لاتھی۔ نکیاں نکیاں ڈسکیاں تے رڑاٹ نال کنوارے ماپیو دی جند کوں روندی پئی
ہئی۔ اوں شام وی بھوگا لڈ دیچ کراہیں شہروں آندا پیا ہا۔ ایں نکی جہیں معصوم جند
کوں ڈٹھس تاں ہاں دیاں پپوں تائیں جران کرگئی۔ اوکوں آپڑاں بلپن یاد
آ گیا۔ گناہ دی گپ وچ مُتا وے کھاندی، ایہہ پونبل کملانہ ونجے۔ ایہہ سوچ کے
اوں نے زرینہ کوں چاتا تے ہاں نال لا گھدا۔
''پتہ نہیں ایہہ شہر والے بالاں دے پچھوں کیوں پے گئن۔ شادیاں تا کر گھندن

پربال ہک دی ٹمیں پالیا ویندا۔''......(جھات دے اندر گھات)

حفیظ خان دے افسانیاں وچ زنانی دے کئی روپ ڈسدن۔ کنواری، پرنی ہوئی، [illegible]
[illegible] پُرھیت، شہر دی، وستی دی، پر اوہر جاتے سنگری پنگری تے پرکشش نظر آندی اے۔ کتھائیں
امیری تے خاندانی وڈاراوکوں سنگریندا سجیندا نظر آندے تے کتھائیں اوندی جوانی دا رنگ تے
ے۔ حفیظ خان صنف نازک کوں ٹردیاں، بھکاویں نظر نال ڈیکھن دی بجائے اونکوں کھڑے،
تے ڈیہدے تے اوندے حسن دے نفیس ترین مہاندرے نشابر کریندے۔ ایہا وجہ ہے اوندے
افسانیاں وچ زنانی جتنی سوہنی، صحت مند تے وجود دیاں پوریاں اکائیاں سودھی نظر آندی اے، اتنی
کہیں بئے افسانہ نگار دے پاسے نظر نئیں آندی۔ صنف نازک کوں ڈیہدا تاں ہر کوئی ہے۔ اوں کنوں
متاثر وی ہر کوئی تھیندے۔ ایہہ بئی گالھ اے جو اوں حسن دی تشریح کریندیاں ویلے زبان تھریجن لگ
پوندی اے۔ اونکوں کاغذ تے لکیندیاں قلم گتا وے کھاون لگ پوندے تے انگلیں اچ وسما شروع تھی
ویندے۔ پر حفیظ خان دی ہمت تے ادبی جرأت دی داد ڈیونی پوسی جو او اپنیاں کہانیاں دے کرداراں
دے باہرلے خول تروڑ تے انہاں کوں اصلی شکل وچ قاری دے سامنے گھن آندے۔

''زرینہ جوان تھی گئی......ایہہ اُچا لمبا قد...... چھاتی ایویں جیویں مصر دے اہراماں
ڈوڑ پئے ہووِن......چیل چپے جیڈی تے ڈھونگریں دی بَٹ بَٹ ڈیکھ کراہیں روح
گتا دیاں وا ت......رنگت تاں ایویں جیویں لاہندے بجھ کوں میدے وچ مندھ
ڈتا گیا ہووے......بن کجل دے کجلیاں اکھیں......نک دی ناس تے جھلمل کریندا
سونے دا ٹکا جیہا پوپا...... لمبے لمبے چاکاں والی قمیض دے تلے پنیاں تائیں اُچا
پھلدار چھینٹ دا گھگرا...... تے جئیں ویلے پباں بھر ٹردی تاں قمیض دی گھمر گھمیری
نال سینہ ساون دا بدل بن ویندا......جھمن ای جھمن......گاجاں ای گاجاں......ہوا
گھگھرے نال کھڑ انڈ کریندی تاں گر دلیاں ستھلاں چھمو چھم تھی ویندیاں......''

(جھات تے اندر گھات)

ایں افسانے اچ اگوں تے چل تے حفیظ خان دے قلم دی ساری وِس باہر نکلن لگ پوندی اے۔
او گالھ کوں ولے ولا کے ڈے تے اپنے مقصد والی انی تے گھن آندے تے ڈیسندے جو جئیں ویلے
انسان اپنے پیٹ دی جائی کوں، اپنے ہاں دی پونبل کوں، اپنا نک نموز بچاون سانگے، ظلم دی مولھ مار

بجھان کنوں لک تے اُجاڑ جھتاں دے سپرد کرآندے، نہ ما، ماپئی نہ پیو، پیو، کڈے گئی ممتا تے کڈے گئی شفقت پدری، جتھوں ڈونہائیں دے کالے کرتو تاں دا ٹکہ وی متھے تے لگا پیا ہوندے تاں ول پرایاں دے سروچ درداے جواوندی عزت آبرو دے پہرے ڈیون۔ افسانے وچ اتھاں آتے قاری دا دل کھچن لگ پوندے۔ بظاہر دل بھاندی تحریر وچوں، اچا چیت ڈکھ دی ہک سیڑھ نکلدی اے تے قاری ضمیر سودھا پس تے جھبار وتھی ویندے جیڑھلے جو چھوریاں چھنیاں، رے پیکڑیاں، اللہ داسئیں اپنے پالکاں دے ہتھوں اُجڑ وپجڑ ویندن۔ ننگ اِنسانیت پیو مادے کیتیاں دی سزا بھوگ تے دھیاں دھیاں تھی ویندن۔

"بھوگے دی جوانی تاں لے مٹی تھئی، ہن بڈھیپا وی گھانی وات ہا۔ نکے لا جئیں ویلے زرینہ اوندے سینے نال چمڑ تے سُمدی تاں سکون جیہاں ملدا، ہاں دیاں بیوں تک ٹھر ویندیاں پر ہن تاں راتیں دی نندر حرام تھی گئی ہے۔ رات دے پچھلے پہر زرینہ دے بت وچوں اینویں خوشبو آندی محسوس تھیندی جیویں جوہاڑ دے مہینے وچ، سارے ڈینہہ دی دُھپ سڑی مٹی اُتے پانی دا ٹرکان لاون نال آندی اے۔ بھوگے کوں اینویں محسوس تھیندا جیویں ایہہ خوشبو اوندے جذبیاں دی کیری کوں کھتریندی پئی ہووے۔ اوں ویلے تاں قیامت آندی محسوس تھیندی جئیں ویلے زرینہ دے سینے نال چمڑے گوشت دے لوتھڑے اوندے سینے نال گیس گیس کریندے، اندر تائیں دل دی ٹورکوں بے تاورا کر ڈیندے تے اوندا بت اینویں اکڑیجن لگ پوندا جیویں ماتہہ دے اُتے دابنیا ہویا ہووے۔"

کہانی اگوں تے جل تے ڈسیندی اے: .

"اوں رات دے طوفان دے بھوگے دے ذہن اچوں گناہ ثواب دا فرق کھروڑ سٹیا۔ اجھک کیا لتھی، بن ترٹ گئے، رات تھیندی تاں بھوگے دی شفقت، نفس اتے ہوس دیاں گجکاراں وچ چھنوچھن تھی ویندی۔ کجھ عرصہ پیا گزریا تاں بھوگے کوں رات دے کالے بوچھن دی لوڑ وی نہ رہ گئی۔ اوندا بانبڑے پوندا بڈھیپا، جئیں ویلے چھندا، جوانی اچ رہ ونجن والی تریہہ مٹاون کیتے امرت پیالے کومنہ لا گھندا"......(جھات دے اندر گھات)

حفیظ خان ڈکھ دی کالی رات وچوں خوشیاں دے بجھ چڑھیندے تے مسکاراں دے سوجھلے

ونڈیندے ہجھ اگوں مونجھ دے کالے بدل تان ڈیندے۔او خوشیاں دا سنیہڑو ہے تاں ...
مفسر وی۔انہاں انسانی سینے وچ پلدے درد دیاں اتنیاں ڈکھ بھریاں تفسیراں تحریر کیتن جو ...
اکھیں دے تلے پُس ویندن۔اوندی قاری دے اعصاب اُتے اتنی تکڑی پکڑ ہوندی اے جو ...
نہیں سکدا۔او ہک ماہر ماندرے وانگوں قاری دی سوچ کوں مُندر رتے اپنے قلم دی گرِش دے نال
نال لال بھنوالیاں کھڈیندا راہندے۔حفیظ خان دیاں انگلیں وچ انسانی جذبیاں دی جنبوں ...
نظر آندن۔عشق ،محبت ،نفرت ،ساڑ سڑپا ،درد،غم ،مونجھ ،خوشی ،جھیڑے جھٹے ،ریسما میوا،ڈر خوف
،ہمدردی ،حفیظ خان دے ڈوڑے چلدن تاں لباں تے مسک لشکن لگ پوندی اے تے اوندیاں
انگلیں لڈ دِن تاں مونجھ ملال دی رُت ول آندی اے ۔اوچہندے تاں اندر وچ کاوڑ دے
بھانبھڑ بھجڑ کا ڈیندے تے مرضی پوندی اِس تاں ہمدردی دی وٹ اُچی کر ڈیندے۔ویندی رُت دی
شام ،گلی ،منگل دے ڈینہہ ناغہ ہوسی ،ڈکھ بھریاں تحریراں دے شہکار افسانے ہن پر"منگل دے
ڈینہہ ناغہ ہوسی"،وچ ڈکھ دی تصویر کشی عروج تے نظر آندی اے۔ایہہ حفیظ خان دا خوبصورت ترین
تے پر اثر افسانہ ہے جیہڑا ہک فوٹو گرافر نفیس احمد ،اوندی فوٹواں دی دکان تے دکان دی مُڈی موڑھی
توں شروع تھیندے تے کھل مشکری دیاں بھُگلیاں کوں ہتھ لیندا اٹھڈے شُکاریاں تے ونج
مکدے۔کہانی ،منظر نگاری ،مکالمے ،محاورے ،گولویں لفظاں دا استعمال ،کیڑھی شے ہے جیڑھی ایں
افسانے وچ موجود کائنی پر ایں افسانے دے خاص عناصر ایندے کردار ہن جھاں افسانے کوں چار
چندر لا ڈتن۔جیویں اُنھاں دے ناں نرالے ہن۔ایویں انہاں دے کم وی نرالے۔

حفیظ خان ڈسیندن۔کسی نے مجھ سے پوچھا۔کیسی کہانی لکھتے ہو۔میں نے کہا۔کہانیوں سے
کہانی کشید کرتا ہوں۔کردار گھڑتا نہیں چنتا ہوں۔ان کی تجسیم کرتا ہوں،ان کے اپنے فطری تضادات
کے ساتھ ،فطری بہاؤ میں۔باقی کہانی وہ خود بُن لیتے ہیں تے اے سب کجھ"منگل دے ڈینہہ ناغہ
ہوسی"وچ واضح نظر آندے۔

ملا ہک تک، ٹینک دھرتی ساڑ ،نفیس احمد ایہہ اُوجیندے جاگدے کردار ہن جھاں دیاں
گالھیں افسانے دے لفظ لفظ وچ روح پاتے ایکوں حقیقت دے قریب تر کر ڈتے۔ایہہ کردار اصل
وچ حفیظ خان دے اوں مقصد دا پچھاواں ہن۔جیڑھا اُو قاری تک پچاون چہندے۔حف...

وسیب وچ پاتیاں ونجن والیاں کرداریں دے بہانے اپنے وسیب دے گند نشابر کریندے۔ اوا پنے کرداراں کوں پیش ای اتھے اندازاچ کریندے جوانہاں دے انہاں کوں نشابر کریندے۔ طفیل وسیب دے ناسوراں دیاں ساریاں چترائیاں سامنے آویندن۔

"ٹینک دھرتی ساڑ......آکھن کوں تاں سبزی فروش ہاتے ریڑھی تے ہوکاڈے کراہیں گلی گلی سبزی وچیندا ہا...... پر ہا غضب دا کاپٹ تے بھجدے دا میل...... اتھی شوشنی چھوڑے ہا کہ بھادے لمبے، فائر بریگیڈ ای ناں وسا سگدے......"

اینویں ملاں ہک ٹک مسیتڑ مولوی ہے پر چھڑا ہک فوٹو نہ چھکیچن تے اتنا تپ پوندے جو کم مرن مریجن تک ونج ویندے۔ اتھاں انساناں دا نفسیاتی جائزہ پیش کیتا گئے جو بعض بندے کتنے ہلکے ہڑڑے تے شلولی ہوندن۔ آنے بہانے جلالی وچ آونجن والے۔ ہروں بھروں ڈوجھے کوں چوں چوڑاں وچ بے بھرما کرتے اپنی پھوت نبڑیندن۔ حفیظ خان خود ڈسیندن۔

"میری کہانیاں محض کرداروں کی بُنت اور کشمکش سے عبارت نہیں بلکہ ان انسانی رویوں کا آئینہ ہیں کہ جن میں گوشت پوست کا یہ پتلا، اپنے مسام مسام میں آگ کاشت کرتا ہے، اپنے ریشوں کو اُدھیڑتا اور اپنے لہو کے ذائقے سے حظ اٹھاتا دکھائی دیتا ہے......"

ہوا نکلن تے دھمال کھیڈن والا ملا ہک ٹک وی فوٹو نہ چھکیچن پاروں گلید بندیاں دی نال لاتے نفیس احمد دی دکان تے چڑھائی کر ڈیندے تے جوش دا ایہہ عالم ہوندے جو:

"مونڈھے تے پئے چار خانیاں والے رومال دی ہک کنی مولوی صاحب تلوں تے گھیلی، کچیاں واچھاں اچوں وہندی جھگ پونجھی تے بولے
حضرات: صبر تے تحمل کنوں کم گھنو۔ غلطی ساڈی ہئی جو اساں ایں بے مرشد بھاڑی کو تقسیم دے بعد مسیت دی چھاں تلے پیشہ کفر دی اجازت ڈتی کہ اللہ راسی سر لکائی پیارا ہسی۔ پر اینداکردار مشکوک ایندی عبادت ڈکھاوا تے ایہہ لعین انہاں کماں اچ ملوث ہے جیڑھے اشراف کوں زیب نئیں ڈیندے۔ اینے ساڈی جاء دا جوٹھا کلیم بھریا......اساں چپ رہیوسے......ایں نے ایں جاء کوں رنڈی بازی دا اڈا بنڑایا، اساں چپ رہیوسے......ایں نے اج ساڈا فوٹو چھکن کنوں انکار کیتے، اساں ول

دی چپ ہیسے ۔اساں چاہوں تاں ٹینک جے مجاہدایں لعین کوساڑ تے سُواہ کر ڈیون
پراساں خدا کوں جواب ڈیونے۔ اساں ایں بدبخت کنوں فوٹو چھکواون گناہ
سمجھدے ہیں ۔لعنت بھیجیندے ہیں۔ ہن جنگ ہوسی ۔قانونی جنگ ۔اتھاوراہمی
جیڑھا فرمانبردار تے اشراف پیشہ ہوسی''......(منگل دے ڈینہہ ناغہ ہوسی)

اتنی جلالی تے کاوڑاں کٹکیاں دے بعد حفیظ خان افسانے دی مہار مونجھ دے پاسے
ڈیندن۔افسانے دے چھیکڑ اچ نفیس احمد دا خط نہ صرف درد دی موٹھی ماندی تحریر ہے بلکہ ٹینک دے
ساڑ تے ملا ہک ٹک دے مقابلے وچ ہک چنگے انسان دے انسانیت بھرے رویے دا اظہار وی ہے
جیکوں پڑھ تے قاری یقیناً اپنے دل دی ٹور دھیمی تھیندی محسوس کریندے۔

''حاجی صاحب !جڈن خط تہادے ڈو پجسی ......میں شاید ایہہ دنیا مکلا چکیاں
ہوساں ،کیوں جو ہن تانگھ نئیں رہ گئی۔اگست ۷۴ء دے تریجھے منگل کوں میڈی
شگفتہ نال شادی تھیونی ہئی ۔شگفتہ جیڑھی میڈی منگیندی ای ناں ہئی بلکہ میڈا سب
کجھ ہئی ۔پر ایہہ منگل ول نہ آیا۔فساد کیا تھئے ،سارے کانوں کان تھی گئے ۔نہ
مویاں دا پتہ نہ جیندیاں دا۔میں اتھ آپہنچیا تے ویہہ سال ہوں منگل دے انتظار
وچ کاغذ تے بختاں آلی دے نقش لکیندے گزار ڈتے ۔شاید جیون دا بہانہ بنیارا
ہوے ہا جے اوں ڈینہہ شگفتہ دی چھوٹی بھین فوٹو چھکاون کیتے دکان اچ نہ آندی۔
پہلے فسادیاں نے تے ول آپڑیاں نے ڈو ہائیں بھینڑیں کوں رنڈی بنا چکلے اچ بلہا
ڈتا تے اودی ہیں شہر وچ۔
حاجی صاحب !او بختیں والی اگست ۷۴ء دے تریجھے منگل دی تانگھ تنگھیدی ،ایں
دنیا توں لڈ گئی پر منگل نہ اوندے کیتے آیا نہ میڈے کیتے ۔ول جی تے کیا کرنا۔ایں
رقعے دے نال دکان تے چوبارے دی ملکیت دے کاغذ ہن ۔مولوی صاحب
کوں ڈے چھڑائے ۔میں وقف کیتے خدا واسطے ،میت دے ناں......
(منگل دے ڈینہہ ناغہ ہوسی)

کوئی ہوا ایجھی گھلی اے جو ویلہ وڈے تکھاج نال بدلدا ویندے تے اپنے نال نال سب کجھ
بدلیندا ویندے ۔قدراں ،رساں ،ریتاں ،طور طریقے ہر شے تبدیلی دا شکار ہے پر حفیظ خان ویلے دا

قدردان انسان ہے۔او ماضی تے حال ،ڈوہائیں کوں انگل نال لاتے اپنیاں تحریراں وچ ٹردا نظر آندے۔او جتھاں نویں خیال ،نویں انداز تے نویاں تکنیکاں گھن تے ، تے حال کنوں ٹپ تے مستقبل آلے پاسے ،اگونہی دے جذبے نال ،قدم ودھیندا ڈسدے اُتھاں اوا پنے سمورے ماضی دیاں یاداں ،ماضی دیاں قدراں ،ماضی دی گزری ویہانی دیاں گنڈھڑیاں سر تے چاتیاں نظر آندے۔حفیظ خان ماضی کوں لتھا لہواں جان تے بھُکانی سٹیندا۔ماضی تاں ایندا سرمایہ ہے۔ایندا سمل ہے جیندی تڈ تے ایہہ بھلو بھلی کہانیاں دے شیش محل اُسریندے۔حفیظ خان چھڑے اپنے ای کائناں بھل پورے وسیب دے گزریے ویلے دارا کھا معلوم تھیندے۔گزرے ویلے دے بندے، انہاں دیاں رساں ریتاں ،اکھان پہاکے، شغل اشغال جنھاں کوں حال دے لوک تیزی نال وسریندے ویندن،حفیظ خان وڈی محنت تے مہارت نال انہاں کوں اپنیاں کہانیاں وچ محفوظ کرگھدے۔"ڈکھا دم سہائی دا" والے اللہ ڈیوائے خاں جہیں سچے کھرے، پیار کرن والے لوک ہن کتھ رہ گئن۔او جھے لوکاں دیاں ماکھی نال ترمدیاں گالھیں تے انہاں دی طرز زندگی دے نشان ہن کتھ لبھدن۔حفیظ خان داایہہ ماضی تے احسان ہے جوانہاں اللہ ڈیوائے خاں جیہے کردار دی شکل اچ گزرے ویلے دے لوکاں کوانہاں دے لب و لہجے تے طرز زندگی سمیت ہتھر یکا کر گھدے۔

"ڈکھا دم سہائی دا" پڑھدیاں ویلے قاری کواپنے بلپن دی خوشبو آون لگ پوندی اے۔او محسوس کریندے جواوآپ نکا جیہاں بال ہے جیڑھا ٹھڈائی رگڑیندے اللہ ڈیوائے خاں نال تڈی تے بیٹھا،اوندے صافے دے کن پکڑ تے ٹھڈائی وی چھڑویندا بیٹھے تے اوندے پہاکے وی ہوندے الا وچ سُنڑدا بیٹھے۔ایہہ او پہاکے تے بول بچن ہن جنھاں کوں لوک بھل گئن یا ہولے ہولے بھل ویسن۔اللہ ڈیوائے خاں ،حفیظ خان دا ہک زندہ دل تے مشکری باز کردار ہے،انہاں اوندی ہر ادا، ہر صدا، ہر انداز کوں وڈے خلوص ،وڈی دیانت تے پوری فنی مہارت نال قلمبند کرتے ہمیشہ واسطے امر کرڈتے۔ساگی اُوئیں دا اُوئیں۔نانے اللہ ڈیوائے خاں دا نین نقشہ اوندا پہناوا تے اوندیاں ہمیشہ یادرہن والیاں گالھیں واقعی ماضی دا تر کہ ہن۔

"نانے اللہ ڈیوائے دی عمر ہوسی ایہو کوئی ستر بہتر سال۔مدھرا قد، گورا رنگ، چوڑا متھا ،کھڑا نک، بت کسرتی ،لمبے چونڑیں ،گل اچ کنٹھے تے گلابے، ڈوہائیں

ہتھاں دیاں انگلیں اچ سچے تھیوے، ویڑیاں اچ چاندی دے کڑے جنھاں دے پنجتن پاک دے ناں لکھے ہوئے۔ گل اچ لمبا چولا، منجھ دھوتی تے پیراں اچ کناں چھکویں جتی۔ بالاں نال بال، جواناں نال جوان تے ملنگاں نال ملنگ......"

اللہ ڈیوائے خاں ساوی چھانٹی لگدا تاں اوندے بول ہوندے۔

"او...... نچ نچان...... قبر جھلی نہ غستان...... تھی مریں حیران...... پیر فقیر دا غیرتی ڈھگی رہی نہ ویڑھکی......"

تے جئیں ویلے اوٹھڈائی دا منگر منہ نال لیندا تاں اوندا نعرہ ہوندا۔

"او...... پیوں کھاؤں...... ٹھک ہے اوں بھاڑی کوں...... جیکوں نہ بھاؤں......"

اللہ ڈیوائے خاں قصولی وی ہے۔ اوندے کول قصے دا منڈھ بدھن دی قدیم تکنیک ہے او قصہ ٹورن کنوں پہلے بالاں کنوں پچھدا۔ "بالو! قصہ سنڑسو......" بال اکھن ہا۔ جی......" تاں او قصے دا ایں منڈھ بدھے ہا۔

"جیویں جی نال...... مانی کھاویں کھنڈ تے کھیر نال...... دشمن مرنی ہاں دی پیڑ نال......" تے ول قصہ شروع تھیوے ہا۔

"واہ...... واہ ہے...... اللہ بادشاہ ہے...... الا پچی دانیاں دی فوج ہے...... بی بی جلیبی ہے...... کاغذ دی بیڑی ہے...... مکوڑا ملاح ہے۔ جے چڑھ پیوں تاں ایہا صلاح ہے۔ کویلی سُتی سیج تے نومن کجل پا...... اُتوں ڈٹھا ہاتھی۔ آکھے کیڑھا ہے موبائلنگ کریندا...... جگو دے ڈوہڑے پٹھے پٹھے...... مہیناں اُتے چھپر وٹھے۔ بھوکن چور تے نسن گتے......"

تے جئیں ویلے قصہ مکے ہاں تاں اوندا چھیکڑی بول ہوندا۔

"قصہ گیا جھر کوں...... اساں ول آیوسے گھر کوں......"

حفیظ خان ماضی دے پیٹ اچوں اتجھے قصے جموا تے دراصل قاری کوں ماضی دے نال ساہاڑن چہندے۔ ایہہ او قصے ہن جنہاں کوں اساں تاں سنڑ یا پر ساڈی اگلی نسل نہ سن سگسی......

حفیظ خان مہارت بھری سادگی نال لفظ ورتن دا فن جانڑدے۔ پہلی نظر اچ اوندے لفظ سادے لگدن پر جئیں ویلے آسے پاسے دید مریندے ہیں تاں اتجھے لفظ، اتجھیا گالھیں کہیں سبئے دے۔

نظریں آندے۔ اواپنے کرداراں دے منہ وچ نکلدے ہوئے لفظاں تئی اُبانل نال جھپیندا رہیا۔ دانہاں کوں ویلے دی اَٹ میلا کرتے اوندی شکل، اوندے اندر دا الطف نہ وگاڑ سگی۔ اتنی مناسب، اتنی چسولی تے اتنی حقیقت پسندانہ طرز تحریر صرف حفیظ خان دے پُکھے وچ ای آئی۔ نذیر، نانے اللہ ڈیوائے خاں دے حقے دا پھل بھن گھتیندے۔ تاں نانے دا کوڑیندیاں ویلے وی بھوں شفقت بھریا انداز ہوندے۔

"کھلا تے کھلا ای لغور آ...... سُنجی شے تے ویڈھے دی وشواں...... شرم نئیں آندی بے مرشد کوں...... زیان کرتے وی ڈند پٹیندے...... بھک جاتے مریساں کوون کوں......"

تے نذیر نانے کوں مناون سانگے چمبڑن پوندے تاں نانے دی کاوڑ ہئی وی محبتاں بھری تھی ویندی اے......"

دفع تھی گھوٹو آ...... ووئے چھوڑمیکوں بھر جل پیا آ...... دات اچ ڈوائیں گاوانڈ......"

نثر دا ایہہ انداز کوئی کہانی کار وی اختیار نہ کر سکیا۔ تے جئیں ویلے ہک شاعر نانے کوں شعر سناون آندے تاں نانا کیویں جو دلچسپ تے قدیم ترین طرز گفتگو نال مخاطب تھیندے۔

"آ بھئی منی خاں! کیا حال اے۔ اُچھک ہیں۔ تے بلائی دے یار دا کیا حال ہئی۔" نانا جئیں ویلے اوندے شعر سُنڑدے تاں تبصرہ کجھ ایں طرح کریندے۔

"دوئے شعر لکھے نی یا گھا کپی۔ نرے گوہے تھپ رکھے نی۔ ہیں دوئے تیں شاعری کوں سمجھیا کیا ہوئے......؟"

گفتگو دے ایں انداز کوں افسانے دا حصہ بناون حفیظ خان دا کمال ہے۔ کتنے افسانہ نویس ہوسن جھاں اتجھی قیل مقال کوں اَجائی سمجھ تے اپنے قلم کنوں پروبھرا رکھیا ہوسی پر حفیظ خان ماضی دیاں انہاں یادگاراں کو وڈے فخر نال اپنیاں کہانیاں دا سنگار بنائے۔ تے ایہو اللہ ڈیوائے خاں دی جئیں ویلے ذال مرویندی ہس...... سنگت ترٹ ویندی ہس...... خوشیاں مُکا ویندن...... کابیا دیڑھ ویندے تاں اوڈکھ تے مونجھ دی جیندی جاگدی تصویر بن ویندے۔

"پرایہہ او اللہ ڈیوائے خاں نہ ہا...... ہک بوتا ہا...... نہ ساہ نہ سُرت...... جتھے بیٹھے تو بیٹھے...... کجھ کھادے تاں پتہ نئیں...... کجھ پیتے تاں یاد کائنی...... ادھی ادھی رات توڑیں، چنڈاں گٹھاں پھرلیندا ودے تے روندا ودے۔"

''ووے ساتھی آ...... کلہا چھوڑ گئیں ،نور بخت آ...... رُس گئیں میڈا یار آ...... کجھ
ڈینہہ تاں بیارہ وَنجیں ہا...... تے ٹھڈے ساہ بھر آ کھے ہا...... مر ماجیون دی......
ڈکھا دم سہائی دا......''

زنانی حفیظ خان دا من پسند کردار رہی اے ۔ جیویں کائنات دا حسن زنانی دے وجود نال اے اِیویں حفیظ خان دیاں کہانیاں وی عورت ذات دے بغیر اَن لونی بھاجی وانگوں بے سوادیاں ہوون ہا۔ حفیظ خان زنانی نفسیات دا جانو ہے۔ او عورت ذات دی طرفوں تھیون والی یا عورت تے تھیون والیاں زیادتیاں داوڈی غور نال مشاہدے کرتے گالھ ٹُریندے۔ تاہوں تاں انہاں ''وادی سندھ کی عورت کا نیا مقدمہ'' لڑن سانگے اپنیاں کجھ کہانیاں دا اردو وچ ترجمہ وی چھاپے، جنھاں وچ زنانی تے تھیون والے ظلماں کوں نویں ڈھاؤں ڈھک نال مقالیا گئے۔ او جتھاں بھولی بھالی سدھی سادی تے آئے گئے دا ظلم زیادتی سہندی، ان پڑھ زنانی کوں اوندے سارے پھٹاں سمیت پیش کریندے اُتھاں اج دی پڑھی گڑھی، چتر چالاک عورت کوں اوں دیاں چتر ائیاں تے اعتماد سودھا قاری دے سامنے گھن آندے۔ پر اتھاں حفیظ خان دا لہجہ تبدیل تے تحریر دا انداز منطقی تھی ویندے۔ او نفسیات دی عینک پا تے عورت مرد دے اندر وچ جھاتی پیندے تے وڈے سُہپ نال انسانی رویاں تے مدلل بحث کریندے۔ او ثابت کرن دی کوشش کریندن جو عورت دے معاملے وچ مرد بہوں لُندھا ثابت تھئے۔ مرد دا کہیں زنانی نال وڈیاں لیکاں سجاں نال شادی کرن، اوندے ناز نہورے برداشت کرن تے اوندے نال حیاتی دا کجھ عرصہ پورے مردانہ جوش خروش نال گزارن دے بعد جئیں ویلے اوکوں اوندے وچوں کھٹی بھاجی وانگوں چھپٹ آون لگ پوندی اے تاں اوںکوں نظر اولے کرتے بئی دے پچھوں لگ پوندے۔ نہایت جدید رنگ وچ لکھی گئی کہانی ''مکدی نمیں نبھدی نمیں'' وچ وی ئیں الیسے دا ورجیوا کیتا گئے۔ پر اتھاں عورت کوں وڈا پر اعتماد تے مرد کنوں اُڑانداڈ کھایا گئے۔

''تیڈے نال شادی تاں میں آپڑیں ذات واسطے کرن چہنداں ، آپڑیں ذات دی
تکمیل واسطے......''

''ہونہہ...... ایہہ کجھی تکمیل ہے...... ایہہ تاں تذلیل ہے ڈوں عورتاں دی...... تقسیم
ہے فیملی یونٹ دی...... شوہر دے ادارے دی...... تے معاف کرا ہے جناب
!تہاڈی ذات دی تکمیل دی آزو چ میکوں اَدھ ادھورا شوہر نمیں چاہیدا......''

''میڈی جان ایہہ سب اینویں مفروضے ہوندن تے لوکاں دیاں گالھیں...... میں
سارا دا سارا تیڈا ہوساں......''
''کتھوں سارا دا سارا...... کیاں توں فوزیہ کول ویسیں کائناں ......اوندے نال
نمسیں کائناں......اوندے بالاں دی پرورش کائناں کریسیں ......اونکوں خرچہ
کائناں ڈیسیں تے ول کتھوں ہوسیں میڈا سارے دا سارا......''
''نزہت اصل گالھ دل دی ہوندی اے۔اے سب تاں اینویں دنیاداری......''
''ہونہہ......سب سمجھدی آں، دل کوں وی تے دنیاداری کوں وی......اوندے منہ
تے اوندا تے میڈے منہ تے میڈا ......بس یار، میکوں شوہر چاہیدا اے، کوئی
منافق مرغ بادنما کوئناں......''(مکدی نہیں نبھدی نہیں)

نزہت دے ول ول دے انکار تے کہانی اچ اگوں تے چل تے حفیظ خان مرد دے اندر دی
کیفیت دا ایکسرے گھندے تے عشق دے کوکڑے وچ پھسے ہوئے انسان دی اندرلی حالت دا تجزیہ
پیش کریندے، پر اینویں جیویں کوئی فلسفی اپنے مخصوص فلسفیانہ رنگ وچ کہیں مسئلے دا نتارا کریندے۔

''ڈوں ہکوجیاں عورتاں، ہک چس آلی تے ہک بے چسی ...... پر چس تاں شاید انکار
داناں ہے......وجود دی ساری کشش تے مقناطیسیت انکارتوں شروع تھیندی
اے تے انکار تے مکدی اے......ڈھیر سارے خداواں توں انکار دے بعد ای
ہک خدا دا اقرار ممکن تھیندے......ہک بئے زاویے توں ڈیکھوں تاں انکار عشق
ہے، مزہ ہے، زندگی ہے تے اقرار موت......عشق تے وجود ڈوہیں دی...... پر
ایہہ کجھا انکار ہا جینے میڈے بت دے مسام مسام وچ، دوزخ دی بھاء وچ لال
انگارہ تھئے گندوئے پوڑ چھوڑے ہن کہ جناں وچوں اذیت رتول بن کراہیں، لحظہ
لحظہ سمدی راہندی ہئی......''(مکدی نہیں نبھدی نہیں)

پر سو سوا انکار کرن والی ایں کہانی دی نزہت اپنی نسوانیت دی ساری رس چُپوا تے چھڑی پھوگ دی
پھوگ رحمان دے سامنے آندی اے تاں عورت کنڈ دے بھرنے ڈٹھی نظر آندی اے۔اوندی ساری نخر
وڈائی مٹی اچ مل ویندی اے تے اُوندے راہاں فدا تھیون والا رحمٰن ہلکا پھل تاں تھی ویندے پر ماضی
دیاں یاداں، پیار دے زخم اوندے احساس وچ پڈدے ہوئے تھوہے اُوئیں پچلا مچائی رہندن۔انسان

بظاہر کہیں دی زلف کنوں ازاد تھی تے وی اُو ئیں بد ھل تے مجبور رہ ویندے۔

"بس ایہا ہئی نزہت ...... آخ تھو ..... لگیا کہ ہولا پھُل گیاں تھی ...... وجود دے
سارے تھوئے، سارے کنڈے کہیں نے چن گھدن ...... میں سکون نال سُم گیا
...... سویر تھئی تاں بسترے توں اٹھیاں ای نہ گیا ...... میں بے خیالی وچ اپنے بُت
تے ہتھ پھیریا ...... کنڈا، کنڈیری، شیتاں تھوئے، میڈے بت تے کنڈیاں دا پورا
جنگل اُگ آیا ہا ......" (مکدی نہیں نبھدی نہیں)

سیاست دانا ں وانگوں۔ سیاست دا وجود وی تلکواں تھیندے۔ کہیں ویلے ایں بنے، کہیں ویلے اُوں پاسے۔ ہکی جاتے ٹک تے نئیں کھڑدی۔ ایہا وجہ ہے جو اے کہانی لکھن والیاں دے ودھ گھٹ ہتھ آندی اے یا اُو ایں کو مے کرڑے وانگوں لحظہ لحظہ رنگ وٹیندی اوتری شے کوں جان بجھ تے اپنیاں لکھتاں دا حصہ ای نئیں نبڑیندے یا وت ایہہ تھی سگدے جو ایہہ نکی جند والا طبقہ اپنی عزت بچاون سانگے ایں راہپے بھرے ڈُب اچ وٹہ مارن کنوں چھر کدا ہووے۔ جتھاں سیاست وی سیاسی اصولاں دی بجائے خاندانی رعب، دبدبہ تے اُچ طرے دی سیاست ہووے۔ جاگیرداری دی تڑ تے روپے پیسے دی سیاست ہووے۔ ضمیر وِیچن تے ضمیر خریدن دی سیاست ہووے۔ قرآن دے میلیاں تے پیراں تے پٹکے رولن دی سیاست ہووے یا وت دہشت گردی تے ڈنڈ کے گولی دی سیاست ہووے ...... پر ...... حفیظ خان انہاں وریاں وسواساں تے ڈرڈکل کوں نیڑے نئیں آون ڈتا۔ اوہک باہمت تے وڈے جگرے والا لکھاری ہے۔ جتھاں اُنہاں وسیب دیاں بیاں ڈھیر ساریاں کدتیاں کوں اپنے قلم دی چُنج نال کتھور تے نشابر کیتے اُتھاں اُنھاں زخ دی ماری سیاست جیندے طفیل مُلک لوڈے وات ہے تے اُملک ڈُڈے ڈُ ڈُ سیاست داناں دے بغیر کہیں جھجک دے گندی والے آ بھو کڈھن۔

"ملک وچ الیکشن دا اعلان کیا تھیا ...... پورا رسول پور ننددروں جاگ پیا ...... یارہاں سالاں بعد اوہا آماں گھاماں، بٹ کڑاک، میل ملاپ، بحث مباحثے، اڑانڈ کھڑانڈ، بھن ترٹ، ریہے میئوے، چالاکیاں چترایاں تے پارٹی بازی ...... قومی اسمبلی دے وچوں ہن تائیں ہکو خاندان جتیندا آیا ہا ...... ملک خاندان ...... پاکستان بنن توں بعد ملک حاکم علی دا راج رہیا تے اُوندے مرن توں بعد اوندا پتر ملک جابر علی اتھوں دے سیاہ سفید دا مالک بن بیٹھا۔ ایہہ گالھ نہ ہئی کہ ......

مقابلہ جیت ویندا ہا، بلکہ مقابلہ تھیندا، کڈاہیں ماٹھا تے کڈاہیں کانٹے دار، لیکن
ملکاں کنوں جت کوئی نہ سکیا۔ حکومتی پارٹی دا ٹکٹ، مرکز وچ بیٹھے طاقتوریں دی
خوشامد، تھانے کچہری دی سرپرستی، بدمعاشیں نال گندھ گنڈھارا، کتھائیں منت،
کتھائیں لارا...... روپیہ، پیسہ، جوڑ توڑ تے ول اتجھیاں گُوں کون ہراوے۔
کئی زمانے آئے کئی گزرے، حکومتاں بدلیاں، حکمران بدلے، کڈھاہیں چٹے، کڈاہیں
کالے تے کڈاہیں خاکی...... ڈیدھے ڈیدھے سبھو کجھ بدل گیا پر نہ تاں ملکاں دا زور ترٹیا
تے نہ رسول پور دے لوکاں دی قسمت بدلی......" (اندر لیکھ دا سیک)

سیاست داناں تے حکمراناں وچ ڈیل وی ہک دلچسپ عمل ہے۔ حفیظ خان اونداایں جائزہ گھدے۔
"ایہہ ڈیل وی ایڈی سوکھی کائناہئی...... کئی کئی تول، کئی تلاوڑے...... "ڈندے"
......"چوگے" دی پڑتال تاں معمولی گالھ...... پیراں دے نونہاں توں سر دے
والاں توڑیں تابعداری دیاں مہراں لگیاں...... بلڈ ٹسٹ تھئے کہ خون چٹا ای ہے
ناں...... کتھائیں غیرت دی بدبوتاں کائنی...... ایں چھانٹی وچوں جو کجھ باہر آیا،
انہاں وچ ملک جابر علی وی ہا......" (اندر لیکھ دا سیک)

حفیظ خان ہک حساس تے اُشاک ذہن لکھاری اے۔ جیں دے فیض اوندے اندر ہر گالھ دا
وٹ کڈھن، ہر واقعے کوں اگوں پچھوں، ہجوں کھبوں ڈیکھن تے اوندے بارے غور کرن دی عادت
سٹ ڈتی اے۔ او وسیبی مسائل کوں ہک قلمکار دی اکھ نال ڈیہدن پر اوندا نیاں اپنے جیں والے قلم نال
کریندن۔ بالکل حق سچ تے ناقابل اپیل...... انہاں کوں ایویں لہولا تے شہداں اچ شامل تھیون دا
کوئی شوق کائنی جو ہروں بھروں ریڑھور یڑھ تے چھڑے صفحے کالے کرن بلکہ او ہک ماہر پیرڑی وانگیں
بیان تھیندے واقعے دا چپ چپاتا پیرا چاتے، نعمتاں توں وانجیاں، غریبی دے چک اچ گنگا پانی
روندیاں، جھگیاں جھوپڑیاں کنوں لنگھدا، ساہ جھن تے پررونق دیریاں تو ٹپدا، اُتھاں تھیندیاں
حشریاں کوں ڈیہدا، انسانیت دی کھیڈ گُنی پکیندیاں اُچیاں اُچیاں حویلیاں کنوں گا ترجھات کریندا،
بیڈروماں دی کھسر پھسر دی کنسو گھندا تے پاند تائیں پجدے...... ایہا وجہ ہے جو قاری حفیظ خان دا
افسانہ پڑھدیاں ویلے حقیقت دی چس چیندا بیٹھا ہوندے۔
جاگیرداری نظام ساڈے وسیب دا خاص طور تے لکھیا تے پڑھیا ونجن والا عنوان ہے۔ ایہہ

نظام وسیب دی ڈھونگری تے بڑ کے ہوئے پٹھے دی مثال ہے جیندے بوزے دے مارے، آپ موہانے اصول تے ضابطے، انسانیت واسطے مہناں نے انساناں واسطے عذاب ہوندن۔

''منشا تے میاں منشا'' حفیظ خان دی اپنے وسیب دے ایں جھپ تے تکی، اکھ دا ثبوت ہے۔ غریباں دے اعصاب تے لیکیاں جاگیرداری نظام دیاں ڈانڈاں، غریب دی حیاتی دے او کھدم جڈن جو او اپنی مرضی نال ساہ وی نی گھن سگدا، لون سواء تھیندی غریب دی عزت، حفیظ خان غریب دی حیاتی تے سبھے پکھ کھول تے قاریٔ دے اگوں رکھ ڈتن۔ انہاں مسائل تے حفیظ خان دا قلم اتی تکھی ڈلکی مریندے جو سدھا سچ دے بنے تے ونج کھڑدے۔ کہانی دی تنکڑ کوں ڈیکھ تے قاری کوں گمان تھیون لگ پوندے جو کہانی سُنڑ ویندیاں سُنڑ ویندیاں مصنف ایہہ پک وی کروائی ویندے جو، جو کجھ آکھم سچ آکھم، سچ دے علاوہ کجھ نہی آکھیا۔ جاگیرداراں دے بے رحم دراں تے ڈانڈھیاں ڈھوراں وانگوں حیاتی گزریندے کمیاں کاسبیاں دے پورھے تے اوندے بدلے ملن والی مراعات بارے حفیظ خان ڈیسیندن تاں حیرت تھیندی اے جو اتنا مشاہدہ......

''عید، برات تے لتھے پاتے ......سال دے دانے ......پھٹی دی چونی ......روز دا لسی دا مُنگر ......مندا گالھ اتے لتر پولا...... تے وی وی شُکر پہلے ذیلدار دا تے ول خدادا......''

ایہہ جاگیردار لوگ انہاں کمیاں نال کیا کجھ نئیں کریندے۔ انہاں کنوں بھیٹ کشیاں چوویندن۔

انہاں دیاں پرنیاں کنواریاں کوں اپنی ہوس دا نشانہ بنیندن تے او کجھ کریندن جیکوں ڈیکھ تے انسانیت شرم کنوں سرسٹ کھڑدی اے۔ میاں منشا راہ وچ کھڑی چھوکری کوں ڈیکھدے تاں رات کوں پیر گھٹویندیاں ویلے منشا نائی کنوں پچھدے تے او ڈسیندے۔

''جیویں ہمیشہ نسیم ناں ہے چھوہر دا......گاموں مصلی دی دی دھی ہے۔ کنواری ہے حالی......چھوہر رج سوہنی ہے، چندر دا ٹوٹا......''

''کل اوندے پیو کوں سڈ، تے توں تیاری کر شادی دی......'' ذیلدار میاں منشا دا حکم ہا......کیڑھا سر جھلے تے اکھ چاوے......منشا بھویندا، نسیم چیکدی رڑدی تے اوندا

منگیند اکر لاندا رہ گیا۔ پر...... برات وی ڈھکی، نکاح وی تھیا تے نسیم، منشے نال مکلا تے میاں منشے دے دیرے توں ذرا پروبھری، اوندی سالھ وچ آن بیٹھی...... آیا گیا ہک پاسے تھیا تاں میاں منشے، منشے کوں سڈا پٹھیا......

''جی سئیں ...... جیویں ہمیشہ...... منشا ہتھ بدھ، سیس نوا، میاں منشا دے اگوں تعمل بن تے آن کھڑا تھیا......''

''نسیم کوں نال نئیں گھن آیا......'' منشے دے چہرے دا رنگ اُڈ گیا۔ اُلودا پٹھا، نائی دا نائی رہ گیوں۔ ووئے منشا ناں رکھن نال نائی سردار نئیں بن ویندا۔ بھکن کہیں جادا۔ ووے بھاڑی آ، ایڈی سوہنی شہزادی چھوہر تئیں جے بدشکلے نال ایں گالھوں نئیں پرنائی کہ اُوکوں اپنی سالھ وچ بلہا آ...... اوندی جا اتھ ہے۔ اِتھ میڈے بسترے تے...... تے خبردار اوکوں ہتھ ای لایوتاں ...... کپ تے کتیاں کوں کھوا ڈیسیاں......'' ذیلدار دے منہ وچوں جھگوں واہون لگ پیاں۔

''سئیں، جند منگو تاں حاضر ہے پر ایہہ تاں...... ایہہ...... نسیم میڈی عزت......''

میاں منشا زور دا کھل پیا...... '' نائی دی عزت...... ووئے کہو دن آ، کمیاں دی عزت کتھوں تھی گئی...... سبحان اللہ، جوٹھے تھاں لکن والے وی اج عزت دے دعویدار بنڑدن...... ناں بابا، ول ساڈی تاں جا ای کائینی......'' میاں منشا کجھ دیر تاں آمرا دا کھلدا رہ گیا۔ ول اٹھیا تے فرش تے بیٹھے منشے کوں چھک تے لت ماریس ......'' اُٹھی بچہ اُٹھی...... گھن آ زال کوں...... زال، ڈیہنہ کوں منشے تے رات کوں میاں منشے دی زال...... ناواں لکھودا تے تھیوا بکھودا...... تے خبردار، ایہ گالھ زنان خانے توڑیں پُجی......(منشا تے میاں منشا)

حفیظ خان دا ایہہ ادبی گُن اے جو او کہانی اچ اتھے اتھے پُچ ڈیندے جو قاری دیاں آپ موہانیاں چھرکیاں نکل ویندن۔ ایں کہانی وچ وی ہک زمیندار دے ہتھوں اوندے ذیلداری پیچے نال شُنہیدی، غریب نمانے طبقے دی عزت دے پھوندے اُڈدے ڈیکھ تے قاری اپنے ہاں تے ہتھ رکھ گھندے۔ اپنے دراں تے پورھیا کرن والے قابل رحم انساناں تے اے وڈا ظالم کیڑھے کیڑھے ظلم کریندے ......پر...... غیرت تاں کمیاں کا سبیاں وچ وی ہوندی اے۔ ساری انسانی پچ نال ظلم کریندے

حِساں اُنہاں وچ وی تاں ہوندن۔کوئی کے تائیں زہر دے گھٹ پی تے برداش کرے۔غریب دی حیاتی وچ ہک او ویلہ وی آندے جڈن اوکوں اپنی عزت ،اپنی زندگی کنوں پیاری لگن لگ پوندی اے۔بے غیرتی تے بے شرمی دیاں، ہر ویلے دیاں گھوباں کنوں بچن سانگے او کھلدیاں موت کوں سینے نال تاں لا گھندے پر مرن توں پہلے سینے تے لگے سارے داغ میل سمیل تے ،عزتاں دے لٹیرے دے منہ تے مل، سارے لیکھے لانویں سانویں کر، ہمیشہ واسطے اوندا مکالا کر ویندے جو، جو دم جیوے اپنے منہ اچ آپ بُجھے مریندار ہے۔اڑیاں باہنیں کوں چک پیندار ہے۔

''میاں تکھے تکھے کمرے توں باہر آیا......منشے دی سالھ توں باہر، اوندی ہک رات دی کنوار، ونگاں تروڑ، وال کھنڈا، وین کریندی پئی ہئی تے اندر کھٹ دے منشے دی لاش لاتھی ہئی۔منشارات کوں ای کیڑے مار زہر پی زال کوں بیوہ کر، میاں منشے کوں دالا گیا ہا۔

حاکم بے وسا تھیا تاں ڈند جھپیڑ، ایہہ دھک پچا گیا......پرانت اوں ویلے تھیا جڈاں چھی مہینے بعد میاں منشے دے گھر پُتر جمیا۔کالا کنڑ چھاتے گٹھا۔پیراں دیاں انگلیں کنوں لاتے نک تک، ہر انگ موٹا موٹا تے بھدا۔مویا منشا، جیندے میں منشے کوں ڈوجھا دھک لا، حساب برابر کر گیا ہا......'' (منشا تے میاں منشا)

ملکی سطح تے جیویں کوئی وڈی خبر ہک ہوندی اے پر ہر اخبار دی شہ سرخی دا لہجہ تے انداز آپو وانا ہوندے۔ایویں وسیب دے سینے تے منگ ڈلیندے اکثر مسئلے ہکوسویں ہوندن پر انہاں دے مشاہدے واسطے ہر کہیں دیاں دوربیناں تے تجزیے واسطے خوردبیناں دے عدسے انجوانج ہوندن۔ہر مسئلے دا اندر باہر ڈیکھن تے اوندی تول تک واسطے ہر ہک دے اپنے ممبرے تے اپنے وٹے ہوندے۔کوئی کہیں وڈے المیے کو بھکاویں نظر نال ڈیہدے تے گول مول کھدا بنا تے ریڑھ چھڑیندے تے کوئی اونکوں ول ول نجھا تے ڈیہدے۔اوندے ایجھے پیچے تائیں پُجدے۔اوندا اَنت لہندے تے اونکوں اوندے جزیات سمیت، رنگ برنگے غلیفاں اچ ولھیٹ تے قاری کو پیش کر ڈیندے۔کہانی لکھن دا ایہو فن حفیظ خان کول ہے۔

حفیظ خان جیہے منجھے ہوئے افسانہ نگار دے کیڑھے کیڑھے افسانے داؤ کر کریجے۔اُنہاں دے

ہر افسانے دی کہانی ہک مکمل کہانی ہوندی اے جیڑھی فن دے تُلاوڑیاں تے ہر لحاظ نال پوری لہندی اے۔ اوپڑھن اچ دلچسپ تے سمجھن اچ سوکھیاں ہوندن۔ نہ کہیں کنوں مطلب پچھن دی مُتھاجی نہ ادھ انت لہن واسطے سر پکڑ تے بہن دی لوڑ۔ حفیظ خان دے افسانیاں دا اثر بہوں دیر پا ہوندے۔ ہک لمے عرصے توڑی جتھاں انہاں دے افسانے قاری دیاں کتکالیاں کڈھیندے رہندن اُتھاں اُو ارمان کنوں ٹھڈے شُکارے وی بھریندا رہندے۔ اُنہاں دے افسانیاں وچ شامل کردار ہمیشہ تل وسیب دچوں ہوندن۔ جنھاں دے لہجے دی پڑڈو، اُٹھدیاں بہندیاں خیالاں دے آسوں پاسوں زونگدی رہندی اے۔ انصاف دی اکھ نال ڈٹھا ونجے تاں حفیظ خان دے سارے افسانے سرائیکی زبان دا انسائیکلو پیڈیا ہن۔ ایہہ اُنہاں دا سرائیکی زبان تے تھورا ہے جو انہاں ماضی دی اَٹ وچ ونجیندے ہوئے ان مُلے لفظاں کو گول گول تے اپڑیاں تحریراں دیاں نویاں بُشکیاں اچ ہتھڑ یکا کر گھدے۔ پُرانے اکھان تے پہاکے جنھاں کوں لوک وسر دے ویندن، ون سونیاں تشبیہاں جنھاں کوں ٹھہاون صرف حفیظ خان دا ای کم ہا جیویں جو:

''مینہہ اچ پُسی ہوئی وان دی کھٹ وانگوں چھکی تڑیں جوانی......

پولی دے تانے وانگوں چھکیا چھکیا بت......

چھاتی اینویں جیویں مصر دے اہراماں دوٹر پئے ہوود......

چپے جیڈی چیل......

رنگت ایویں جیویں لاہندے سجھ کوں میدے وچ مندھ ڈتا گیا ہووے......

قمیض دی گھمر گھیری نال سینہ ساون دا بدل بن ویندا......

اوندا بت اینویں اکڑ یجن لگ پوندا جیویں مانہہ دے اَٹے دا بنیا ہویا ہووے......

اکھیں اتنیاں نکیاں جیویں پرانی کندھ اچ ادھ بھڑے کولے......

کالا جموں......

پتہ نئیں کیڑھی کیڑھی دیگ دی گھروڑی تے کیندی کیندی نیت دی کالون کٹھی تھی

تے بال دی صورت وچ جم پئی ہئی......

ہر سوراخ اُتے مکھیاں ایں طرحاں بھن بھن کریندیاں پیاں ہن جیویں مانے اُتے

ماکھی دیاں جھاراں......

نرگٹ دا گٹارا، اتنا ابھریا ہویا جیویں پرانے سوڈے والی بوتل وچ پھسی ہوئی بلوروالی گولی......

نک جیویں نرویا میڑھا......

ڈاڑھی دے تھلے اینویں جیویں کُرڑے ہوئے مکئی دے سٹے دی بُت......

اُتوں کنوں تلے تک نگاہ ماروتاں اینویں جیویں ودھرکل مولی......

مرن دی مار دے بعد ناز و، ناز و نہ رہیا، بھنے وتاواں دا بر تھا بن گیا......''

تے آکھیاں بیاں خوبصورت تشبیہاں، پرانے لہجے دی مٹھاس، ماضی دیاں کڈاہیں نہ بھلن والیاں یادگاراں جیڑھیاں آندے وقتاں اچ مثالاں تے نمونے ہوسن۔ ایہہ ساریاں لفظی امانتاں، آون والیاں نسلاں واسطے اُنہاں پوری دیانتداری نال اپنے افسانیاں وچ اکور چھوڑن۔ کل کلاں کوں افسانے دا کوئی محقق، سرائیکی افسانے دی پٹ پھرول کریسی تاں اوندی تحقیق دا چھیکڑی ڈاکا حفیظ خان دے افسانے ای ہوسن۔

ویلے دے منہہ زور ریلے اچ اساں رہوں نہ رہوں حفیظ خان دے افسانے ہمیشہ رہسن۔ ہمیشہ پڑھے ویسن تے آون والیاں نسلاں انہاں کوں پڑھ تے جتھاں اج دی ٹھیٹھ سرائیکی زبان دی چس چیسن اُتھاں اُنھاں کوں انسانیت تے انسان دی فلاح واسطے ڈھیر سارے سبق وی ملسن۔

واہ حفیظ خان واہ......!

O

(21مارچ2009ء)

حفیظ خان بحیثیت ڈراما نگار

(اردو مضامین)

حفیظ خان کا ڈرامائی فن

ڈاکٹر اے بی اشرف

سرائیکی ڈرامے میں حفیظ خان کا کارنامہ قابل تحسین ہے کہ دور جدید میں ان کی زیر نظر کتاب
،جوان ان کے سرائیکی ریڈیائی ڈراموں پر مشتمل ہے، اوّلین ڈرامائی کتابوں میں شمار ہوتی ہے
۔سرائیکی علاقہ ڈرامائی تخلیق کی اوّلین مرزبوم ہے۔جہاں برصغیر پاک وہند کی ابتدائی ڈرامائی
،نمائشیں اور نقوش ظاہر ہوئے۔رگ وید پہلی کتاب ہے جس میں ڈرامے کے ابتدائی نقوش کا پتہ
چلتا ہے۔اس میں بیانیہ ڈرامے کی مثالیں ملتی ہیں اور علامہ عتیق فکری اور مرزا ابن حنیف کی تحقیقات
کے مطابق رگ وید کا بیشتر حصہ ملتان کے آس پاس کے علاقے میں لکھا گیا۔گویا سرزمین ملتان ڈرا
مائی فن کا پہلا منبع اور سرچشمہ قرار دی جا سکتی ہے۔یہاں تک کہ سنسکرت زبان کے اہم ترین شاہکار
''شکنتلا'' کے سلسلے میں بھی ملتان کا نام لیا جاتا ہے۔عہد قدیم میں ملتان ڈرامائی فن کا نہایت اہم
ماخذ رہا ہے۔بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قبل از اسلام اور اسلام کے بعد بھی ڈرامائی فن سرزمین ملتان کی
ثقافتی زندگی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔مسلمانوں کے دور حکومت میں بھی یہ فن باقاعدہ پروان چڑھتا
رہا۔قبل از اسلام زیادہ تر ڈرامے مذہبی نوعیت کے ہوتے تھے کیونکہ ان سے مذہبی تبلیغ کا کام لیا جاتا
تھا۔برہمن اور مذہبی پیشوا تک اس میں حصہ لیتے تھے۔ لیکن بعد میں معاشرتی اور سماجی موضوعات پر

منی ڈرامے بھی اسٹیج پر پیش کیے جانے لگے۔ ہندوستان کے کونے کونے سے مختلف تھیٹریکل کمپنیاں ملتان آئیں اور مدتوں ڈرامے پیش کرتی رہیں۔ خود یہاں بھی کئی تھیٹر قائم ہوئے۔ ان تھیٹروں پر یہاں کی مشہور رومانی داستانیں ڈرامائی شکل میں پیش کی جاتی تھیں۔ ریڈیو کی آمد سے یک بابی ڈراموں کا رواج عام ہوا اور ریڈیائی ڈرامے لکھے جانے لگے۔ حفیظ خان کا شمار ملتان کے ان ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ریڈیو کے لیے ڈرامے تخلیق کیے اور سرائیکی علاقے کی نسبت سے سرائیکی ڈرامے لکھے۔ زیرِ نظر کتاب ان کے سرائیکی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ یہ ڈرامے ریڈیو پر پیش کیے گئے اور بے حد مقبول ہوئے۔

حفیظ خان کے زیرِ نظر ریڈیائی ڈراموں کے موضوعات عام زندگی سے متعلق ہیں۔ ان میں کوئی عجیب و غریب واقعات بیان نہیں ہوئے بلکہ عام انسانوں کے مسائل، ہمارے اردگرد کی زندگی کا عکس ہماری چھوٹی چھوٹی خوشیاں، رنجشیں، کدورتیں، نیکیاں اور برائیاں یعنی وہ سب کچھ جو ہمیں روزمرہ زندگی میں پیش آتا ہے یا جس کا مشاہدہ ہم روزانہ کر رہے ہیں حفیظ خان کے ڈراموں کے موضوعات ہیں۔ ''پہلے پتراں دی بہار'' محبت کی کہانی ہے۔ عمران اور شہلا ریل گاڑی کے سفر کے دوران ملتے ہیں یہ ملاقات زیادہ خوشگوار نہیں ہوتی۔ عمران شہلا کا خالہ زاد ہے لیکن دونوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ عمران گھر ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچتا ہے تو دونوں کا رومان شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن شہلا کا باپ دونوں کی محبت میں حائل ہو جاتا ہے اور شہلا کی شادی قیصر سے کر دی جاتی ہے جو خود کسی دوسری لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ شہلا قیصر سے نبھا نہیں کر سکتی اور آخر دونوں میں طلاق ہو جاتی ہے۔ شہلا خوش ہے کہ اب وہ عمران کے ساتھ زندگی گزار سکے گی لیکن گھر پہنچتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ عمران کی شادی کا کارڈ آیا ہوا ہے۔ عمران نے زندگی بھر انتظار کا جو وعدہ کیا تھا وہ جھوٹا تھا اس نے چھ ماہ بھی انتظار نہ کیا اور ایک ایسی لڑکی سے شادی کر لی جس کو شہلا سے محبت کے دوران ہی میں چکر دے رہا تھا۔ شہلا شروع میں ایک چڑچڑی اور بدمزاج لڑکی دکھائی دیتی ہے لیکن اس کی کایا کلپ ہوتے دیر نہیں لگتی اور عمران سے ٹوٹ کر محبت کرنے لگتی ہے۔ لیکن جب اس پڑھی لکھی لڑکی کی شادی قیصر سے ہوتی ہے تو وہ سوائے رونے کی کوئی احتجاج نہیں کرتی اور چپکے سے ڈولی میں بیٹھ جاتی ہے۔ شادی کے بعد عمران کی یادیں

اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں اور وہ ہر وقت آنسو بہاتی رہتی ہے۔ نتیجہ طلاق ہوتا ہے۔ اب اس کے خوابوں کی تعبیر قریب ہے لیکن اس کے خواب ٹوٹ جاتے ہیں جب ماں کی زبانی پتا چلتا ہے کہ عمران کی شادی کا کارڈ آچکا ہے۔ اسی طرح وہ ایک مظلوم لڑکی بن جاتی ہے۔ شہلا کے کردار میں کوئی انفرادیت نہیں ہے۔ وہ رومانی Passive اور کمزور کردار ہے اس میں توانائی نہیں ہے۔ وہ حالات کے سامنے سینہ سپر ہونے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ یہاں تک کہ اپنی مرضی کے بغیر شادی کے وقت وہ ایک بے بس لڑکی دکھائی دینے لگتی ہے۔ شروع میں چڑچڑے پن کا مظاہرہ اور بعد میں رونا دھونا اس کا شعار ہے۔

عمران شروع شروع میں ایک شوخ وشنگ اور ذہین نوجوان نظر آتا ہے لیکن دراصل وہ ایک دغا باز اور چالاک آدمی ہے وہ ایک طرف تو شہلا کو چکر دیتا ہے اور دوسری طرف ایک اور لڑکی سے بھی محبت کی پینگیں بڑھاتا ہے۔ اس میں خلوص کی کمی ہے وہ ایک خوش باش اور رومان پسند نوجوان ہے۔ جب شہلا کی شادی قیصر سے طے ہوتی ہے تو وہ کوئی احتجاج نہیں کرتا۔ رومانی اور المیہ مکالمے بولنے کے باوجود جب شہلا کی شادی ہوجاتی ہے تو وہ بھی اپنی شادی کی تیاری شروع کر دیتا ہے۔ اس میں ہیرو کی خوبیاں نہیں ہیں۔ وہ ایک عام سا رومانی نوجوان ہے جس کا ماٹو یہ ہے کہ

تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

یہ کردار حقیقت سے زیادہ قریب ہے جبکہ شہلا خواب پرست اور مثالیت پسند ہے۔ ڈرامے میں بار بار فلیش بیک کی تکنیک استعمال کر کے سچویشن کو سنجیدہ لیکن دلچسپ بنایا گیا ہے۔ ڈرامائی سچویشن بار بار ابھرتی ہے۔ ریڈیائی ڈرامے کی تکنیک کے اعتبار سے یہ ڈرامہ معیاری ہے اور مطلوبہ تاثر پیدا کرنے میں یقیناً کامیاب ہے۔

"ریشم دی کلھی تند" میں سات منظر ہیں۔ پہلے منظر میں دو کردار سلمان اور عزیز مکالمے کرتے اور جھیل پر جانے کا پروگرام بناتے ہیں۔ دوسرے منظر میں دونوں دوست جھیل پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ایک لڑکی جھیل میں گر جاتی ہے۔ سلمان اسے بچانے کے لیے جھیل میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ تیسرے منظر میں ثوبیہ سلمان کو اپنی زندگی کے بارے میں بتاتی ہے۔ چوتھے منظر میں دونوں پھر جھیل کی طرف

جاتے ہیں اور دونوں خود کلامی کے ذریعے ایک دوسرے کی محبت کا اقرار کرتے ہیں۔لیکن دو
زبان سے اقرار نہیں کرتے۔ پانچویں منظر میں عزیز اور سلمان کا مکالمہ ہے۔سلمان عزیز کے سا
ثوبیہ کی محبت کا اقرار نہیں کرتا۔ چھٹے منظر میں عزیز اور ثوبیہ کا مکالمہ ہوتا ہے۔ثوبیہ عزیز کے سامنے
سلمان سے اپنی محبت کا اقرار نہیں کرتی ۔ساتویں اور آخری منظر میں ثوبیہ اور عزیز سول میرج کر ل
ہیں اور یوں ڈرامہ دلچسپ انداز میں اختتام کو پہنچتا ہے۔

اس ڈرامے کا تھیم یہ ہے کہ دل میں محبت کا روگ لے کر گھٹ کر مرنے والے لوگ ناکام رہتے
ہیں۔محبت میں Initiative اور جرأت اظہار کی ضرورت ہے۔سلمان بے زبان محبت کرتا ہے جبکہ
محبت کو زبان کی ضرورت ہے۔اس کے مقابلے میں عزیز جرأت اظہار رکھتا ہے۔سلمان مثالیت پسند
ہے،خدمت گزار ہے، گہری محبت کرنے والا نوجوان ہے اور اس معاشرے کو ایسے آئیڈیالسٹ کی
ضرورت نہیں ہے۔ ہماری سوسائٹی میں ایسا انسان ناکام و نامراد رہتا ہے۔اس کے مقابلے میں عزیز
زندگی کی حقیقتوں پر نظر رکھتا ہے وہ عملی انسان ہے۔مثالیت پسند نہیں ہے اس کی عملیت پسندی اسے
ایک کامیاب انسان بناتی ہے۔وہ جرأت اور بے باکی کا حامل ہے،حقیقت پسند ہے،زندگی کو ایک
ریالسٹ کی طرح لیتا ہے اس لیے کامیاب ہے۔ہمارے معاشرے میں شریف اور بے زبان انسان
گھاٹے میں رہتا ہے۔جو اپنا حق منوانا جانتا ہے کامیاب و کامران ہے۔عزیز ایسا ہی انسان ہے۔یہ
نہیں کہ اس میں خلوص کی کمی ہے وہ اپنے دوست سلمان اور ثوبیہ دونوں کی مدد کرنا چاہتا ہے وہ دونوں کا
چارہ ساز بنتا ہے لیکن جب دونوں حقیقت کا اعتراف نہیں کرتے تو وہ خود آگے بڑھتا ہے اور ظاہر ہے
جو بڑھ کر ہاتھ میں ساغر اٹھا لے مینا اسی کا ہے۔

''کچ دیاں ماڑیاں'' آج کل کے نوجوانوں کی نفسیات کا ڈرامہ ہے لیکن محض نفسیاتی
موشگافیوں سے عبارت نہیں ہے۔اس میں معروضی حقائق کے نتیجے میں ابھرنے والے نفسیات کا ذکر
ہے۔انسان معاشرتی مجبوریوں کی بنا پر کمینی حرکتوں پر اتر آتا ہے۔کیونکہ حالات اسے مجبور کر دیتے
ہیں ۔دولت کی ناہموار تقسیم اور غلط نظام اقدار خرابیوں کو جنم دیتا ہے سلیم بھی معاشرتی جبر کا شکار
ہے۔ایم اے پاس ہونے کے باوجود ملازمت سے محروم ہے۔تین نسلوں سے غریبی کی چکی میں پس

رہا ہے۔ وہ برا انسان نہیں ہے لیکن حالات نے اسے جکڑ دیا ہے۔ اس لیے وہ ثروت سے فریب کرنا چاہتا ہے تا کہ اپنی غریبی کو دور کر سکے۔ اپنی ماں اور غریب منگیتر ناہید کے لیے دنیا جہاں کی خوشیاں خرید سکے۔ ان کا مستقبل محفوظ کر سکے۔ لیکن اس مثبت خواہش کو پورا کرنے کا طریق کار بھی مستحسن نہیں ہے۔ وہ لالچ کے تحت دولت مند ثروت سے شادی کے لیے اس کے ساتھ گلگت چلا جاتا ہے لیکن شادی کے فوراً بعد ثروت اس سے زبردستی طلاق حاصل کر لیتی ہے تا کہ اپنے اصل عاشق ناصر سے شادی کر سکے اور باپ کی عجیب وغریب وصیت کے مطابق جائیداد کی مالک بن سکے۔ گویا صیاد بننے والا سلیم خود اپنے دام میں اسیر ہو گیا۔

ڈرامے میں عام فلموں جیسا انداز موجود ہے۔ جائیداد کے حصول کے لیے شرط کا پورا کرنا۔ ماڈرن لڑکی کی مکاری اور فریب کاری۔ جیسا کہ کہا گیا ہے حفیظ خان کے ڈراموں کے موضوعات عام زندگی کے واقعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ وہ ان واقعات میں رومانی رنگ بھر دیتے ہیں۔ ہیرو ہیروئن کی حادثاتی ملاقات، شوخ وشنگ مکالمات، رومانی سچویشن، دوستوں کی بے تکلفی اور خلوص، لاڈ پیار کے نام، دولت کی خواہش، راتوں رات امیر بننے کی حسرت، اتفاقی ملاقاتیں، ظاہر داری اور نمود ونمائش، تصنع اور تکلفات یعنی آج کی زندگی کے حقیقی حوالے ان ڈراموں میں موجود ہیں۔

''پچھاویں'' بیک وقت جھوٹے رومانوں اور سچی محبتوں کی کہانی ہے۔ جمال حسن پرست اور رومان پسند دولت مند نوجوان ہے۔ باپ کی اکلوتی اولاد، تین شادیاں کر چکا ہے، چوتھی کی تیاری میں ہے کہ حادثے کا شکار ہو کر ٹانگ سے محروم ہو جاتا ہے، اس کی منگیتر فرزانہ اس لنگڑے سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس لیے منگنی توڑ لیتی ہے۔ جبکہ جمال کی پہلی منگیتر غریب چچا کی بیٹی فوزیہ (جو نرس بن چکی ہے) اس کی خدمت کرتی اور اس کا سہارا بننے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ جمال کو اپنی بے وفائی کا بدلہ فرزانہ کی بے وفائی کی صورت میں ملتا ہے۔ حفیظ خان نیکی اور بدی کی کشمکش میں نیکی کی فتح کا قائل ہے۔ وہ محبت اور خلوص کے رشتوں کو مستحکم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ڈراموں میں دوستوں میں بڑا خلوص نظر آتا ہے۔ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں ان کی گفتگو میں شوخی اور

بے آہنگی کا رنگ ہوتا ہے۔ ان کے مکالمات اس طرح کے ہوتے ہیں کہ وہ دوست کم اور عاشق ومحبوب زیادہ دکھائی دینے لگتے ہیں ۔ پچھاویں کا جمال ......رنگوں کا دلدادہ ،خوشبوؤں کا پجاری ،ہنگاموں کا رسیا ہے لیکن اس میں تصنع بھی ہے اور خود غرضی بھی ۔ گویا دولت مندوں کی ساری عادتیں اس میں موجود ہیں ۔لیکن دوسروں کو دھوکا دینے والا جب ایک حادثے میں معذور ہوتا ہے تو سارے حوصلہ ہار بیٹھتا ہے ۔مایوسیوں میں گھر کر زندگی کرنے کا چلن بھی بھول جاتا ہے ۔فرزانہ بھی اسی کا عکس ہے۔اس میں بھی ساری عادتیں اس جیسی ہیں ۔دونوں میں کوئی فرق نہیں سوائے صنف کے ۔ان کے مقابلے میں غریب فوزیہ استقامت ،وفا اور خلوص کا پیکر ہے ۔خدمت گزاری جس کا شعار اور نبھاہ جس کا وطیرہ ہے۔ڈرامے میں اس کا کردار نیکی اور خیر کی اقدار کا نمائندہ ہے۔

''ڈوڈونڑیں ہک''میں ظاہرداری اور کھوکھلی شان وشوکت کا مظاہرہ کرنے والوں کا پول کھولا گیا ہے ۔جو لوگ اپنی اوقات سے بڑھ کر اونچی اڑان کی کوشش کرتے ہیں ،منہ کے بل گرتے ہیں۔ڈرامے کا پہلا منظر کھلتا ہے تو دانش جلیل ،سعدیہ اور فوزیہ کا تعارف ہوتا ہے۔ان کی گفتگو سے تفاخر ٹپکتا ہے۔بزنس،کار،وی سی آر اور دولت کی باتیں ہوتی ہیں۔سعدیہ اور فوزیہ پہلی ہی جھلک میں سراب دکھائی دیتی ہیں۔عرفان بھی اس منظر میں ایک جھلک دکھاتا ہے لیکن فوزیہ اس سے نفرت کا اظہار کرتی ہے۔دوسرا منظر دانش اور عرفان کے کوارٹر کا ہے ۔یہاں انکشاف ہوتا ہے کہ دانش اور عرفان دونوں غریب گھر کے لڑکے ہیں، پچاس روپے ماہوار کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔دانش فراڈ لڑکا ہے جو فوزیہ کو دولت مند باپ کی اکلوتی بیٹی تصور کر کے اس سے شادی کا آرزومند ہے تاکہ راتوں رات دولت مند بن سکے۔عرفان میں نیکی کا جذبہ موجود ہے وہ اسے سمجھاتا ہے لیکن دونوں کا فلسفہ محبت مختلف ہے۔

تیسرے منظر میں یہ دلچسپ انکشاف ہوتا ہے کہ بات بات پر ڈھینگیں مارنے والی فوزیہ بھی غریب گھر کی لڑکی ہے۔اس کا باپ ریٹائرڈ آدمی ہے اور پنشن کی رقم بھی ختم ہو چکی ہے ۔کرائے کا مکان ہے۔فوزیہ اپنی دانست میں دانش کو چکر دے رہی ہے۔تاکہ دولت مند لڑکے سے شادی کر کے اپنا مستقبل سنوار سکے۔چوتھے منظر میں دانش اور فوزیہ کی ملاقات ہوتی ہے دونوں ایک دوسرے کو چکما

رہے ہیں پانچویں اور آخری منظر میں دونوں کا پول کھل جاتا ہے اور ڈرامہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

حفیظ خان ہر ڈرامے میں کوئی نہ کوئی اخلاقی اور معاشرتی نکتہ ضرور پیش نظر رکھتے ہیں۔ عام زندگی کے تناظر میں کوئی واقعہ نامانوس اور عجیب دکھائی نہیں دیتا اور نہ کوئی کردار اجنبی نظر آتا ہے بلکہ سب کچھ دیکھا بھالا اور برتا ہوا لگتا ہے۔

بحیثیت مجموعی حفیظ خان کے ڈرامے عظیم موضوعات کے حامل نہ سہی لیکن دلچسپی ان سب ڈراموں کی بنیادی خوبی ہے۔ جا بجا ڈرامائی سچویشن پیدا کرنا، واقعات کو دلچسپ موڑ دینا، کرداروں کو زندگی کے حقیقی تناظر میں پیش کرنا اور انسانی جذبوں کا صحیح ادراک کرنا حفیظ خان کو آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سارے ڈرامے ہمیں اپنی ہی زندگی کا عکس دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں ایک مانوس فضا، ماحول اور تناظر موجود ہے۔ محبت، خلوص، انسانیت، مروت اور دردمندی کے جذبوں کے ساتھ ساتھ نفرت، کدورت، بے وفائی، کمینگی اور منافقت کے پہلو بھی نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح ان ڈراموں میں زندگی اپنے حقیقی پس منظر میں نمایاں ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ زندگی ہشت پہلو ہے۔ تصویر زیست میں کوئی ایک رنگ نہیں ہے۔ اس میں مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ حفیظ خان نے اپنے ڈراموں میں جس زندگی کو پیش کیا ہے اس میں ہر رنگ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ زندگی واقعی زندگی نظر آئے۔ خواب وخیال کی دنیا نہ بن جائے۔

موضوعات کی طرح ان ڈراموں کے کردار بھی مثالی نہیں ہیں۔ ان میں حقیقی زندگی کے انسان زیادہ ہیں...... یہ سب کردار زندگی سے بہت قریب ہیں۔ ان میں عام انسانوں کے رویے موجود ہیں۔ وہ بیک وقت نیکی اور برائی کے پیکر ہیں۔ وہ بشری تقاضوں سے ماورا یا بے نیاز نہیں ہیں بلکہ ان تقاضوں کے تحت ان کی شخصیت کے رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ یہ کردار واقعات کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں جو عام انسان حقیقی زندگی میں کرتا ہے۔ ان کرداروں میں ٹوٹ کر محبت کرنے والے دوست بھی ہیں۔ ان میں بے وفا محبوب ہرجائی اور دغا باز عاشق بھی ہیں۔ کچھ محبت کرنے والی ہستیاں بھی ہیں اور کدورتیں پھیلانے والے انسان بھی۔ ان میں معاشرتی جبر کے شکار لوگ بھی اور ہمت والے کردار بھی۔

ان ڈراموں میں مکالمات ڈرامائی سچویشن کے مطابق لائے گئے ہیں۔رومانی مکالمات زیادہ ہیں جن میں کبھی کبھی تصنع کا رنگ نظر آنے لگتا ہے۔لیکن دراصل ڈرامائی مکالمات میں مثالیت کا رنگ پیدا ہوجانا قدرتی امر ہے۔دنیا کے تمام بڑے بڑے ڈرامہ نگاروں کے یہاں اس قسم کے مکالمات پائے جاتے ہیں۔حفیظ خان مکالمات میں بے تکلف گفتگو کا انداز اختیار کرتے ہیں۔خصوصاً دوستوں یا محبت کرنے والوں کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے اس میں یہ اسلوب زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ عاشق اور محبوب کے مکالموں میں البتہ کہیں کہیں فلمی رنگ درآتا ہے۔اسی طرح جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ دوستوں کے مکالموں میں بے تکلفی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ ان میں کبھی کبھی سطحی رنگ پیدا ہوجاتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی شائستگی اور متانت قائم رہتی ہے۔

حفیظ کے ڈراموں میں خارجی اور باطنی تصادم ملتا ہے۔یہ تصادم خیر وشر، عشق اور فرض، محبت اور کدورت کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔وہ ہر برائی کے پیچھے معاشرتی جبر اور نفسیاتی عوامل ومحرکات کو فراموش نہیں کرتے۔جب بھی کہیں کوئی غیر معمولی بات ہوتی ہے تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوتا ہے۔وقوعات کے پس منظر میں علل اور اسباب سے صرف نظر نہیں کیا کیا جاسکتا۔حفیظ خان اس حقیقت کو فراموش نہیں کرتے۔خودکلامی کا استعمال بھی انکے ڈراموں میں ملتا ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ڈرامہ بنیادی طور پر ایک عوامی چیز ہے۔(Function of the Crowd)اور عوامی فن کے لیے خام مواد کی فراہمی عوامی زندگی سے ہوتی ہے۔حفیظ خان نے اپنا سارا مواد سامنے کی زندگی سے لیا ہے اور اسے فن کے روپ میں دلچسپ اور خوبصورت بنا کر ہمیں لوٹایا ہے۔

O

(29دسمبر 1986ء)

کچ دیاں ماڑیاں

میرزاادیب

یہ حفیظ خان صاحب کے سرائیکی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ مجموعے میں کل چھ ڈرامے ہیں۔ حفیظ خان 1976ء سے 1980ء تک ریڈیو پاکستان بہاولپور اور ملتان میں بطور صداکار اور ڈرامہ نگار کے کام کر چکے ہیں۔ یہ ڈرامے انھوں نے اس مدت میں تحریر کیے ہیں جو نشر ہو کر بہت مقبول ہوئے تھے۔ مصنف نے اب انہیں کتابی صورت میں محفوظ کر دیا ہے۔

اس مجموعے کے آغاز میں خان رضوانی صاحب نے بتایا ہے کہ سرائیکی ڈرامے کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ سرائیکی ڈرامے کو سٹیج ڈرامے کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے۔ اور یہ اعزاز جناب حفیظ خان کو حاصل ہے کہ انھوں نے سرائیکی کو نشریاتی لب ولہجہ دیا ہے، اور یہ سارے ڈرامے ریڈیو کی مخصوص تکنیک سے ہم آہنگ ہیں۔

حفیظ خان نے اپنے ان ڈرموں میں موجودہ دور کے ان مسائل کو پیش نظر رکھا ہے جن کا سامنا پاکستان کے ہر حصے میں عوام کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا اور اہم مسئلہ بے روزگاری ہے۔ بے روزگاری میں انسان کیا کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، ڈرامہ نگار نے اس کا معاشی سطح پر بھی اور نفسیاتی سطح پر بھی حقیقت پسندانہ انداز سے جائزہ لیا ہے۔

اس مجموعے کا نام جس ڈرامے کے عنوان پر رکھا گیا ہے اس کا نام ہے '' کچ دی ماڑیاں''

مجموعے میں یہ تیسرا ڈرامہ ہے اور اس میں مصنف نے مرکزی کردار سلیم کے حوالے سے بتایا ہے کہ
ایک پڑھا لکھا آدمی جب حصول تعلیم کے بعد سینے میں بڑی امنگیں اور ولولے لے کر عمل کے میدان
میں اترنے کی کوشش کرتا ہے تو زندگی کے تلخ حقائق کس طرح اس کے خوابوں کو چکنا چور کر دیتے ہیں
اور پھر جانتے بوجھتے ہوئے بھی وہ ایسی پستیوں میں جا پہنچتا ہے جس کا تصور بھی ایک مہذب اور تعلیم
یافتہ نوجوان کے ذہن میں نہیں آ سکتا۔ سلیم کی دلی آرزو ہے کہ وہ گھر کا غربت زدہ ماحول بدل
ڈالے، اسے ماں کی بے چارگی بہت ستاتی رہتی ہے۔ اسے اپنی منگیتر ناہید سے قلبی محبت ہے اور
اسے شادی کے بعد، زندگی کی آسائشیں مہیا کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ اس کی تعلیم کے بعد اس کے نیک
ارادے اور اس کی نیک نیتی کے تصورات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اس لیے وہ اپنی
خواہشات کی تکمیل کے لیے ایک ایسا راستہ اختیار کرتا ہے جو خطرناک بھی ہے اور شرمناک بھی۔ وہ
ایک دولت مند لڑکی ثروت کو اپنی تمناؤں کی تکمیل کا ذریعہ بنا کر اس سے شادی کر لیتا ہے مگر یہ شادی
صرف ایک رات کی رہتی ہے کیونکہ صبح ہی اس کی بیوی ثروت اس کے ہاتھ میں طلاق نامہ تھما دیتی
ہے۔ اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد حاصل کرنے کی خاطر اس نے، باپ کی وصیت پوری کرنی
ہوتی ہے اور وصیت یہ ہے کہ ثروت اس لڑکے سے ہرگز شادی نہ کرے جس کا نام ناصر خان ہے اور
جسے ثروت دل سے چاہتی ہے مگر اس کا باپ اسے پسند نہیں کرتا۔ البتہ مرحوم باپ نے یہ اجازت
ضروری ہے کہ اگر اس کا شوہر مر جائے تو پھر وہ ناصر خان سے بیاہ کر سکتی ہے۔
ثروت اس منصوبے پر عمل پیرا رہتی ہے۔ گویا ثروت اور سلیم کے اپنے اپنے منصوبے ہیں دونوں کو
ایک دوسرے تعلق خاطر نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اپنے منصوبے کے پیش نظر ایک دوسرے کو بے وقوف بناتے
ہیں۔ ثروت تو اپنے منصوبے پورے کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ سلیم بری طرح ناکام ہوتا ہے۔
''پچھاویں'' حفیظ خان صاحب کا ایک ایسا کھیل ہے جو زندگی کی ایک بڑی تلخ حقیقت سامنے
لاتا ہے۔ جمال خود کو بڑا خوش قسمت آدمی سمجھتا ہے کہ فرزانہ جیسی دولت مند لڑکی کو اپنی رفیقہ حیات بنا
رہا ہے مگر یکا یک ایک حادثے میں اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہو جاتا ہے۔ جمال کی پہلی منگیتر جو ایک
غریب گھرانے کی لڑکی ہے اور جس کی نظروں میں زندگی کی اعلیٰ اقدار کی بڑی وقعت ہے جب دیکھتی

ہے کہ اس کا منگیتر ہسپتال میں بے یار و مددگار پڑا ہے تو وہ نرس بن کر اس کی خدمت کرتی ہے۔ آخر میں جمال کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ جب وفا پرست فوزیہ اس سے کہتی ہے۔

''میں جمال، اٹھو، اٹھو۔ میڈے سہارے اٹھو، تُساں زندہ راہسو، آزمائش وچ گھبرانیں ونجیندا، تہاڈی فوزیہ تہاڈی امانت ہے۔ تہاڈی منتظر ہے۔ صرف تہاڈی منتظر ہے''۔

''ڈوڈونڑیں ہِک'' ڈرامے کا دانش ایک غریب نوجوان ہے۔ فوزیہ بھی ایک یتیم بے آسرا اور بے سہارا لڑکی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنی جھوٹی امارت کے قصے سنا سنا کر اس حد تک متاثر کر لیتے ہیں کہ وہ شادی پر رضامند ہو جاتے ہیں۔ دانش سوچتا ہے کہ وہ دولت مند فوزیہ کو شریک حیات بنا کر اعلیٰ درجے کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائے گا اور یہی توقع فوزیہ کے ذہن میں بھی ہے وہ بھی یہ توقع رکھتی ہے کہ جب دانش اس کی زندگی میں داخل ہو جائے گا تو اس کے چھوٹے گھر کی قسمت ہی بدل جائے گی۔

مگر حقیقت کیسے اور کب تک چھپی رہ سکتی ہے۔ اصل حقیقت ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ ڈرامہ نگار نے آج کل کے پست ہمت اور حقیقت ناشناس نوجوانوں کی ذہنی کیفیت اور اس ذہنی کیفیت کے عوامل و محرکات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

حفیظ خان بات کہنے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں۔ ڈرامے کے تقاضوں سے اچھی طرح واقف ہیں اور ان فنی تقاضوں کا ڈرامے کے دوران تحریر بڑا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں کرداروں کا خارجی اور باطنی تصادم بھی ملتا ہے اور وہ ہر کردار کے رول پر پوری توجہ دیتے ہیں ریڈیو سے ایک مدت سے عملی وابستگی کی وجہ سے وہ ریڈیو ڈراما کی تکنیک پر اچھی قدرت رکھتے ہیں۔

اس مجموعے میں رحیم طلب، خان رضوانی اور محترمہ فرحت نواز کے دیباچے ہیں، خود مصنف نے بھی مختصر طور پر اپنے ان ڈراموں کے بارے میں لکھا ہے۔

ڈاکٹر اے بی اشرف جو ڈرامے کے نامور نقاد اور محقق ہیں انھوں نے حفیظ خان صاحب کے فن ڈرامہ نگاری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

O

(ماہنامہ کتاب، لاہور، اپریل 1990ء)

کچ دیاں ماڑیاں

امجد اسلام امجد

سرائیکی لہجے کی مخصوص نرمی اور نگھ نے مجھے ہمیشہ ہی بہت متاثر کیا ہے۔ خواجہ غلام فرید صاحب کی کافیوں کی معرفت اس لہجے کی خوشبو سرائیکی بولنے والے علاقوں سے باہر نکلی اور پھر پھیلتی ہی چلی گئی۔ حفیظ خان کے ڈراموں کا یہ مجموعہ ''کچ دیاں ماڑیاں'' بھی اسی تسلسل کی ایک کڑی ہے اگرچہ اس کے موضوعات بیسویں صدی کے بدلتے ہوئے اقدار نظام اور مشینوں کی حکومت سے پیدا ہونیوالے آشوب سے لیے گئے ہیں اور اس کا میڈیم یعنی ذریعہ اظہار بھی ریڈیو جیسی ایک جدید سائنسی ایجاد ہے مگر علاقے کی مخصوص خوشبو اور ایک بھرپور لہجے کی مہک نے ان ڈراموں میں ایک انوکھی جاذبیت پیدا کر دی ہے۔

حفیظ خان کے ریڈیائی ڈرامے سرائیکی زبان کے بھرپور اور روشن مستقبل کی طرف کھلنے والا ایک ایسا دروازہ ہیں جس کے اس پار امکانات کا ایک جہاں تازہ انگڑائیاں لیتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

O

(23 جنوری 1987ء)

جدید سرائیکی ڈرامے کی اوّلیں کتاب

ریاض خواجہ

رگ وید برصغیر کی پہلی کتاب ہے جس میں ڈرامے کی ابتدائی شکلیں ملتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ رگ وید کا بیشتر حصہ ملتان کے آس پاس کے علاقے میں لکھا گیا۔ سنسکرت کے شاہکار ڈرامہ ''شکنتلا'' کے سلسلے میں بھی ملتان کا نام لیا جاتا ہے۔ اس طرح سرائیکی علاقہ برصغیر میں ڈرامے کی جنم بھومی ہے۔ ڈرامہ ابلاغ کا ایک موثر ذریعہ رہا ہے۔ اس سے مذہبی تبلیغ کا کام بھی لیا جاتا رہا ہے اور سماجی اصلاح کا بھی۔ سرائیکی علاقے میں جہاں بے شمار مقامی ''نٹ پارٹیاں'' کھیل کرتی رہی ہیں وہاں ہندوستان کے دوسرے حصوں سے بھی تھیٹر آتے رہے ہیں۔ یہ عام طور پر رومانی داستانیں ڈرامائی شکل میں پیش کرتے تھے اور ان کا بیشتر حصہ منظوم ہوتا تھا۔ یہ ڈرامے کتابچوں کی شکل میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ پچھلی تین چار دہائیوں میں جدید طرز کے سرائیکی ڈرامے بھی لکھے گئے اور کچھ سٹیج بھی ہوئے۔ ملتان، بہاولپور اور پھر ڈیرہ اسماعیل خان میں ریڈیو سٹیشن قائم ہوئے تو یہاں سے سرائیکی فیچر اور ڈرامے بھی نشر ہونے شروع ہو گئے اور یوں کئی ڈرامہ لکھنے والے سامنے آئے۔ ان کے ڈرامے ، ادبی رسالوں میں بھی شائع ہونے لگے لیکن جدید سرائیکی ڈراموں کی کوئی کتاب نہیں تھی۔ حال ہی میں سرائیکی ڈراموں کی دو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ جن میں پہلی حیفظ خان کی '' کچ دیاں ماڑیاں'' اور

دوسری مسرت کلانچوی کی ''سنج صباحیں''۔

حفیظ خان کی کتاب '' کچ دیاں ماڑیاں ''میں ان کے چھ ریڈیائی ڈرامے '' ڈوڈونڑیں ہک'' پچھانویں '' کچ دیاں ماڑیاں '' ، '' ریشم دی کلھی تند '' ، '' بھر دی کندھ '' اور '' پیلے پتراں دی بہار '' شامل ہیں ان کے موضوعات ہماری اردگرد کی زندگی سے لیے گئے ہیں ۔لیکن رومان ان سب پر غالب ہے۔ان ڈراموں میں دلچسپ رومانی کہانیوں والا سارا مسالہ موجود ہے ۔یعنی ہیروئن کی حادثاتی ملاقات،شوخ وشنگ مکالمات پھر دولت یا رقیب کی دیوار اور بالآخر المیہ یا طربیہ انجام ۔ہماری مقبول فلموں والے انداز کے اتفاقات حفیظ خان کے ڈراموں میں دلچسپی پیدا کرتے ہیں ۔لیکن ان میں کوئی نہ کوئی اخلاقی نتیجہ ضرور ہوتا ہے۔ان میں بدی پر نیکی فتح پاتی ہے اور جھوٹ اور تصنع بے نقاب ہو کر رہتا ہے۔

'' پیلے پتراں دی بہار '' ایک بزدل لڑکی اور ایک ہرجائی لڑکے کی ناکام محبت کی داستان ہے '' ریشم دی کلھی تند '' ایسے لڑکے اور لڑکی کی کہانی ہے جن کی محبت صرف جرأت اظہار نہ ہونے کی وجہ سے ناکام ہو جاتی ہے۔'' کچ دیاں ماڑیاں '' ڈرامائی سچوایشنز سے پُر کہانی ہے ۔اس میں لڑکی کی محبت بھی بناوٹی ہے اور لڑکے کی بھی۔دونوں کے اپنے اپنے خفیہ مقاصد ہیں۔ '' پچھاویں '' ایک خودغرض حسن پرست نوجوان کی کہانی ہے جو معذور ہو جاتا ہے تو اس کی امیر محبوبہ اسے چھوڑ جاتی ہے لیکن غریب منگیتر سہارا دیتی ہے۔'' ڈوڈونڑیں ہک '' ظاہردار نوجوانوں کی کہانی ہے ۔اس میں لڑکی کے لیے لڑکے کی امارت میں کشش ہے تو لڑکا بھی لڑکی کی دولت کا دیوانہ ہے۔لیکن اختتام پر یہ کھلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو چکر دے رہے ہیں۔

ان سب ڈراموں میں نمایاں ترین بات حفیظ خان کے رومانی مکالموں کا '' والہانہ پن '' ہے حتیٰ کہ ان کے ڈراموں میں دوست بھی عاشق و معشوق کی طرح مکالمہ کرتے ہیں ۔یقیناً حفیظ خان بہت محبت کرنے والے انسان ہوں گے ۔بقول فرحت نواز '' حفیظ خان دا ہتھ ہولا اے پر ضرب کاری۔''

O

(ہفت روزہ اشاعت روزنامہ امروز، 20 اکتوبر 1989ء)

حفیظ خان اور سرائیکی ڈرامانگاری کا ارتقائی پس منظر

ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز

کسی بھی زبان کے ادب میں نثر، نظم کے بعد داخل ہوتی ہے۔ سرائیکی میں پہلے مذہبی کتابیں، قصے، مثنویاں اور پھر ڈرامہ لکھا گیا۔ ڈرامہ نگاری میں بھی پہلے نظم اور پھر نثر کا آغاز ہوا۔ یہ ڈرامے ''ہیر رانجھا''، ''سسی پنوں''، ''سوہنی ماہیوال''، ''لیلیٰ مجنوں'' اور ''مرزا صاحباں'' جیسے ہوتے تھے جو سٹیج کیے جاتے تھے۔ یہ ناٹک بستی بستی شادی، خوشی کے موقع پر دکھائے جاتے تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے صرف ملتان میں ہی سرائیکی ڈرامہ سٹیج کرنے والے تیرہ کلب موجود تھے۔ جن میں ''خدا دوست'' ''سخی بادشاہ''، ''پورن'' وغیرہ سٹیج کیے جاتے تھے...... یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے مثلاً ۱۹۸۷ء میں سرائیکی لوک تماشا ملتان نے سانول کا ڈرامہ ''سجاک'' سٹیج کیا۔ کراچی میں بھی مختلف آرٹ پروڈکشنوں نے ظہور ملک کے لکھے ہوئے ڈرامے مثلاً ۱۹۹۲ء میں ''پٹ انگریزی تھانے'' ۱۹۹۳ء میں ''آؤ کوڑ کٹوں'' اور عبداللہ رحمان کے ''جھوکاں تھینسن آباد ول'' اور ''بختاور'' سٹیج کیے۔ یہ سلسلہ ۱۹۹۶ء میں ''ظلم دی بھاہ'' اور ۱۹۹۷ء میں ''کوڑے خواب'' سٹیج کرنے کی شکل میں جاری نظر آتا ہے۔ ان ڈراموں کو بھی ظہور ملک نے تحریر کیا ہے۔ اسی طرح ایک عرصے سے سرائیکی فلمیں بھی بننا شروع ہو چکی ہیں۔ ''دھیاں نمانیاں''، ''رب دا روپ''، ''سانجھ اساڈے پیار دی''، ''حیدر دلیر''، ''حاتو جٹ'' اور پھر رنگین فلموں میں ''خان بلوچ'' اور ''تھیوا'' نمائش کے لیے پیش ہو چکی ہیں۔

مطبوعہ سرائیکی ڈرامے کی ابتدائی تاریخ دیکھیں تو پہلے بڑے ڈرامہ نگار منشی غلام حسن [illegible] شہید ملتان (۱۸۴۸_۱۹۱۷ء) دکھائی دیتے ہیں ان کا ڈرامہ ''سخی بادشاہ'' جو نظم میں ہے اور دوسرا ڈرامہ ''قمر الزماں و شہزادی حسینہ'' جو نظم ونثر میں ہے۔ چوبیس چوبیس صفحے کے چھپے ہوئے موجود ہیں۔ دوسرے نمبر پر غلام سکندر خان غلام لشاری بلوچ (۱۹۰۸_۱۸۱۸ء) ہیں ان کا پہلا ناٹک جو کتابی شکل میں شائع ہوا۔ ''یوسف زلیخا غلام والا'' تھا اس کی ۷۶ سطروں میں ۵۵ سطریں نثر میں اور باقی نظم میں ہیں۔ تیسرا ڈرامہ نگار جس کے ڈرامے شائع شدہ صورت میں ملتے ہیں۔ سلطان الشعراء مولوی خلیفہ پیر بخش بیرن ملتانی ہیں۔ منظوم ڈراما ''روشن ضمیر'' کتابی سائز کے ۳۷ صفحوں میں اور نظم ونثر پر اور ''سوہنی ماہیوال'' پچاس صفحوں پر مشتمل ہیں۔ منشی کریم بخش واصل مظفر گڑھی (۱۹۷۶_۱۹۰۶ء) چوتھے بڑے ڈرامہ نگار ہیں۔ منظوم ڈرامہ ''خونی ماں'' ۳۲ صفحوں اور نظم ونثر پر مشتمل ''روشن ضمیر'' ۴۸ صفحوں کا ہے ان کا ڈرامہ ''ہیر رانجھا'' سرائیکی ڈرامہ نگاری کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

اس دوران پانچ دیگر ڈرامہ نگار اپنے ڈراموں سے سرائیکی ڈرامہ نگاری کی تاریخ میں اہم تبدیلیاں لاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں پہلے نمبر پر اللہ یار جوش ہیں جن کا منظوم ڈرامہ ''دلا بھٹی نوراں شہزادی'' ہے۔ دوسرے نمبر پر عبدالرشید آتے ہیں جن کے ڈرامے ''اسلامی ڈاکو عرف شیر دل مجاہد'' ''حاتم'' اور ''سخی لوہار'' تینوں منظوم ہیں۔ تیسرا ڈرامہ نگار مولوی قادر بخش گلزار ہے جس کے منظوم ڈرامے ''پورن بھگت'' اور ''سخی بادشاہ'' یادگار ڈرامے ہیں۔ ڈرامہ ''شیریں فرہاد'' نظم ونثر میں موجود ہے۔ چوتھے نمبر پر منشی نور محمد نورن گدائی (۱۹۷۶_۱۸۷۰ء) ہیں۔ ان کا منظوم ڈرامہ ''لیلیٰ مجنوں'' ہے۔ پانچویں نمبر پر قدیم سرائیکی ڈرامے کے سرخیل غلام رسول حسرت ملتانی ہیں جنھوں نے باقاعدہ ڈرامہ نگاری کا آغاز کیا اور ڈراموں میں نظم کے ساتھ ساتھ باقاعدگی سے نثر کو متعارف کرایا۔ یہ بات اس لیے بھی کہی جاسکتی ہے کہ ان کے ڈراموں میں نثر کی مقدار ان سے پہلے کے ڈرامہ نگاروں سے زیادہ ہے۔ ان کے ڈراموں میں ''سخی رنگ رنگیلا'' ''شان بسم اللہ فتح اسلام'' ''ظالم حسینہ'' ''عالم آراء'' ''عرب دا مسافر'' ''قیدی حور'' اور ''نور اسلام'' مطبوعہ دستیاب ہیں۔ ان کے علاوہ ڈرامہ ''سی پنوں'' اور ''خودسر شہزادہ عرف قاتل بھائی'' بھی یادگار ہیں۔

ان ڈرامہ نگاروں کے متذکرہ بالا ڈراموں کے بعد دور جدید تک سرائیکی ڈرامے کا سفر کیسے طے

ہوا۔اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔تاہم یہ طے ہے کہ موجودہ دور تک آتے آتے سرائیکی نثری ڈرامہ اپنی ساری ادبی صفات کے ساتھ سامنے آچکا تھا۔سرائیکی ڈرامے کا جدید دور ریڈیوملتان کے قیام (آغاز نشریات ۲۱ نومبر ۱۹۷۰ء) سے شروع ہوتا ہے جبکہ ریڈیو بہاولپور کے قیام (آغاز نشریات یکم اگست ۱۹۷۵ء) کے بعد اور پاکستان ٹیلی ویژن سنٹر لاہور کے سرائیکی پروگرام رت رنگیلڑی (آغاز نشریات ۱۹۹۰ء) موجودہ نام ''سویل'' سے مزید مستحکم ہوتا ہے۔ریڈیو سرائیکی ڈرامے براڈ کاسٹ اور ٹیلی ویژن پر ٹیلی کاسٹ ہونا شروع ہوئے تو کئی خوبصورت ادبی ڈرامے بھی لکھے گئے اور پھر ان ڈراموں کی اشاعت کا سلسلہ اخبارات ورسائل کے علاوہ کتابی شکل میں بھی شروع ہوا۔موجودہ دور میں کتابی شکل میں اشاعت پانے والے سرائیکی ڈرامے کی کتب کچھ اس طرح سے ہیں ۔ترجمہ شدہ کتابوں میں آغا حشر کاشمیری کی تین کتابیں ''کوڑا خواب'' (فدائے اطہر) ''رستم تے سہراب'' (اسلم قریشی) اور ''سیج ڈکھاندی سیج پھلاں دی'' (دلشاد کلانچوی) ۱۹۸۱ء میں اور ممتاز مفتی کی کتاب ''گل گلانواں ریت دا'' (حمید الف ملغانی) ۱۹۹۲ء میں سامنے آئیں جبکہ جن کتابوں میں ڈرامے کو جزوی جگہ دی گئی ان میں قاسم جلال کی ''ہنجوں تے ہیرے'' (۱۹۷۶ء) مہر کاچیلوی کی ''سدھر'' (۱۹۸۵ء) دلشاد کلانچوی کی ''رات دی کندھ'' (۱۹۸۸ء) راہی گبول کی ''مٹھڑے تیر'' (۱۹۹۷ء) منظور احمد اعوان کی ''گجھے دھک'' (۱۹۹۳ء) کے نام لیے جاسکتے ہیں۔جبکہ ریڈیو یا ٹیلی ویژن ڈراموں کے مجموعوں سے پہلے نذیر علی شاہ کی 'ڈھچال'' حصہ اول (۱۹۸۰ء) میں سامنے آچکی تھی۔۱۹۸۹ء میں حفیظ خان کی ''کچ دیاں ماڑیں'' اور مسرت کلانچوی کی ''سنجھ صباحیں'' سرائیکی ڈراموں کے باقاعدہ مجموعوں کے طور پر سامنے آئیں۔۱۹۹۰ء میں حفیظ خان کی بچوں کے ڈراموں پر مشتمل ''ماما جمال خان'' اور ۱۹۹۱ء میں مقبول عباس کاشر کی ''چندر تارے'' چھپیں۔قاسم جلال کے ٹی وی ڈراموں کا مجموعہ ''رت رنگیلڑی'' ۱۹۹۲ء میں چھپا جبکہ رحیم طلب کے ڈراموں کا مجموعہ ''زمین آسمان'' ۱۹۹۲ء اور مقبول عباس کاشر کی ''گونگیاں کندھاں داشور'' (۱۹۹۸ء) بھی قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح جن سرائیکی ڈرامہ نگاروں کے ڈرامے اخبار ورسائل میں شائع ہوئے ان میں اختر جعفری، اطہر قریشی، اکرم شاد، اے آر ندیم، بتول رحمانی، بشیر انصاری، تحسین سبائے والوی، حسن رضا گردیزی، حفیظ خان، دلشاد کلانچوی، رحیم طلب، سجاد حیدر پرویز، شبانہ کریم، صبیحہ قریشی، صدیق

طاہر، عرفان جمیل، غلام حسن حیدرانی، فیض احمد جون پوری، فقیر نور جعفری، محمد اسلم رسولپوری، محمد اسماعیل احمدانی، محمد اقبال جھلن، مسرت کلانچوی، مرید حسین راز جتوئی، مصدق اقبال، منیر ملک، مہر کاچیلوی، نذیر علی شاہ اور نور احمد فریدی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

۱۹۸۹ء کا سال سرائیکی ڈرامے کی تاریخ کا اہم سال مانا جاتا ہے کیونکہ اس سال ساتھ ساتھ ریڈیائی ڈراموں کے دو مجموعے کتابی شکل میں سامنے آئے۔ اگرچہ مسرت کلانچوی کے مجموعے پر ماہ اشاعت مئی اور حفیظ خان کے مجموعے ''کچ دیاں ماڑیاں'' پر جون ۸۹ء درج ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ''کچ دیاں ماڑیاں'' کو سرائیکی نثر میں شائع ہونے والے ڈراموں کے پہلے باقاعدہ مجموعے کا اعزاز حاصل ہوا۔ کیونکہ ''سنج صباحیں'' اکتوبر میں چھپ کر سامنے آئی۔ اس کا ایک واضح ثبوت خود مسرت کلانچوی کے والد صاحب پروفیسر دلشاد کلانچوی کا سرائیکی ادبی خبرنامہ ''سرائیکی زبان'' ہے۔ مئی، جون ۸۹ء کے شمارے میں صفحہ ۷ پر بتایا گیا ہے کہ ''سرائیکی کے نامور ادیب، شاعر اور ریڈیو کے سابقہ پروڈیوسر حفیظ خان کے ڈراموں کا مجموعہ'' کچ دیاں ماڑیاں'' سرائیکی اکیڈمی ملتان کے زیر اہتمام چھپ چکا ہے جس میں ان کے چھ منتخب ڈرامے ہیں۔ دیباچہ ڈاکٹر اے بی اشرف اور فلیپ رحیم طلب، امجد اسلام، اصغر ندیم سید اور ڈاکٹر انوار احمد نے لکھے ہیں اس طرح حفیظ خان سرائیکی ڈرامے میں پہلے صاحب کتاب ہیں''۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسی تحریر کے نیچے مسرت دے ڈرامے کے عنوان سے لکھا گیا ہے کہ ''سرائیکی کی نامور افسانہ نگار مسرت کلانچوی کے ڈراموں کا مجموعہ عنقریب سرائیکی ادبی مجلس کے زیر اہتمام شائع ہونے والا ہے۔ ڈرامے کے میدان میں یہ دوسری کتاب ہوگی۔ میرے پاس مرحوم کے ہاتھ سے لکھے ہوئے پتے اور ڈاک خانے کی مہر کے ساتھ یہ خبرنامہ محفوظ ہے اسی طرح اور بھی کئی شواہد ہیں خیر اب تو یہ بات متنازع رہی بھی نہیں۔

حفیظ خان (پیدائش 3 اکتوبر 1956) نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ریڈیو پاکستان بہاولپور سے کیا جہاں وہ جون ۷۵ء سے اکتوبر ۷۶ء اور جولائی ۸۹ء سے فروری ۸۰ء تک بطور اناؤنسر، صداکار اور ڈرامہ نگار وابستہ رہے۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں ایل ایل بی کرنے ملتان آنا ہوا تو اس عرصہ (اکتوبر ۷۶ء تا جون ۸۹ء) میں جہاں ریڈیو پاکستان ملتان سے ان کی آواز بطور کمپیئر صداکار پہچانی گئی وہاں ان کی تحریروں نے سرائیکی ڈرامے کو یکسر مختلف اور نمایاں لب و لہجہ عطا کیا بلکہ اس دور میں سرائیکی

ڈرامہ حفیظ خان کے نام سے پہچانا گیا۔ 1981-82ء میں وہ ریڈیو ملتان پر پروڈیوسر بلکہ بطور ڈرامہ پروڈیوسر بھی کام کرتے رہے۔ اس دوران انھوں نے ریڈیو کے لیے مختلف پروگراموں کے حوالے سے درجنوں سرائیکی ڈرامے اور فیچر تحریر کیے۔ طویل دورانیے کے ڈرامے لکھنے والوں میں بھی حفیظ خان نے بے پایاں شہرت اور بلند مقام حاصل کیا۔

''کچ دیاں ماڑیاں'' ان کے طویل ریڈیائی ڈراموں کا انتخاب ہے۔ اس کتاب کو کئی اعزاز حاصل ہوئے۔ اسے اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے ایم اے سرائیکی کے نصاب میں ۱۹۹۰ء سے اس کا ڈرامہ ''بھروی کندھ'' اور اب سال گزشتہ سے بی اے سرائیکی کے نصاب میں ٹائٹل ڈرامہ ''کچ دیاں ماڑیاں'' شامل ہے۔ اس کتاب کی تعارفی تقریب کی صدارت مرحوم جسٹس محمد منیر خان سابق جج سپریم کورٹ آف پاکستان وصوبائی محتسب پنجاب نے کی۔ ''کچ دیاں ماڑیاں'' پر پاکستان ٹیلی ویژن سنٹر لاہور نے اپنے پروگرام پنجاب رنگ میں اسی سال ۲۲ دسمبر ۸۹ء کو پچیس منٹ کا خصوصی پروگرام ٹیلی کاسٹ کیا۔

حفیظ خان کے ریڈیائی ڈراموں میں بچوں کے لیے لکھے جانے والے ڈراموں کا مجموعہ ''ماما جمال خان''(1) کے نام سے بھی پاکستان سرائیکی رائٹرز گلڈ ملتان کی طرف سے جون ۱۹۹۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح ان کے ڈراموں کے دو مجموعے ''رُٹھڑے پندھ'' (سرائیکی ریڈیائی و ٹیلی ڈراموں کا انتخاب) اور ''خواب گلاب'' (سرائیکی میں بچوں کے ریڈیائی و ٹیلی ڈراموں کا انتخاب) بھی عنقریب شائع ہونے والے ہیں(2)۔ ان کے ڈرامے سرائیکی اخبارات ورسائل میں بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں مثلاً ماہنامہ ''سرائیکی ادب'' ملتان میں ان کے ڈرامے ''ٹنگل پیسہ'' (نومبر ۱۹۷۷ء) ''رُٹھڑے پندھ'' (مارچ ۸۹ء) ''ماسی سیانی'' (اکتوبر ۱۹۸۷ء) ''سنگھار'' (دسمبر ۸۸ء) اور ''آزادی دا سجھ'' (دسمبر ۱۹۸۹ء) اس کی مثال ہیں۔

علاوہ ازیں حفیظ خان کے افسانے ''ویندی رت دی شام'' (جواُن کے افسانوی مجموعے ''ویندی رت دی شام'' مطبوعہ ۱۹۹۰ء کا ٹائٹل افسانہ ہے) کی خود ڈرامہ نگار کی ڈرامائی تشکیل ''اپا پیپ'' کے نام سے پی ٹی وی لاہور سے دکھائی جا چکی ہے۔ حفیظ خان کی بطور ڈرامہ نگار شہرت ان

(1) ماما جمال خان کو سرائیکی میں بچوں کے ڈرامے پر مشتمل پہلی کتاب کا اعزاز حاصل ہے (مرتب)

(2) ''رُٹھڑے پندھ'' (2005ء) میں اور ''خواب گلاب'' (2003ء) میں شائع ہو چکے ہیں۔ (مرتب)

کی الیکٹرانک میڈیا کے حوالہ سے ڈرامہ نگاری ہے۔ ویسے بھی سرائیکی ڈرامے کا موجودہ دور بھی قیام پاکستان کے بعد ریڈیو کے قیام سے ہی شروع ہوتا ہے۔ پھر ڈرامہ نثری ضرورتوں کے تحت ہی وجود میں آیا اور اسی ڈرامے کی وجہ سے ریڈیو کی پذیرائی ایک دور میں عوام میں بڑھی اور پھر ڈرامے کی مانگ میں اضافہ ہوا۔ نتیجتاً ریڈیو کے لیے ڈرامے فرمائش کر کر کے اور تواتر سے لکھوائے جانے لگے۔ سرائیکی ریڈیو ڈرامے نے بھی ریڈیو ملتان اور بہاولپور کے ذریعے فروغ پایا اور تقریباً تمام نمایاں نثر نگاروں نے سرائیکی ڈرامے تخلیق کیے۔

حفیظ خان کے ریڈیو ڈراموں نے کئی اداکاروں کو بھی متعارف یا مقبول کیا جہاں تسنیم بخاری (سابقہ فلمی اداکارہ بازغہ) نے ''ڈوڈونڑیں ہک'' میں محض ایک چھوٹا سا کردار ادا کیا وہاں ان کے معروف ڈرامے ''کچ دیاں ماڑیاں'' میں ثمرین کا کردار ادا کرنے والی کوثر پروین (جس کا یہ پہلا ڈرامہ تھا) کوثر پروین سے کوثر ثمرین بن گئیں۔ ''ثمرین'' ان کے نام کا ایسا حصہ بنا کہ آج وہ سرائیکی کی معروف نثر نگار، شاعرہ، ٹی وی آرٹسٹ اور ریڈیو کی سینئر پروڈیوسر ہونے پر بھی ''کوثر ثمرین'' کے نام سے ہی جانی جاتی ہیں۔ منور سلطانہ جنھوں نے ریڈیو پاکستان بہاولپور سے نشر ہونیوالے منتخب ڈرامے اور ان کا جائزہ کے عنوان تلے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے لیے ایم اے اردو کا مقالہ لکھا تھا، لکھتی ہیں:

> ''قومی سطح کے ڈرامہ نگاروں سے رابطہ قائم کیا گیا اور ان کے اہم ڈرامے مقامی زبان سرائیکی میں ترجمہ کر کے نشر کیے گئے ۔ مترجمین میں حفیظ خان بھی شامل ہیں۔'' (صفحہ نمبر 59)

حفیظ خان کی ریڈیو بہاولپور اور ملتان سے ڈرامہ نگاری کے سفر کو ایک نظر دیکھیں تو ابتدائی سرائیکی ڈراموں میں ان کا 1977ء کا ڈرامہ ''ڈوڈونڑیں ہک'' ڈرامہ کے ارتقائی سفر میں سنگ میل دکھائی دیتا ہے۔

1977ء میں حفیظ خان نے خواتین کے پروگرام کے لیے مختصر دورانیے کے کئی ڈرامے لکھے جنھیں نذیر بلوچ مرحوم نے پیش کیا تھا۔ ان میں 15 جنوری کو ''منیوا'' 26 مارچ کو ''ٹنگل پیسہ'' 19 اپریل کو ''ایویں وی تھیندا ہوندے'' اور 2 مئی کو ''رٹھڑے پندھ'' شامل ہیں۔ 77-1976ء میں ریڈیو پاکستان بہاولپور سے زراعتی پروگرام میں سلسلے وار فیچر ''کھیت بنے بھاگ'' پروڈیوسر خالد چوہان نے پیش کیا تو اس سلسلے کے کئی فیچر حفیظ خان نے تحریر کیے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ کے پس منظر میں حفیظ خان کا لکھا ہوا

1977ء 19 جنوری اس کے بعد کیا۔ 77ء کو پیش 6فروری نے مرحوم نذیر بلوچ "نواں سجھ" خصوصی فیچر
(18 ستمبر 1977ء) پیلے پتراں دی بہار ڈوڈونڑیں ہک کے علاوہ "برہوں دے پندھ" کی تحریر
"بھردی اور "تند "ریشم دی کلھی" (3اپریل 1978ء) کچ دیاں ماڑیاں (15 جنوری 1978ء)
شامل میں مجموعے اپنے نے خان حفیظ ڈرامے پانچ سے میں ان ہوئے۔ نشر 1978ء میں بھی کندھ"
سنگ میل اہم بھی کا نگاری ڈرامہ فن کے ان ڈرامے کردہ تحریر کے 1979ء۔ 1977ء گویا کیے ہیں

ہیں۔

14اگست 1989ء کو ملک عزیز الرحمٰن (موجودہ سٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان ڈیرہ اسماعیل خان) نے حفیظ خان کا لکھا ہوا ڈرامہ "آزادی دا سجھ" پیش کیا۔ "ماما جمال خان" کے نام سے بچوں کی ڈرامہ سیریز 13 جولائی 1989ء کو احمد کبیر شاہ نے پیش کرنا شروع کی۔ اس سیریز کے کئی ڈراموں میں سے تین کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ 1989ء میں ہی بہاولپور سے "پچھانویں" (مشمولہ مجموعہ "کچ دیاں ماڑیاں") اور "کون دلاں دیاں جانے" بھی نشر ہوئے۔ 1980ء میں ریڈیو بہاولپور سے پروڈیوسر محمد خان نے حفیظ خان کے لکھے ہوئے تاریخی ڈرامے "شہاب الدین غوری، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر نشر کیے۔ بچوں کا ڈرامہ "ضد بری بلا ہے۔" 22جون 1980ء کو نشر ہوا تھا۔ اس طرح "یثرب داوالی" 1981ء میں نشر ہوا۔ حفیظ خان کی ریڈیائی ڈرامہ نگاری کا یادگار موڑ ان کی تحریر اور بطور پروڈیوسر پیشکش "ماسی سیانی" تھا جو 19 جنوری 82ء سے شروع ہوا یہ تیرہ قسطوں پر مشتمل تھا۔

مجموعوں میں شامل ڈراموں کے علاوہ دو اہم ڈرامے "رُتھڑے پندھ" میں چھ کردار اور آٹھ منظر ہیں۔ اس کا موضوع یہ ہے کہ ساس اور بہو کے جھگڑے گھروں کی بربادی کا باعث بنتے ہیں لہٰذا خاوند کو ایسے حالات میں شکوک وشبہات سے بچنا چاہیے۔ کس طرح ایک پڑھی لکھی بیوی گھر کو جنت بنا سکتی ہے ان کے ڈرامے "ٹُنگل پیسہ" کا مرکزی خیال ہے جس میں منگنی کے مسائل بھی چھیڑے گئے ہیں۔ مناسب رشتہ کی وکالت کی گئی ہے اور زیور تعلیم سے آراستہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔

ڈرامائی مجموعہ "کچ دیاں ماڑیاں" کا پہلا ڈرامہ "ڈوڈونڑیں ہک" ہے۔ اس ڈرامے میں جھوٹی شان وشوکت کا مظاہرہ کرنے والوں کا پول کھولا گیا ہے جو لوگ اپنی اوقات سے بڑھ کر اونچی اڑان کی کوشش کرتے ہیں منہ کے بل گرتے ہیں۔ یہ ایک ظاہر دار نوجوان کی کہانی ہے اور بتایا گیا ہے کہ لڑکی کے لیے

لڑکے کی امارت میں کشش ہے اوراسی طرح لڑکا بھی لڑکی کی دولت کا دیوانہ ہے لیکن اختتام پر پتا چلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے تھے۔ مجموعی طور پر یہ ڈرامہ سماجی جبر کی مختلف صورتوں کے رومانی اور دلچسپ اظہار سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ جسے حفیظ خان جیسے ڈرامہ نگار نے فنکارانہ چابکدستی سے تحریر کیا ہے۔

دوسرا ڈرامہ ''پچھانویں'' ہے۔ یہ ایک خودغرض حرص پرست نوجوان کی کہانی ہے جو معذور ہوجاتا ہے تو اس کی امیر محبوبہ اسے چھوڑ جاتی ہے لیکن غریب منگیتر سہارا دیتی ہے۔ یہ بیک وقت جھوٹے رومانوں اور سچی محبتوں کی کہانی ہے۔ ٹائٹل ڈرامہ ''کچ دیاں ماڑیاں'' کا نمبر تیسرا ہے۔ اس کا موضوع بھی جبر اور عدم مساوات بنتے ہیں یہ ڈرامائی سچویشنز سے پر کہانی ہے اس میں لڑکے کی محبت بھی بناوٹی ہے اور لڑکی کی بھی۔ دونوں کے اپنے اپنے خفیہ مقاصد ہیں۔ آج کل کے نوجوانوں کی نفسیات کا اظہار ہے، معروضی حقائق کے نتیجے میں ابھرنے والی نفسیات کا ذکر ہے۔ چوتھا ڈرامہ ''ریشم دی کلھی تند'' ایسے لڑکے اور لڑکی کی کہانی ہے جن کی محبت صرف جرأت اظہار نہ ہونے کی وجہ سے ناکام ہوجاتی ہے۔ اس کے سات منظر ہیں۔ تھیم یہ ہے کہ دل میں محبت کا روگ لے کر گھٹ کر مرنے والے لوگ ناکام رہتے ہیں۔ محبت جرأت اظہار کا تقاضا کرتی ہے۔ سلمان اور عزیز متضاد کردار ہیں۔ مثالیت پسندی اور فعالیت پسندی کا موازنہ ہے۔ کہ ہمارے معاشرے میں شریف اور بے زبان انسان گھاٹے میں رہتا ہے۔ چھٹا ڈرامہ ''پیلے پتر اں دی بہار'' ایک بزدل لڑکی شہلا اور ایک ہرجائی لڑکے عمران کی ناکام محبت کی داستان ہے۔ شہلا کا کردار رومانی اور کمزور ہے جس میں توانائی نہیں۔ وہ حالات کا سامنا کرنے کی صلاحیت سے عاری ہے۔ عمران شوخ، ذہین مگر چالاک اور دغا باز ہے۔ اس میں ہیرو کی خوبیاں نہیں، عام سا نوجوان ہے۔ ڈرامے کو فلیش بیک کی تکنیک سے دلچسپ بنایا گیا ہے۔ ریڈیائی تکنیک کے اعتبار سے یہ معیاری ڈرامہ ہے۔ کہانی میں بتایا گیا ہے کہ شہلا کی شادی قیصر سے ہوجاتی ہے اور وہ اپنی پہلی محبت کو ترک نہ کرسکنے کے باعث طلاق حاصل کرکے واپس آجاتی ہے جبکہ اس روز گھر میں عمران کا شادی کارڈ آیا ہوتا ہے۔ یعنی وہی عمران جس نے زندگی بھر انتظار کرنے کا وعدہ کیا تھا، چھ ماہ بھی توقف نہ کرسکا۔ فرحت نواز نے لکھا ہے ''حفیظ خان نے جو کچھ لکھا ہے وہ خود سے تراش کر نہیں لکھا۔ انھوں نے اپنے کردار زندگی کے معمولات سے کشید کیے ہیں اس لیے وہ ہمیں اجنبی نہیں لگتے۔'' (صفحہ نمبر 19)

فرحت نواز کی اس بات کا ثبوت یا اس کی مثال ڈرامہ ''پیلے پتراں دی بہار'' ہی ہے۔ڈرامے کی ہیروئن شہلا سرائیکی معاشرت کی نمائندہ ہے۔وہ مرضی کے بغیر شادی ہوتے وقت عام اور بے بس لڑکی ثابت ہوتی ہے۔خواب پرستی کے ساتھ رونا دھونا بھی اس کی عادت ہے۔

مجموعے کا پانچواں ڈرامہ ''بھر دی کندھ'' جو ایم اے سرائیکی کے نصاب میں شامل ہے اور اتفاق سے جس پر دیباچہ نگار ڈاکٹر اے بی اشرف (سابق صدر شعبہ اردو زکریا یونیورسٹی ملتان) نے کوئی رائے نہیں دی(1)۔کتاب کے 35 صفحات (185 تا 220) پر پھیلا ہوا ہے۔یہ ریڈیائی ڈرامہ ہے۔اس لیے سٹیج ہونا ممکن نہیں کیونکہ جگہ جگہ پر فلیش بیک میں ماضی کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔یہ چار مناظر پر مشتمل یک بابی ڈرامہ ہے۔اسے نفسیاتی ڈرامہ کہا جا سکتا ہے اس میں ذہن جسے دماغ کہہ لیں اور دل کی کشمکش دکھائی گئی ہے۔جس کے ساتھ ساتھ انسانی رویوں کی ٹوٹ پھوٹ نظر آتی ہے۔اس ڈرامے کا مرکزی خیال ایک مکالمہ ہے جو پروفیسر رحمٰن کا ذہن اس سے کرتا ہے کہ ''محبت اپنے ہم عمر سے اچھی لگتی ہے بھلا کھلتی کلی اور مرجھائے پھول کا کیا جوڑ (صفحہ نمبر 214) اس بات کو ہم مس شازیہ اور ثمرین کے رحمٰن سے مکالموں میں مزید واضح انداز میں دیکھ سکتے ہیں۔

اس ڈرامے میں سرائیکی معاشرت کی قدروں کے پیش نظر جذبوں کی ٹوٹ پھوٹ اور ٹریجڈی نظر آتی ہے۔مس شازیہ اپنے چودہ سالہ سٹوڈنٹ رحمٰن کو اپنی تصویر تو نہیں دے سکتی مگر پکنک والے دن مس نجمہ کو دریا کے کنارے پر یہ کہہ بیٹھتی ہے ''رحمٰن مجھے اتنا اچھا لگتا ہے کہ اگر یہ بڑا ہوتا تو میں اس سے شادی کر لیتی۔(صفحہ نمبر 202)

پورے ڈرامے کی کہانی کی بنیاد یہی ایک جملہ ہے اگر رحمٰن یہ جملہ نہ سنتا تو مس شازیہ سے اظہار محبت کر کے شادی کی پیش کش نہ کرتا اور مس کے ڈانٹنے پر بڑا آدمی بننے کے جنون میں جوانی نہ بتا بیٹھتا اور یوں یہ کہانی جنم ہی نہ لیتی۔ڈرامے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ لڑکپن میں سکول کی ٹیچر مس شازیہ کے رویہ سے غلط فہمی کا شکار ہونے والا رحمٰن اظہار محبت کے سبب دھتکارے جانے کے بعد اپنی جوانی کہیں گم کر بیٹھتا ہے اور ردعمل میں عورت سے نفرت کا برملا اظہار کرتا ہے۔اب جبکہ وہ ایک ادھیڑ عمر مگر

(1) ڈاکٹر اے بی اشرف کے دیباچہ تحریر کرتے وقت اس ڈرامے کا سکرپٹ دستیاب نہیں تھا جو بعد ازاں بوقت اشاعت ڈرامے کی ہیروئن ''ثمرین'' (کوثر پروین) نے مہیا کیا جو اس نے ریکارڈنگ کے وقت محفوظ کر لیا تھا۔(مرتب)

مجرد پروفیسر اور شعبہ زولوجی کا ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ہو چکا تھا، اپنی سٹوڈنٹ ثمرین کے رویے سے نئے جذباتی تلاطم کا شکار ہو جاتا ہے اور ایک بار پھر عمروں میں تفاوت کا مضحکہ خیز شکار ہو کر بھی ثمرین سے اظہار محبت اور شادی کی پیش کش کر بیٹھتا ہے مگر پھر ٹھکرا دیا جاتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ سب ڈرامے رومانوی ہیں۔ رومان ان سب پر غالب ہے۔ ہیروئن کی حادثاتی ملاقات، شوخ مکالمے، مکالموں کا والہانہ پن، دولت یا رقابت کی دیوار، طربیہ پھر المیہ انجام ہم اتفاقات بھی ڈراموں میں دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی اخلاقی نتیجہ ضرور نکالا جاتا ہے۔ خیر و شر کی کشمکش میں مثبت کردار کی جیت بھی دکھائی گئی ہے۔ حفیظ خان کے ڈراموں میں دوستوں کے کرداروں میں بڑا اخلوص دکھایا گیا ہے وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں بحیثیت مجموعی دلچسپی ان ڈراموں کی خوبی ہے۔ ڈرامائی صورتحال پیدا کرنا، واقعات کو دلچسپ موڑ دینا، کرداروں کو زندگی کے حقیقی تناظر میں پیش کرنا اور انسانی جذبات کا صحیح ادراک نمایاں خوبیاں ہیں۔ یہ ڈرامے ہمیں ہماری زندگی کا عکس دکھائی دیتے ہیں ہر ڈرامے میں جس طرح کی زندگی پیش کی گئی ہے اس میں ہر رنگ نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زندگی کے قریب ہونے کی وجہ سے سب کرداروں میں عام انسانی رویے موجود ہیں، وہ بشری تقاضوں سے بے نیاز نہیں۔

غرضیکہ حفیظ خان، جن کا سرائیکی ڈرامہ نگاری کا سفر ربع صدی سے زائد عرصہ پر محیط ہے، جدید سرائیکی ڈرامہ کے بانیوں میں نہ صرف سب سے نمایاں ہیں بلکہ مضبوط فنی مہارت، چابکدستی، تیز ترین قوت مشاہدہ، رواں اور جاندار مکالموں کا اسلوب، معاشرتی مسائل کا عمیق ادراک، پلاٹ کی غیر لچکدار بنت، مناظر کی ترتیب پر گرفت اور ہر قدم پر تمام تر ڈرامائی عناصر کی موجودگی کے سبب اپنے لیے ایک ایسے ڈرامہ نگار کا مقام متعین کرا چکے ہیں، جو کسی بھی زبان و ادب کی ارتقائی منازل میں شعور اور فن کی پختگی کی ٹھوس بنیاد اور آنے والے زمانوں کے لیے روشن رہگزر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

O

(تحریر 21 فروری 2000ء)

مطبوعہ ماہنامہ تخلیق لاہور

شمارہ ۱، ۲ 2005ء

سرائیکی مضامین

سرائیکی ڈرامے دی سنجان

ڈاکٹر انوار احمد

زباناں سوہنیاں لگدن شاعری نال اتے تر کڑیاں لگدن نثری ادب نال، ساڈے کول آپڑیں تاریخ، ثقافت اتے شاعری دی صدیاں تے پھیلی اوئی تاریخ ہے، پر ساڈے نثر نگاراں تے اوندی گواہی دا بہوں سارا قرضہ واجب ہے۔ حفیظ خان ڈرامے دے انہاں ابتدائی لکھاریاں وچوں ہے، جیہڑا اوں ویلے ایں "لاہنے ڈیونے" توں فارغ پیا تھیندے، جیہڑے والے ساڈے علاقے دے لوک آپڑیں سنجان اتے آپڑیں آپ کو منواون کیتے پوری طرح تیار ہن۔

حفیظ خان دے ڈرامے ایہہ منظر پیش کریندن جو سرائیکی بولن آلیاں دے اسمان دی طرحاں زمین وی بہوں وسیع ہے اتے اوندے تے وسن آلے لوکاں نے آپڑیں مٹھی خوئے اتے چپکی مٹی دا کتنا بھار برداشت کیتے، اوندا مشاہدہ، دائرہ احساس اتے اظہار دی طاقت حالی بہوں ساریاں بیاں دی گواہیاں ڈیسی۔

O

(ستمبر 1988ء)

حفیظ خان دے ڈرامے

فرحت نواز

لکھاری دا مشاہدہ بددیانت نہ ہووے تاں ہر واقعہ اوندا ذاتی تجربہ جاپدے۔ حفیظ خان دے ڈرامے ڈسیندن جو انہاں دے مشاہدے دا ایمان کتھاہیں وی کمزور نی تھیا۔ انہاں دی اکھ شفاف اتے محسوسات روشن ہن۔ تہوں انہاں دے ڈرمے اچ ساکوں حقیقت دا عکس واضح نظر دے۔ انہاں دے ڈرامے دے کردار مکدی ہوئی ویہویں صدی دے کردار ہن جہاں اچ وقت کوں تکھے تکھے ورتن، لحظے اچ ہر خواب دی تعبیر ڈیکھن، سوچ دی اکھ نوٹ تے غرض دی بیڑھی چڑھن اتے چہرے تے ماسک لاتے حیاتی دی میراتھن ریس جتن دی ہوس موجود اے۔ چہرے تے ماسک لاتے دلاں دی سوداگری تے نکلن آلے کوں ماسک زدہ وپاری ٹکرن دا المیہ وی حفیظ خان دے ڈرے اچ لبھدے۔ حادثاتی اتے اتفاقی رومانس توں علاوہ حفیظ خان نے جو کچھ لکھے آپوں گھڑ تے نیں لکھیا۔ انہاں اپنے کردار زندگی دے معمولات تو کشید کیتن ایں سانگے او ساکوں اوپرے نیں لگدے۔ اُنہاں دا قلم سچے ڈکھا تے کوڑی خوشی دا زاویہ شناس اے۔ انہاں نے نویں نسل دی محبت کاری دے رموز و مسائل اتے وقت، ماحول اتے لوکیں نال اوندے غیر یقینی رویے دے نال نال روزمرہ دا ہر امیر غریب، چنگا مندا، اتے نیک بد احساس اتنی خوبصورتی نال پیش کیتے۔ جتنی خوبصورتی دی گنجائش

سچائی اوہ ہوندی اے۔

حفیظ خان دا ہتھ ہولا اے پر ضرب کاری۔ام مورلیلیٹی (Immorality) دا ساہ نکل

دیندے اتے اے آفاقی عقیدہ لاٹاں مریندا رہندے جو برائی چھوٹی ہووے یا وڈی، انفرادی ہووے

یا اجتماعی، ہمیشہ خزاں نصیب رہندی اے۔

O

(دسمبر 1988ء)

حفیظ خان دیاں ''کچ دیاں ماڑیاں''

رحیم طلب

کوئی وی زبان ہووے اوندے ادب وچ پہلے شاعری داخل تھیندی ہے، تے ول بعد وچ نثر، تے ول ڈوہیں رَل کراہیں ادب دے ون کوں مضبوط توں مضبوط بنڑیندن ۔ پر ادب نثر نال زیادہ تھیندے جیویں جو ڈاکٹر انوار احمد لکھدن جو

''زباناں سوہنیاں لگدن شاعری نال تے ترکڑیاں لگدن نثری ادب نال ساڈے کول آپنی تاریخ ثقافت اتے شاعری دی صدیاں تے پھیلی ہوئی تاریخ ہے، پر ساڈے نثر نگاراُتے اوندی گواہی دا بہوں سارا قرضہ واجب ہے۔''

واقعی سرائیکی پڑھے لکھے پُتراں تے قرضہ اے جو او نثری معیاری ادب تخلیق کرن، تے اَن پڑھ سرائیکی دے پُتراں تے قرضہ اے ہے جو او تعلیم حاصل کرتے سرائیکی دی لج رکھن۔

میں اتھاں سرائیکی دے ہک پُتر داذکر کرن چاہنداں جیں نے سرائیکی دا قرضہ لہاون دا سب توں خوبصورت تے معیاری اہر کیتے ۔ او ہن حفیظ خان سئیں ۔ جیا حفیظ خان سئیں! جنہاں آپڑیں ما بولی سرائیکی داہن ''کچ دیاں ماڑیاں'' دی صورت وچ قرضہ لہائے تے مزید لہیسی ، انشاءاللہ۔

اساں جیکر سرائیکی ڈرامے دی تاریخ تے ہک نظر پاؤں تاں ساکوں ڈرامے نگاراں دی لمبی تندیر نظر آندی ہے۔ سرائیکی دے پہلے ڈرامہ نگاراں وچ منشی غلام حسن گامن شہید ملتانی ، غلام سکندر خان غلام ، مولوی خلیفہ پیر بخش ملتانی ، مولوی کریم بخش ، اللہ یار ، عبدالرشید ، مولوی قادر بخش تے منشی [illegible]

مُہ گردائی دے ناں آندن ۔ ابتداء وچ کیوں جو سرائیکی ڈرامے وی بیاں زباناں دی کار منظوم ہوندے
ہن تے انہاں حضرات نے منظوم ڈرامے تخلیق کیتے ۔ ول اوندے بعد نثری ڈرامیاں دا دور شروع
تھیا، تے ول ہک چنگی بھلی تعداد ڈرامے نگاراں دی سامنے آ گئی ۔ انہاں وچوں اسلم رسولپوری،
اسمٰعیل احمدانی، اکرم شاد، مسرت کلانچوی، حفیظ خان، سجاد حیدر پرویز، دلشاد کلانچوی، فقیر نور محمد جعفری
اتے رحیم طلب دے ناں قابل ذکر ہن۔

انہاں ناواں وچوں سب توں نویکلا تے سنجاپواں ناں حفیظ خان دا ہے ۔ حفیظ خان نے
1975ء توں لاکے 1980ء تک ریڈیو پاکستان نال وابستگی دے دوران خوبصورت ڈرامے تخلیق
کیتے ۔ جنہاں وچوں انہاں دے چھی چونڑویں ڈرامیاں دا انتخاب ''کچ دیا ماڑیاں'' دے ناں نال
سامنے آ گئے ۔ ''کچ دیاں ماڑیاں'' ایں وقت اج تک دے چھپن والیاں سرائیکی کتب وچوں سب
توں معیاری کتاب ہے ۔ اپنے گٹ اپ دے لحاظ نال ملک دیاں خوبصورت تے قیمتی کتاباں دے
مونڈھے نال مونڈھا رلا کے سرائیکی ادب دی شان اُچی کر سگدی ہے (بیشک)

حفیظ خان دے ڈرامیاں تے غور کیتا ونجے تاں اینویں محسوس تھیندے جو ایندا لکھاری عام
لکھاری نہیں ۔ او خوردبین اکھیں رکھن آلا وڈا احساس قلمکار ہے ۔ حفیظ خان نے اپنے ڈرامیاں دے
موضوعات، خیالات دے چک تے نہیں گھڑے بلکہ گہرے مشاہدات دیاں انگلیں نال تجربات دی
مٹی کوں چک تے رکھ حساس تے جمالیاتی اکھ دے قلم نال تخلیق کیتن ۔

بقول فرحت نواز دے جو حفیظ خان دے ڈرامے ڈیسیندن جو انہاں دے مشاہدات دا ایمان
رکھتائیں وی کمزور نی تھیا ۔ انہاں دی اکھ شفاف تے محسوسات روشن ہن تے انہاندے ڈرامے وچ
حقیقت دا عکس واضح نظر دے ۔ انہاں دا قلم سچے ڈکھا تے کوڑی خوشی دا زاویہ شناس اے ۔

خان رضوانی سئیں حفیظ خان سئیں بارے آہدن جو:

''سئیں حفیظ خان پہلے سرائیکی لکھاری ہن جنہاں سرائیکی ڈرامے کوں نشریاتی لب
ولہجہ عطا کیتے ۔''

O

(ماہنامہ سرائیکی ادب، ملتان، شمارہ ستمبر 1990ء)

’’کچ دیاں ماڑیاں‘‘

رحیم طلب

لفظ ’’ڈرامہ‘‘ اصل اعتبار نال یونانی ہے جیندا مطلب ہے ’’جو کر کے ڈکھاون‘‘۔ ڈرامے وچ فن دی کشمکش، تعجب خیزی غیر متوقع پن شامل ہوندے تے ایہو کجھ ڈرامہ نگار کوں تخلیق کرنا ہوندے۔ حفیظ خان نے اپنے ڈرامیاں اِچ کرداراں دیاں شخصیتاں کوں مکمل طور تے اجاگر کیتے۔ انہاں کرداراں وچ اُنھاں دی نفسیات، جذبات، دل دی حالت، ذہنی کیفیت، عقائد تے خارجی شخصیت دی عکاسی تھیندی ہے۔ حفیظ خان دے ڈرامیاں وچ مکالمے روایتی ہوون دی بجائے کردار دی فطرت تے اوندے عمل نال بالکل فٹ لگدن۔ انہاں دے یہ اظہار دے مکالمے موقع و محل نال مناسبت رکھیندن۔ غرض ڈرامیاں دے مکالمے ڈاہڈے ستھرے، چست، رواں، سادہ، مختصر، موزوں تے کرداراں دی نفسیات تے جذبات دے مطابق مندری اِچ تھیوے دی کارہن۔

O

کچ دیاں ماڑیاں

ڈاکٹر طاہر تونسوی

''کچ دیاں ماڑیاں'' ڈرامہ نگار حفیظ خان دے چھی ڈرامیں دا اکٹھا مجموعہ اے، جیہڑھا سرائیکی نثری ادب وچ ہوادی ہک خوشگوار ہیل دے نال آئے تے سارے پاسے آپڑیاں خوشبوآں کھنڈا گئے۔

سرائیکی زبان تے ادب وچ ڈرامے دی روایت بہوں پرانی کائنی۔ لکھت پڑھت وچ تاں اے ہن آئے پر میلیں ٹھیلیں دے موقعیں تے ڈرمہ کرن آلیاں کمپنیاں دی روایت کافی پہلے کنیں موجود ہئی تے رات کوں تھیٹر وچ اے کمپنیاں ڈرامے کریندیاں ہن۔ بعض تہواراں تے وی ڈرامے پیش کیتے ویندے ہن۔ جیندے وچ رام لیلا، رام کہانی، رام لچھمن دا بن باس تے لنکا دی فتح جیہیں ڈرامے ہوندے ہن۔ ایں توں علاوہ ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی ماہیوال، مرزا صاحباں تے ڈوجھیاں عشقیہ داستاناں کوں وی ڈرامے دی شکل وچ لوکیں کوں ڈکھایا ویندا ہا۔

ریڈیو دی آمد نال ای ڈرامے دے فن کوں فروغ حاصل تھیا۔ جے تائیں سرائیکی ڈرامے دا تعلق ہے سٹیج توں بعد ریڈیو ملتان تے بہاولپور قائم تھیون تے سرائیکی ڈرمے دی رفتار وچ وادھا تھئے تے سرائیکی ڈرمے نشر تھیون والا ایہہ سلسلہ ہن وی جاری اے۔ رفیق خاور جسکانی، اختر جعفری، ڈاکٹر

انواراحمد،صدیق طاہر،عامر فہیم،اسلم عزیز درانی،مظہر کلیم،مسرت کلانچوی،حسن رضا گردیزی،نقیر نور جعفری،اللہ بخش یاد،فخر بلوچ،شمشیر حیدر ہاشمی اچھے ڈرامہ نگار ہن۔جنہاں سرائیکی ڈرامے دا رشتہ نویں تقاضیں تے نویں فنی خاصیتیں نال جوڑے تے موضوع تے اسلوب دے حوالے نال ایندے وچ وادھے کیتے۔انہیں ساریں ڈرامہ نگاریں دا ہک سنگتی تے بانہہ بیلی حفیظ خان وی ہے جیں اپنے آپ کو ڈرامے کیتے وقف کرڈتے۔حفیظ خان کوں ڈرامہ لکھن دا فن وی آندے تے ڈرامہ کرن دا وی۔(اے گالہہ یاد رکھن دی ہے جو حفیظ خان پروڈیوسر وی رہن) جیویں میں شروع وچ عرض کیتے،کہ کچ دیاں ماڑیاں وچ چھپی ڈرامے،ڈون ڈونڑیں ہک،پچھاویں،کچ دیاماڑیاں،ریشم دی کلھی تند،بھر دی کندھ تے پہلے پتراں دی بہار شامل ہن۔

انہیں ڈرامیں دا مطالعہ کیتا ونجے تاں اے پتہ لگدے،جو حفیظ خان کوں فن ڈرامہ نگاری تے پورا عبور حاصل ہے۔اتے انہیں ڈرامیں وچ کئی اجھی فنی خامی نظر نہیں آندی جیہڑھی ڈرامے وچ جھول پیدا کرڈیندی ہووے۔بلکہ ڈرامہ دے فن دیاں ساریاں خاصیتاں کہیں نہ کہیں حوالے نال موجود ہن۔کردار نگاری ہووے تے بھانویں مکالمہ نگاری،منظر نگاری ہووے تے بھانویں واقعات نگاری۔حفیظ خان ہر جاہ تے اپنی تخلیقی صلاحیت تے فن دا کمال ڈکھائے خاص طور تے انہیں لفظیں دا جیہڑھا ورتارا کیتے او ڈرامے دے موضوع دا ساتھ ڈیندے تے ایں طرح حفیظ خان دا نواں نکور طرز بیاں سنگر پنگر تے سامنے آندے۔

حفیظ خان دے اناں ڈرامے دے موضوعات ساڈی روزمرہ زندگی دیاں کہانیاں ہن تے جیہڑھے ویلے اساں انہاں کوں پڑھدے ہیں تاں ایویں معلوم تھیندے جو اساں خود ای کردار ہیں۔اے واقعات اساڈے ہن،ایندا نتیجہ اے نکلدے،جو پڑھن آلیں دی دلچسپی ودھ وندی اے۔تے گالہہ جو ڈرامہ ڈیکھن دی شے ہے،پڑھن دی نئیں،صحیح نئیں لگدی۔

حفیظ خان دے ڈرامے حیاتی دیاں ساریاں کیفیتیاں دا عکس پیش کریندن تے عام انسانی روئیں تے جذبات واحساسات دی ترجمانی کریندن تے جیویں حیاتی دی ٹور وچ تھیندے اونکوں اصلی شکل وچ حفیظ خان اپنے ڈرامیں وچ ابھارے۔کوڑ سچ،محبتاں،نفرتاں عشق وعاشقی دے قصے

رس، ریجھے، شادیاں، طلاقاں، کوڑے لارے، ڈکھ سکھ، خیر تے شر، دھوکے، فریب، جعلسازیاں خوشیاں تے غمیاں سب کجھ انہیں ڈرامیں وچ موجود ہے۔ہک خاص گالھ ایہہ ہے، جو انہیں ڈرامیاں دی فضا دیہاتی نیں بلکہ شہری اے۔تے ای طراں کرداریں دے ناں وی شہری ہن جیڑھے درمیانی طبقے دی بجائے اچے طبقے دی نمائندگی کریندن، البتہ خصوصیت اے ہے جو انہیں ڈرامیاں وچ حفیظ خان نوجوانیں دے عصری مسئلیاں تے قلم چاتے، تے نوجوان لکھاری ہوون دے ناطے نوجوانیں دی سوچ تے کھل تے لکھئے۔تے اے ایں گزرے وقت دا تقاضا وی ہے۔ایں کیتے اُناں دے ڈرامے کوں جدید دور دی جدید سوچ دی آواز اکھیا ونج سگدے۔

ڈاکٹر اے بی اشرف ہوریں جیڑھا دیباچہ تفصیل نال لکھئے اوندے وچ انہیں ڈرامیاں تے حفیظ خان دے فن دا جائزہ گھدے تے لکھئے۔

''حفیظ خان نے اپنا سارا مواد سامنے دی زندگی توں گھدے تے اونکوں فن دے روپ وچ دلچسپ تے خوب صورت بنا تے ساکوں واپس کرڈتے۔''

ایں حوالے نال ڈٹھا ونجے تاں کجھ دیاں ماڑیاں سرائیکی ڈرامیاں دا ہک مکمل بھرواں، دلچسپ خوبصورت تے باکمال مجموعہ ہے جیندے وچ فن ڈرامہ نگاری دیاں ساریاں خاصیتاں پایاں ویندن۔

مکدی گالھ اے ہے جو اے سرائیکی ڈرامیاں دا پہلا قاعدہ مجموعہ اے جیڑھا جدید سرائیکی نثر دا مان بنڑے تے سرائیکی ادبی ورثے وچ وادھا کریندے تے اوں کمی کوں وی پورا کریندے جیڑھی سرائیکی نثر وچ موجود ہے۔کتاب دے ۲۵۶ صفحے ہن۔تے اے خوبصورت کاغذ تے جاذب نظر ٹائٹل نال چھپی اے، تے اے سرائیکی ادب وچ ہک نویں روایت ہے۔

ایں لحاظ نال کجھ دیاں ماڑیاں دا ظاہری خوبصورت اے، تے باطن دی۔تے ایندا سارا کریڈٹ سئیں حفیظ خان کوں ویندے۔جیں ڈرامہ نگاری دے فن کوں اگوں تے ودھائے۔

O

(مطبوعہ سرائیکی ادب ملتان)

سرائیکی ڈراما اتے حفیظ خان

ڈاکٹر طاہر تونسوی

اپا پیپ: اماں نہر دے پار چل تاں...... ماسی دے گھر۔

اماں: وے کیا ہئے ماسی دے گھر۔ پچھلے ڑمیں (جمعے) تاں گئے ہاسے۔

اپا پیپ: مونجھ آئی ہے۔

اماں: جانڑدیں ہاں تیڈی مونجھ کوں۔ ماسی واسطے مونجھ نئیں آندی، ایں آکھ جو آپنی منگیندی شبو واسطے مونجھ آئی اے۔ کریساں تیڈی شادی۔ پہلے جوان تھی۔ کھٹ کما......

اپا پیپ: ہا اماں میں وڈا تھیساں۔ کھٹیساں کمیساں۔ ول۔ ول۔ توں۔ ماسی دے گھر ویسیں تاں۔ (اپا پیپ، ٹیلی پلے)

O

جمال: کیا تھی گیا روبینہ جو تہاڈی منگنی تھی گئی۔ ہالی ہئے کئی در کھلے ہن۔ آپاں ڈوہائیں سول میرج کر سگدے ہئیں۔ ایہہ ساریاں منگنیاں اتھائیں رہ ویسن۔

روبینہ: جمال! ایہہ توں کیا آہدا پئیں بزدل آ۔ محبت دی عزت نی رکھ سکیا۔ تاں ہن ماپیو دی عزت دی خاک وچ ملاون چاہندیں۔ میں تیڈی محبت جیہاں کئی کوڑیاں محبتاں

ماپیو دی عزت توں قربان کر ڈیواں۔ انہاں میڈے بارے جو کجھ سوچے، بہتر سوچے۔

(رٹھڑے پندھ، ریڈیو ڈراما)

O

اے ڈوہیں مکالمے حفیظ خان دے لکھیئے ہوئے ڈرامیں وچوں ہن جیڑھے اُنہیں دی کتاب ''رٹھڑے پندھ'' وچ شامل ہن۔ حفیظ خان سرائیکی دا مہاندرا کہانی کار تے ڈرامہ نگار ہے۔ اوں ریڈیو تے ٹیلی ویژن کیتے بہوں سارے جاندار تے شاندار ڈرامے لکھن۔ او سرائیکی وسیب توں علاوہ ریڈیو سنن آلیں تے ٹی وی ڈیکھن آلیں وچ بہوں مقبول تھیّن۔ ایندی وجہ اے ہے جو انہاں ڈرامیاں دا موضوع اساڈے سرائیکی وسیب دا چُبھن آلا موضوع ہے تے اے کہانیاں گھر گھر دیاں ہن۔ سرائیکی وسیب دیاں محرومیاں، رسم ورواج، سماجی پابندیاں، وٹے سٹے دی شادی، ونی بنن دی رسم، پنچایت تے ذات برادری دے فیصلے، تریمتیں نال غیر انسانی سلوک تے انہیں کو بھیڈیں بکریں آلی کار ٹور ڈیون تے ویچ ڈیون تے مرداں دی ضد تے انتقام دا نشانہ بنا ڈیون تے ایں طرح دے بہوں سارے جھگڑے جھیڑے تے بکھیرے حفیظ خان دے باشعور تے جرأت مند قلم دا منطقی نتیجہ ہن۔ جیڑھے ''رٹھڑے پندھ'' وچ ست ڈرامیں دی تحریری شکل وچ شامل ہن۔ کون دلاں دیاں جانے، ہٹنگل پیسہ، اینویں وی تھیندا ہوندے، ماسی سیانی، رٹھڑے پندھ، اپا پیپ تے پھیکوی جھمر، ایں توں پہلے ''کچ دیاں ماڑیاں'' دے ناں نال حفیظ خان دے ڈرامیں دا مجموعہ چھپ چکیئے جیکوں اکادمی ادبیات پاکستان ولوں خواجہ فرید ''ایوارڈ'' وی مل چکیئے تے انہیں دا ہک ڈرامہ ''بھردی کندھ'' اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور دے ایم اے سرائیکی دے نصاب وچ شامل ہے۔

''رٹھڑے پندھ'' دے اے ست ڈرامے کہانی، موضوع، مکالمے، منظرنامے تے کرداریں دے حوالے نال ست رنگے وی ہن تے سرائیکی ثقافت، سرائیکی ریت تے روایت دی نمائندگی وی کریندن۔ جتھوں تئیں انہیں ڈرامیں دے موضوع دا تعلق ہے میں اوندے بارے اشارے ڈے ڈتن تے اہم گالھ وی ایہا ہے جو اے سارے موضوع اساڈے آسے پاسے دے ہن تے اساڈے اپنے موضوع ہن۔ انہیں دا اساڈے وسیب نال سانگا وی ہے تے گانڈھا وی۔ ایں طرح جیڑھے کردار

حفیظ خان تحلیق کیتن اوڈرامے دے موضوع نال پورے طورر تے لگا کھاندن تے موضوع نال پورا انصاف کریندن۔۔اے یکے کردار اُٹھدے باہندے، بولیندے چلیندے تے وڈی مہارت نال اپنی ذمہ داری نبھیندے نظردن تے ایندے وچ حفیظ خان دی مشاہدے دی قوت، تجربے دی وسعت تے کردار تخلیق کرن دی قدرت وی صاف ڈسدی اے۔ایں حوالے نال ثمرین، عابد، نوشابہ، حنا، سہیل، کرموں، رمضو، بلقیس، ثریا، رفیق، طارق، نرگس، تھانیدار، سنتری، حبیب، سلمیٰ، ننھی، رونی، نواز، سلمیٰ، ماسی سیانی، جمال، روبینہ، نسیم، زیبو، احمد بخش، فیض بخش، اپا پیپ، اپا پیپ دی اماں، دکاندار، ماسی، شبو، زرینہ، وسودر کھان، ڈیوایا، رحیمن کمبھار، کمبھار دی ذال، بڈھرا غلام فرید، رکھل، سوہنی، شاکر تے رضیہ......ایندے نال نال خود تخلیق کار ڈرامہ نگار تے کہانی کار حفیظ خان وی شامل ہے۔کیوں جو جے تیئں لکھن آلا خود کردار نہ بن ونجے تے انہیں وچ رنگیا نہ ونجے او تیئں کردار نگاری دا حق ادا نی تھی سکدا۔ایہا وجہ ہے جو اے کردار کامیاب وی ہن تے نمائندہ وی۔تہوں حفیظ خان دا انتساب سچ وی ہے تے حق وی۔حفیظ خان دے لفظ دل کوں لگدن کیوں جو اے اوندے تخلیقی عمل دا حصہ ہن۔انھاں کرداراں دے ناں، جیڑھے میڈی زندگی دے ڈرامے وچ حقیقت بن تے آئے تے ول پرچھانویاں وانگوں اوپرے تھی گئے۔"

دانشوریں دا آکھن اے ہے جو ڈرامہ ڈیکھن دی شئے ہے پڑھن دی نئیں۔ہوسگدے اے آکھیا درست ہووے پر ڈیکھن تے پڑھن وچ فرق وی تاں ہوندے۔ڈرامہ ڈیکھو تے بھُل ونجو بس چس چاؤ۔ہس کھل گھنو یا ول رو گھنو...... پر جے کرائیں پڑھ گھنو تاں ہر گالھ دل تے نقش تھی ویندی اے، زندگی دا حصہ بن ویندی اے، یا درہ ویندی ہے تے سبق سکھیندی اے۔ایہا ڈرامے دا بنیادی مقصد وی ہے تے ایندا جواز وی۔حفیظ خان "رُٹھڑے پندھ" دے ڈرامیں دے حوالے نال ایہو مقصد سامنے رکھ تے سرائیکی وسیب وچ راہون والیں کوں شیشہ ڈکھائے تے کہیں جاہ تے کھل تے احتجاج آکھ گھدے، سنڑوا گھدے تے ڈسا ڈتے، آوازیں دی شکل وچ، مکالمیں دی صورت وچ...... منظر نامے دی تصویر وچ......غرض کہیں رنگ وچ ڈیکھوں حفیظ خان ساڈے نال نال چلدا پئے تے کیتے، کتھائیں کاوڑ ڈکھائی ہس تے کتھائیں چپ تھی گئے...... پر ایں چپ وچ وی اُوں بہوں کجھ

ڈیکھن، پڑھن تے سنن آلیں کوں اپنا سنگتی تے ہم سفر بنا گھندے   فن کار دی اصل کامیابی وی ایہا ہے جو او ہر کہیں کوں نال لا گھندے تے اے خاصیت حفیظ خان وچ موجود ہے۔ ذاتی حوالے نال وی، میڈے نزدیک او ہر حوالے نال کامیاب ڈرامہ نگار ہے تے ایندا ثبوت اے ڈرامے ہن تے جیڑھا سفر ''کچ دیاں ماڑیاں'' توں شروع تھیا ہا او ''رنگڑے پندھ'' توں تھی کرائیں اگوں تے ودھدا پئے تے سرائیکی نثر وچ خوشگوار اضافے دا موجب ہے۔ نویں لکھن آلیں کیتے ہک چنگی تے حوصلہ افزا روایت وی قائم کریندے تے میکوں اے آکھن توں کوئی نئیں روک سکدا جو سرائیکی ڈرامہ حفیظ خان دے ڈکھائے ہوئے رستے تے چلدا پئے۔ میکوں امید ہے جو حفیظ خان دا ڈرامائی سفر جاری رہسی۔

O

(ریڈیو پاکستان بہاولپور دے ادبی پروگرام ''پچوار'' وچ پڑھیا گیا مضمون)

(روزنامہ خبریں، ملتان، 4 اگست 2006ء)

کچ دیاں ماڑیاں

ملک ممتاز احمد زاہد

''کچ دیاں ماڑیاں'' حفیظ خان دے ڈرامیاں دا ہک سوہنڑاں جیہا مجموعہ ہے۔ تے ایکوں بہوں سوہنڑاں کرتے چھاپیا گئے۔ ایندے وچ انھاں دے چھی ڈرامے شامل ہن۔ جھاں دے عنوان اے ہن۔ ڈوں ڈونڑیں ہک، پچھاویں، کچ دیاں ماڑیاں، ریشم دی کلھی تند، بھُر دی کندھ، پیلے پتراں دی بہار۔

حفیظ خان دے ڈرامے انھاں دی فن دی پختگی دے ضامن ہن۔ انھاں ڈرامے دے لوازمات دا خیال وی رکھیے۔ تے وسیب تے دھرتی دی ترجمانی وی کیتی ہے۔ ایہ ڈرامے ترائے سالاں وچ لکھے گیئن۔ یعنی 1979ء، 1978ء، 1977ء وچ۔

انھاں آپڑیں ڈرامیاں دے کرداراں وچ جان پاون دی کوشش کیتی ہے۔ انھاں دے کمالات کوں انھاں دے حالات تے رہتاں وی شخصیت دے مطابق رکھئے۔ انھاں دے پلاٹ کوں وی گرفت وچ رکھئے۔ انھاں وچ ورتی گئی زبان وی سادہ تے پُر اثر ہے۔

حفیظ خان جلدی جلدی زندگی دے مختلف میداناں وچوں گزردے آندن۔ انھاں دا تجربہ، مشاہدہ تے فکری انداز آپڑیاں منزلاں طے کریندے آندن۔ تے ایہ وڈے شعور نال آپڑیاں

تخلیقات دی لڑی وچ پوندن وینّدن۔ ریڈیائی لہراں تے بھیجے گئے ڈرامے زیادہ دلچسپ ہن۔ کیوں جو انہاں وچ احتیاط ورتی گئی ہے۔ تے فنی لحاظ نال وی خوب پرکھیا گئے۔

"کچ دیاں ماڑیاں" 256 صفحیاں دی کتاب ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ، جلد وغیرہ بہوں سوہنڑیں ہے۔ اینداملُ 80 روپے تے ایندے ملن دا پتہ ہے، سرائیکی اکیڈمی ملتان۔

O

(ماہنامہ "سنہڑا" بہاول پور، اکتوبر 1989ء)

کچ دیاں ماڑیاں

خان رضوانی

''کچ دیاں ماڑیاں''......حفیظ خان دے سرائیکی ڈرامیاں دا ایہہ مجموعہ سرائیکی ادب دی تاریخ وچ ایں لحاظ نال ہمیشہ سنگِ میل دی حیثیت رکھیسی جوایندے ذریعے سرائیکی ڈرامے کوں ہک نواں اسلوب ملے تے او ہے ''نثریاتی اسلوب''......ایندا سہرا حفیظ خان دے سر ہے جوانہاں سرائیکی ادب کوں جدید دور دے تقاضیاں نال ہم آہنگ وی کیتے۔ تے نویاں جہتاں نال روشناس وی کرائے۔

سرائیکی ڈرامے دی تاریخ قدیم ہے۔سرائیکی ڈراما آپڑیں وسیب تے سماج دی عکاسی کریندے،اتے سرائیکی ادب تے زبان دے زندہ تے توانا ہوون دا ثبوت ہے۔تاریخی پس منظر دے حوالے نال ہن تئیں سرائیکی ڈرامے کوں سٹیج ڈرامے دی حیثیت حاصل رہی ہے۔جتھیں ویلے جو ضرورت ایں گالھ دی ہئی اُونکوں جدید ادبی تقاضیاں نال رلایا ونجے۔الیکٹرانک میڈیا دی وجہ نال ڈرامہ سٹیج توں اُٹھی تے ہوا دے دوش تے سوار ہے۔ تے سرائیکی ڈراما وی ہن ایں میدان وچ پچھوں کوئینی۔

حفیظ خان او پہلے لکھاری ہن جنہاں سرائیکی ڈرامے کوں نثریاتی لب ولہجہ عطا کیتے۔

سرائیکی ادب وچ انہاں دی ایہہ تخلیقی کاوش جتھاں نقشِ اوّل ہے......اُتھاں اُنہاں دا ناں وی سرائیکی زبان وادب دی تاریخ وچ ہمیشہ چمکدا دمکدا رہسی......

سرائیکی اکادمی ملتان کوں ''کچ دیاں ماڑیاں'' پیش کرن دا فخر حاصل تھیندا پے، سرائیکی اکادمی پہلے وی سرائیکی زبان وادب دیاں کتاباں قارئین دی خدمت وچ پیش کر چکی ہے تے ساکوں یقین ہے جو ''کچ دیاں ماڑیاں'' وی ادب دے قارئین وچ مقبولیت حاصل کریسی۔

O

(فلیپ ''کچ دیاں ماڑیاں'' جنوری 1989ء)

حفیظ خان بحیثیت شاعر

حفیظ خان کی نظمیں

عرش صدیقی

حفیظ خان کی نظمیں ڈرامے کے اختتام کے بعد کی ڈرامائی بے چینی کی تخلیق ہیں۔اس لیے وہ زندگی میں مسلسل جاری ڈرامے کا عکس پیش کرتی ہیں۔

معلوم نہیں حفیظ خان نے سن شعور تک پہنچنے سے پہلے شعر کہنے کی صلاحیت کا کبھی اظہار کیا تھا یا نہیں۔میرے خیال میں ایسا نہیں ہوا ہوگا کیونکہ بالغ ہونے سے پہلے فرد اور معاشرہ دونوں صرف اور صرف موزوں، رواں اور سروالی شاعری ہی کر سکتے ہیں۔جبکہ حفیظ خان نے اب تک زیادہ نثری نظمیں ہی لکھی ہیں۔دراصل نثری شاعری شعور کی بلوغت کے بعد کا کارنامہ ہے۔دنیا کے کسی بھی قدیم معاشرے میں،تہذیب کے کسی بھی ابتدائی دور میں نثر میں شاعری نہیں کی گئی۔حفیظ خان کے ڈراموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا اور پھر ڈرامے لکھے اور شاعری کی طرف ذرا دیر سے راغب ہوئے۔انھوں نے ڈرامے 1976ء اور 1980ء کے دوران لکھے۔اس سے پہلے انھوں نے افسانے بھی لکھے۔دنیا کے تمام قدیم ترقی یافتہ ادوار میں ڈرامہ لکھا گیا افسانہ نہیں اور ڈرامہ بھی منظوم لکھا گیا۔نثری نظم کی طرح نثری ڈرامہ بھی معاشرے کی بلوغت اور تہذیب کے ایک خاص حد تک ارتقاء کے بعد ظہور میں آیا۔یہی صورت افسانے کی ہے۔ہاں کہانی سننے کی روایت باقاعدہ ڈرامے کی تخلیق سے قدیم تر ہے۔ہم حفیظ خان کی افسانہ نگاری کو جو انھوں نے 1973ء میں کی فی الحال ایک طرف رکھ سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ سن

بلوغت کو پہنچنے کے بعد حفیظ خان نے جس صنف ادب کو باقاعدہ طور پر سب سے پہلے اپنایا وہ ڈرامہ
تھا۔ بیشتر شعراء اور افسانہ نگاروں کے ہاں یہ ثابت ہوتا رہا ہے کہ وہ بچپن سے ہی شاعری اور افسانہ
نگاری کی طرف راغب رہے ہیں لیکن ڈرامہ نگاری میں ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے گو کہ بعض
اس کے برعکس بھی ملتی ہیں۔ سٹیج ڈرامے کی روایت ہمارے ہاں کسی زمانے میں بڑی مستحکم تھی۔ ملک
کے بیشتر کالجوں اور سکولوں میں ڈرامہ کلب بنے تھے جو ڈرامے میں کردار اور نوع کی تربیت کا ذریعہ
تھے۔ پہلے ڈرامہ اور پھر سٹیج، کالجوں اور سکول سے تقریباً ختم ہو گیا۔ چند تھیٹر جو ملک میں کام کر رہے
ہیں وہ محض ایک مہنگا شوق پالنے تک محدود ہیں اور بس۔ ٹیلی ویژن کے آنے سے پہلے ریڈیو ڈرامہ
بہت مقبول رہا۔ پھر ٹیلی ویژن نے ملک کے بہت سے سینما گھر بند کروا دیئے۔ حفیظ خان ڈرامہ نگاری
کی طرف کیوں راغب ہوئے اس موضوع پر تحقیق کا شاید ابھی وقت نہیں آیا۔ لگتا یوں ہے کہ وہ اظہار
ذات اور انکشافِ ذات کے عمل سے گزر رہے تھے اور کسی ایسے ذریعہ ابلاغ کی تلاش میں تھے جو ان
کے اظہار کو دوسروں تک آسانی سے پہنچا دے۔ اوائل زندگی میں عام طور سے اس آرزو کو محدود کرنا
مشکل ہوتا ہے لیکن تجربے اور مشاہدے میں وسعت کے بعد باشعور فنکار عام طور سے اس آرزو کی حد
بندی کرنے لگتا ہے اور شہرت محض کو ہی زندگی کا مقصد وحید قرار دینے سے گریزاں نظر آتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ حفیظ خان کو بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ ریڈیو ڈرامہ ایسے ڈرامہ نگار کی تشفی نہیں
کرسکتا جو انکشافِ ذات اور اظہارِ ذات کے عمل کو اہمیت دیتا ہو اور شہرت کا ذریعہ بھی بنتا ہو۔ معلوم
نہیں ٹیلی ویژن ڈرامے کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ٹیلی ویژن ڈرامہ وہ
سب کچھ کرسکتا ہے جس کی مختلف ادیبوں اور فنکاروں کو آرزو ہوسکتی ہے لیکن وہاں کامیابی کے راستے
کم بھی ہیں اور محدود بھی۔ پھر یہ کہ شہرت تو آسانی سے مل جاتی ہے عظمت کم کم ملتی ہے۔

شاعری کی طرف حفیظ خان خاصی دیر سے آئے۔ ان کی نظموں کی تخلیق کی تاریخوں سے پتہ
چلتا ہے کہ پہلی نظم انھوں نے اپریل 1985ء میں لکھی۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ جس صنف ادب میں
ایک ادیب پہلے کامیابی حاصل کرلیتا ہے۔ اس کے سحر سے نکلنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے اور اس
کے اثرات ان دوسری اصناف میں تخلیق پر اثر انداز ہوتے ہیں جنھیں وہ بعد میں اختیار کرتا
ہے۔ شاعری کو شاعر کی ذات اور زمانے سے الگ کر کے دیکھنے کا اپنا جواز ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ماضی کا
ادب محفوظ بھی نہ رہتا اور ہم اس کی تفہیم اور تحسین بھی نہ کرپاتے۔ تاہم یہ اصرار غلط ہوگا کہ فن پارے کو
فنکار اور اس کے زمانے سے ہمیشہ الگ رکھ کر ہی دیکھا جائے کہ یوں فن پارے میں فن کی ابدی اقدار

کی تلاش آسان ہوگی۔ معلوم نہیں جنہیں ہم فن کی ابدی اقدار قرار دیتے ہیں وہ آئندہ ایک ہزار برس
بھی زندہ رہ سکیں گی یا نہیں۔ جناب علی عباس جلالپوری نے تو اس خیال کو بھی ایک فکری مغالطہ قرار دیا
ہے کہ اخلاقی قدریں ازلی اور ابدی ہیں۔ ان آراء کے باوجود یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تخلیق اور
شاعر کے ذاتی حوالے اس کی شاعری کی تفہیم اور تحسین کے دائرے میں وسعت پیدا کرتے ہیں اور یہ عمل
بالآخر خود زندگی کی بہتر تفہیم اور تہذیب کے ارتقاء کے عمل کو تیز کرتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ آج تنقید محض کسی
فن پارے کو پسند ناپسند کرنے سے بہت آگے نکل کر ایک باقاعدہ سماجی اور تہذیبی علم کا درجہ اختیار کر چکی
ہے اور ایسے مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں سے دوسرے علوم کی طرح یہ بھی تہذیب کے ارتقاء میں [illegible]
بھی کرتی ہے اور اسے سمجھنے میں معاونت بھی کرتی ہے اور یوں ہم فرد اور اجتماع کی سائیکی کی تفہیم بہتر طور
سے کرسکتے ہیں۔ اس لیے اگر میں بار بار حفیظ خان کی ذات کا حوالہ دوں تو وہ غلط نہیں ہوگا۔

حفیظ خان نے بچپن میں شاعری نہیں کی۔ ان کی شاعری ابھی زیادہ تر نثری نظموں پر مشتمل ہے
۔نثری نظم کی تخلیق جدید ترقی یافتہ معاشرے ہی میں ممکن ہوسکتی ہے۔ نثری نظمیں ہمیشہ [illegible]
بلوغت کے دور کا تخلیقی عمل ہیں۔ اسی لیے اس شاعری کو محض الہام اور لاشعور کا کارنامہ قرار نہیں دیا
جاسکتا۔ نثری نظم کے خالق کے بارے میں یہ ماننا پڑے گا کہ وہ شعوری طور پر نثری شاعری کر رہا ہے
جس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کو سمجھتا بھی ہے۔ نثری نظم کا شاعر جانتا ہے کہ اس
نے جو ذریعہ اظہار کا اختیار کیا ہے وہ شہرت اور رتبے کی ضمانت نہیں ہے اور اسے زیادہ قاری بھی میسر
نہیں آئیں گے۔ اس کے باوجود وہ نثری نظم لکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے
وہ اس کے نزدیک بہت اہم ہے اور یہ کہ وہ انکشاف ذات اور اظہار ذات کے عمل کو بہت زیادہ اہمیت
دیتا ہے۔ یہ بات حفیظ خان کی نظموں کی تفہیم کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے۔

حفیظ خان کن موضوعات کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہیں اس کا تعین ممکن نہیں۔ ان کی نظموں کا
مزاج موضوعی ہے اس لیے ان میں بالکل واضح طور سے ایک موضوع الگ کر کے کاغذ پر نہیں رکھا
جاسکتا۔ یوں لگتا ہے کہ وہ زندگی کے دراصل میں پیش آنے والے ایسے لاتعداد چھوٹے چھوٹے واقعات
کے سامنے کھڑے ہیں جو نہیں ہر لمحہ تحیر کا ایک نیا عکس دکھاتے ہیں۔ چنانچہ ان کی ہر نظم ایک ڈرامائی جھلکے
کا تاثر پیدا کرتی ہے اور قاری کو تحیر کی ایک نئی راہ پر ڈال دیتی ہے۔ تحیر کی یہ فضا بہت الگ ہے اور ڈرامائی
ہونے کے باوجود اینٹی ڈرامائی بھی ہے۔ ان کی ہر نظم قاری کو سوچتے رہنے کے لیے چھوڑ جاتی ہے۔ ہر نظم
قاری کو معلق احساس کے تجربے سے گزارتی ہے۔ زندگی میں کچھ بھی سادہ نہیں ہے۔ جس طرح [illegible]

Poetry بھی آج Poetry ہے۔اس طرح اینٹی ڈرامہ بھی آج ڈرامہ ہے۔سٹیج کے کمزور پڑنے کے بعد اور اردو مشاعروں کی روایت کے تقریباً ختم ہونے کے بعد یہ دونوں روایتیں اب ڈرامہ نگار، شاعر اور قاری کے اندر راسخ ہوگئی ہیں۔حفیظ خان نے ریڈیو ڈرامے کی Extension میں نثری نظمیں لکھی ہیں۔ہر نظم میں ایک بیان ہے اور ایک واقعہ بظاہر بہت معمولی اور چھوٹا سا واقعہ، جیسے چیخوف کے ڈراموں کے واقعات لیکن ان سے پیدا ہونے والا ''معلق احساس'' کا تجربہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کی ایک فلسفیانہ سطح بھی ہے اور یہی فلسفیانہ سطح نظم میں ڈرامائی تحیر پیدا کرتی ہے اور حفیظ خان کو عام ڈرامے سے بہت آگے لے جاتی ہے۔یہ تحیر محقق کو چونکانے کے عمل کا نتیجہ نہیں ہے۔چیخوف اور اس کے بعد آنے والے بے شمار ڈرامہ نگاروں نے ثابت کردیا ہے کہ چونکانا اور عجیب وغریب واقعات یا حالات کے ذریعے تحیر کی فضا پیدا کرنا اب کوئی بڑی اہم بات نہیں رہی۔زندگی کی پراسراریت کو ایک عرصہ محض خارج میں محسوس کیا جاتا رہا پھر اسے فرد کے داخل سے مماثل کردیا گیا لیکن یہ پراسراریت داخل اور خارج دونوں میں ہے اور ہر وقت اور ہر جگہ ہے۔حفیظ خان کو اس کا احساس ہے۔ان کی نظم میں درج واقعہ بظاہر اتنا غیر ضروری لگتا ہے کہ جیسے یہ کوئی واقعہ نہیں ہے۔لیکن جب ہم اس واقعہ کے عقب میں ہو چکے ڈرامے اور ہر لمحہ زندہ میدان کارزار کے وجود کو محسوس کرنے لگتے ہیں تو یہ واقعہ بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔اسی لیے ان کے امیجز (Images) غیر واضح ہیں۔یہ بات اس لیے بھی دلچسپ ہے کہ بیشتر نثری نظموں میں واضح اور توجہ کو فوری طور سے کھینچنے والے امیجز ہی ان کی قوت اور ان کا حسن ہیں۔

حفیظ خان کی ہر نظم زندگی کے ڈرامے کے کسی ایک بظاہر غیر اہم ٹکڑے پر استوار ہوتی ہے۔ لیکن ان میں ایک باطنی ربط اور ایک ایسا رشتہ موجود ہے جو انہیں اظہارِ ذات کا ایک مظہر بناتا ہے۔

حفیظ خان کی ہر نظم بہت مختصر ہے۔انھوں نے اس بات کی پرواہ نہیں کی اور بہت ثابت قدم رہے کہ انھوں نے ڈرامے کے برعکس اور نظموں کو ڈرامے کی Extension بنانے کے باوجود، قاری یا سامع کو بڑی حد تک نظر انداز کردیا ہے۔اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ حفیظ خان کی نثری نظموں کی تحسین کے لیے انہیں تنہائی میں کم سے کم دو مرتبہ پڑھنا اور پڑھنے کے بعد کم سے کم پانچ منٹ خاموش رہ کر آنکھیں بند کرکے نظم کو ''دیکھنا'' ضروری ہے۔

O

(23 اکتوبر 1989ء)

بحیثیت کالم نگار

''اس شہر خرابی میں'' حفیظ خان کا گھٹتا ہوا دم

پروفیسر عقیل جابر

مجموعہ میں شامل وہ کالم جن سے اتفاق کیا جا سکتا ہے ان کو پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ حفیظ خان کا کالموں کا مجموعہ ''اس شہر خرابی میں'' اس کی حبس زدہ زندگی کا عکاس ہے۔ لگتا ہے اس کی زندگی مسلسل سلگاؤ کا آئینہ ہے۔ وہ کسی موڑ پر زندگی سے Compromise کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ سماج کے ہر نظام سے ٹکرانا چاہتا ہے۔ اس کے اندر ایک ایسا آتش فشاں ہے جسے پھٹنے کا موقع نہیں مل رہا۔ اس کے لفظوں میں اتنی شدت ہے جس کا اظہار ممکن نہیں ہے۔ اس کی پلکوں پر صدیوں سے ایسے آنسوؤں کا قبضہ ہے جو بہہ نہیں سکتے۔ وہ باغی ہے اپنے سٹائل کا اپنے وژن کا یوں لگتا ہے اسے زندگی میں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ ایسا کالم نگار ہے جس نے کبھی کسی اور کالم نگار سے Adjust نہیں کیا۔ ''اس شہر خرابی میں'' شامل کالم اپنی منفرد حیثیت میں دکھائی دیتے ہیں۔ حفیظ خان جتنا Hostile ہے شاید کوئی اور نہ ہو۔ اس کے لفظوں کی چبھن کانٹوں کی چبھن سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ وہ اتنا کچھ کہہ جانے کے باوجود بھی شاید ابھی بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اپنے کالم ''وہ آنسو جو بہہ نہیں پاتے'' میں لکھتا ہے:

''میں اپنے معاشرے کی عمومی حالت پر نگاہ ڈالتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ یہاں ہر شعبے میں معاملات واختیارات کے فطری بہاؤ کے سامنے بددیانتی اور بدنیتی کے

بند باندھ دیئے گئے ہیں۔ایسے بند کہ جن سے سچائی اور نیک نیتی کی کوئی نہر نہیں نکلتی اور نتیجتاً پانی ہے کہ چڑھتا جارہا ہے اور ہم مگن ہیں کہ سب دریا اپنے ہیں، سمندر ہمارے دوست ہیں۔ پریشر ککر سے بھی اچھا کھانا مطلوب ہو تو ایک وقت معین کے بعد اس کا سیفٹی والو کھول کر بھاپ کے فالتو پریشر سے چھٹکارا پانا ضروری ہے وگرنہ پلاؤ کا بھات اور گوشت کی حلیم بن جاتی ہے۔ مگر ہم ہیں کہ پورے معاشرے کو بے حسی کے ائیر ٹائٹ پریشر ککر میں ڈال کر ہمہ قسم کی منافرتوں کی آگ پر دھر دیا ہے۔''

حفیظ خان کے جذبوں کی اس شدت کو یہ معاشرہ کوئی راستہ نہیں دے رہا۔ اپنے کالم ''کے وکیل کریں''، میں زندگی سے ان کے تعلق کا اظہار یوں ہے:

''زندگی اس قدر بھی افراتفری، نارسائی، لوٹ کھسوٹ اور غیر یقینی کا شکار ہو سکتی ہے کبھی تصور میں بھی نہ سوچا تھا۔ متوجہ ہونا تو ایک طرف رہا کوئی کسی کی بات سننے کو تیار نہیں۔ ہر کوئی اپنے اپنے خول میں بند ہو کر ایک کے اوپر ایک نئی پرت چڑھائے چلا جارہا ہے۔ ایک بھاگم بھاگ سی ہے کہ جیسے شہر میں کوئی دیو گھس آیا ہو اور اعلان کر دیا گیا کہ جاں صرف اس کی بچ پائے گی جو دوسروں کو لتاڑ، اکھاڑ پچھاڑ، روندراند کر سب سے پہلے شہر کے دروازے پر پہنچے گا۔ لہٰذا سب کے پاس جیتنے کو اور جو بھی ملتا ہے سمیٹ لینے کو بس صرف یہی ایک پل، ایک گھنٹہ اور آج کا دن ہی بچا ہے۔ دوست دوست سے مائل بہ بیگانگی، ہمسایہ ہمسائے سے برگشتہ، والدین اولاد کی حسب توقع کارکردگی سے ناامید، اولاد والدین کے لطف وکرم سے مایوس، بیوی شوہر سے نالاں اور شوہر بیوی کی عدم توجہی کا شاکی، فتنہ وفساد آباد اور آبادیاں باہمی رنجشوں کے سبب برباد۔''

کتنا سچ ہے حفیظ خان کی اس تحریر میں اور شاید یہی سچ اس کی زندگی کا روگ ہے وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔

حفیظ خان مصلحت سے کوسوں دور ہے یہ اس کے مزاج کا حصہ بھی نہیں ہے۔ جرأت، بے باکی حوصلہ، عزم اس کی تحریر کا اثاثہ ہیں، اس کا قلم بے خوف ہے وہ جو لکھنا چاہتا ہے بے دھڑک لکھتا چلا جاتا ہے اس کی تحریر میں آس اور امید کے پھول بھی مہکتے ہیں اور معاشرتی کھوکھلے پن پر دکھ بھی بکھر کر سامنے آتے ہیں۔

حفیظ خان کی کالم نگاری بڑی Verstile ہے اس کا وژن بڑا Broad ہے۔اس کے موضوعات محدود نہیں ہیں۔اس کے کالم زندگی کے ہر گوشہ پر محیط ہیں۔ان میں فلسفہ بھی ہے،ادب بھی، انسان دوستی بھی ہے اور انسانوں کی بے بسی کی تصویریں بھی۔کالم ''شاکر کی پریشانی''،''زندہ دلی کی موت''اور''بڑے دل والا آدمی''ہمیں اندر کے حساس حفیظ خان کا بھی تعارف کرواتے ہیں جس میں انسانوں سے محبت کا جذبہ اور احترام حفیظ خان کی شخصیت کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں اسی طرح کالم ''عجیب مانوس اجنبی تھا'' تابش صمدانی کے لیے لکھا گیا ہے جن سے حفیظ خان کی انتہائی عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔

اپنے ایک کالم ''اعتبار، برداشت اور انصاف'' میں حفیظ خان نے کھری کھری باتیں کی ہیں وہ ہمارے سامنے یہ حقیقت کھول رہے ہیں دنیا ان تینوں ستونوں کے بغیر کچھ بھی نہیں اور جو کچھ آج معاشرے میں ہو رہا ہے اس کی وجہ ان تین چیزوں کا کھو جانا ہے۔بقول حفیظ خان:

> ''آخر ہو کیا گیا ہے، بیوی شوہر سے نالاں،شوہر بیوی سے رنجیدہ،استاد شاگرد کی بے ادبی کی شکایت کرتا ہوا اور شاگرد استاد کی مادیت پرستی سے کبیدہ خاطر،ڈاکٹر مریضوں کی غیر مریضانہ روش سے ناراض اور مریض ڈاکٹر کے انداز مسیحائی سے ''جیب کناں'' اور جاں بلب۔غرض یہ کہ کوئی بھی رشتہ ہو یا سماجی تعلق،سبھی میں ان دیکھی دراڑیں در آئی ہیں۔لگتا ہے وہ اعتبار کہیں کھو گیا جو ان رشتوں کو مستحکم کرنے کا باعث تھا۔ انسانوں کا سماجی Interaction باہمی اعتماد سے محروم ہوکر رشتوں کو تقویت دینے کی بجائے ان کی بیخ کنی کرتا ہوا چلا جا رہا ہے۔''

بقول حفیظ خان ''معاشرے اعتماد کے ساتھ ساتھ رواداری اور برداشت کی تقویت سے بھی تشکیل پاتے ہیں۔باہمی اعتماد باقی نہ رہے تو پھر برداشت بھی عدم برداشت کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو اس وقت ایک عمومی رویے کی شکل میں ہمارے معاشرے کو انتہائی بے رحمی سے کھوکھلا کیے جا رہی ہے۔'' کاش حفیظ خان کے جذبوں کی کوئی منزل ہوتی۔کاش حفیظ خان کے دکھوں کا کوئی مرہم یا مداوا ہوتا۔کاش حفیظ خان کے خوابوں کی کوئی تعبیر ہوتی کاش حفیظ خان کے آنسو بہہ کر دنیا کے سارے اندھیروں کو روشن کر دیتے۔کاش کاش کاش......

O

(روزنامہ ''نوائے وقت''،ملتان،17 مارچ2009ء)

اس شہر خرابی میں

عامر حسینی

''اس شہر خرابی میں'' حفیظ خان کے کالموں پر مشتمل کتاب ہے۔ یہ کتاب اکتوبر ۲۰۰۶ء سے نومبر ۲۰۰۷ء تک لکھے گئے کالموں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ حفیظ خان سے پہلا تعارف ان کی رفعت عباس پر لکھی کتاب بنی تھی۔ حفیظ خان کا یہ کام تحقیق وتنقید کے باب میں بہت وقیع کام تھا اور پھر ان کی کتاب ''خرم بہاولپوری، شخصیت، فن اور شاعری'' پڑھنے کا موقع ملا جس میں انھوں نے عرق ریزی سے سرائیکی خطے کے ایک فراموش کردہ شاعر کو دوبارہ سے سامنے لانے کے لیے مواد اکٹھا کیا تھا۔

''اس شہر خرابی میں'' میرے سامنے صحافی، کالم نگار حفیظ خان کھڑا تھا۔ ان کے کالموں کی کتاب اتنی دلچسپ تھی کہ میں نے اس کتاب کو ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالا۔ یہ کالم پاکستانی ریاست اور اس کے معاشرے کو درپیش سیاسی، آئینی، سماجی، معاشی، نفسیاتی، معاشرتی مسائل کے آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے اس میں ایک تصویر بنانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اس کتاب کا جو دیباچہ خود انھوں نے تحریر کیا ہے وہ صحافتی دنیا پر ان کی گہری نظر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

حفیظ خان نے ''کمرشل کالم نگاروں'' اور ان کی کاروباری کالم نگاری کے جو لتے لیے ہیں وہ

خاصا جرأت کا کام ہے۔ مجھے وہ اس لیے بھی اچھے لگے کہ ان کی کالم نگاری کہیں بھی شاہوں کی قصیدہ نگاری نہیں بنی ہے اور نہ ہی ان کی کالم نگاری میں عام لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوئی شعوری یالاشعوری کوشش پائی جاتی ہے۔ ان کے کالموں کا جو انتخاب میرے سامنے ہے اس میں انھوں نے حکمران طبقات سے اپنے یارانوں کے گُن نہیں گائے، کسی آمر کی قصیدہ خوانی نہیں کی ہے۔ انھوں نے کسی جگہ بھی اپنی پاکبازی، دلیری، شجاعت اور عبقریت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا ہے۔ ان کی تحریر میں تعلّی، زعم علم کے بجائے دردمندی، گرمئی احساس جھلکتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ کالم نگاری کرتے ہوئے انہوں نے اختصار، ایجاز جیسی صنائع کو برتا ہے اور ''ابلاغ'' کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ ویسے یہ پرندے کبھی میرے ہاتھ نہیں آئے۔

ان کالموں میں تجریدیت کا غلبہ بھی جا بجا نظر آتا ہے۔ کتاب کا پہلا کالم ''وہ آنسو جو بہہ نہیں پائے'' اس کی عمدہ مثال ہے۔ حفیظ خان کے کالموں میں زبان کے چٹخارے بھی جا بجا موجود ہیں حالانکہ وہ اہل زباں بھی نہیں، ان کی مٹی کا خمیر گنگا و جمنا سے نہیں اٹھا نہ ہی اردو کی جائے پیدائش سے ان کا کوئی تعلق ہے۔ پھر بھی زبان کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی ہے۔ اسے دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کرسکتا کہ ایک راجپوت جو سرائیکی دھرتی میں انجذاب کے عمل سے گزر کر سرائیکی بولتا ہے اس کی نثر مثل اہل زبان ہوگی۔

حفیظ خان کا مزاج ہیئت مقتدرہ (Establishment) اور ہیئت حاکمہ (Status Quo) کے خلاف رہا ہے۔ اردو پریس میں ایسے کالم نگاروں کی بہت ہی کمی ہے جو مفادات عاجلہ کے اسیر نہ ہوں اور انھوں نے ہیئت مقتدرہ اور ہیئت حاکمہ دونوں کے خلاف قلم سے جہاد کا فریضہ سرانجام دیا ہو۔ پاکستان کا یہ المیہ رہا ہے کہ ہیئت مقتدرہ نے دوقومی نظریے، اسلام، جہاد جیسے نظریات کو مسخ کرتے اور ان نظریات کے نام پر لوگوں کے حقوق سلب کرنے کا کام سرانجام دیا اور ''اہل قلم'' کا ایک معتدبہ حصہ اس کام میں ان کے ہاتھ بٹاتا رہا۔ آمروں نے ہمیشہ قائداعظم محمد علی جناح، لیاقت علی خان، علامہ اقبال اور ان کی جماعت مسلم لیگ کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھا اور ان کے نام پر جو چاہا قوم پر مسلط کر ڈالا۔ ایوب کے زمانے سے جنرل ضیاء کے زمانے تک کئی اہل قلم اس کام پر مامور تھے کہ وہ

دیگر ''اہل قلم'' کو ان آمروں کے افعال کے جواز پر دلائل پیش کرنے کا کام سونپیں۔ بقول حبیب جالب ان جیسے قلم فروشوں کو قلم سے ازار بند ڈالنے کا کام لینا چاہیے نہ کہ لکھنے کا۔ ایسے قلم کاروں کے نزدیک سچ بولنے کا مطلب اسلام، پاکستان کو خطرے میں ڈالنا رہا ہے۔ اب تو طرفہ تماشا یہ ہوا، آمروں کے کاسہ لیس اردو کالم نگاروں کی ایک بڑی تعداد یہی کام، عدلیہ، آئین، پارلیمان، جمہوریت اور انصاف کے نام پر کرنے میں مصروف ہے بلکہ کچھ قلم کار تو یہ کام سول سوسائٹی اور میڈیا کے نام پر کر رہے ہیں۔ صد شکر حفیظ خان اس قلم قبیلے کے رکن نہیں ہیں۔ حفیظ خان کے ہیئت مقتدرہ اور ہیئت حاکمہ کے خلاف ہونے کے شواہد ان کے ان کالموں میں بکھرے پڑے ہیں۔

پاکستان کی ہیئت مقتدرہ نے آج تک پاکستانی زبانوں اور بولیوں کو ان کا جائز مقام نہیں دیا۔ ہیئت حاکمہ کی وجہ سے انگریزی کا راج ہے۔ ''اردو'' کو نمائشی طور پر ابتدائی تعلیم میں ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے۔ سندھی، پنجابی، پشتو کو تو پھر بھی کچھ مراعات حاصل ہیں۔ لیکن ''سرائیکی'' کو تو کوئی مقام تا حال نہیں مل سکا۔ پنجابی بیوروکریسی اور حکمران تا حال سرائیکی کو پنجابی سے الگ زبان نہیں مانتے اور نہ ہی اس زبان اور اس پر مبنی کلچر اور آرٹ کی سرپرستی کرنے پر تیار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی بیوروکریسی تا حال سرائیکی انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج، آرٹ اینڈ کلچر کی تشکیل پر راضی نہیں ہے۔ ''سرائیکی صوبہ'' بنانے کا مطالبہ ہیئت مقتدرہ کے ہاں بالکل ہی ناپسندیدہ ہے۔

حفیظ خان نے کسی ملامت اور کسی الزام کی پروا نہ کرتے ہوئے ہیئت مقتدرہ کو للکارا ہے۔ وہ ترقی پسند، روشن خیال قوم پرست ہیں اور اپنی شناخت کی بنیاد (Exclusiveness) خارجیت پسندی پر نہیں رکھتے۔ وہ سیکولر نقطہ نظر کے حامل ہیں جو ہماری ہیئت مقتدرہ کی نظر میں بہت بڑا جرم ہے۔ حفیظ خان مذہبی پیشوائیت (Theocracy) سے کتنے (الرجک) بے زار ہیں اس کا اندازہ ان کا کالم ''لال مسجد'' پڑھ کر خوب کیا جا سکتا ہے۔

حفیظ خان جدید سامراجی قوتوں کے مذہب اور عقیدے، آزاد معیشت اور منڈی کی معیشت کے سخت خلاف ہیں۔ فری مارکیٹ اور نیو لبرل اکنامی ایک ایسا اصول ہے جو مقامی ہیئت مقتدرہ ہی نہیں بلکہ عالمی سامراجی ہیئت مقتدرہ کے ہاں بھی ایمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ حفیظ خان اپنے ان

ہ لوں میں اس اصول پر جگہ جگہ تنقید کرتے ہیں اور انکے نزدیک منڈی کی معیشت بے یقینی، کرپشن،
رشوت اور موقع پرستی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

پاکستانی ریاست کی ہیئت مقتدرہ نے جس طرح سے نظریات کو موقع پرستی کی بھینٹ چڑھایا
اس سے جس بے یقینی نے جنم لیا، حفیظ خان اس سے پھیلنے والی تباہی کا جو جائزہ اپنے کالم ”ہمیں یقین
ہی نہیں ہے“ میں لیتے ہیں وہ رونگٹے کھڑا کر دیتا ہے۔ ہمارے حکمران، وردی میں یا بے وردی اور نوکر
شاہی کتنی بے بصیرت ہے، اس کا بخوبی جائزہ اور محاکمہ حفیظ خان نے ”وہ بدو کہاں سے لائیں؟“،
”میرے بچوں کا ملتان“، ”کھلی کچہری، بند دفاتر“، ”نازک سا ہنر“، ”فرد کا حد سے گزرنا ہے خدا ہو
جانا“ میں خوب کیا ہے۔ افسر شاہی کی بے رحمی اور ہوس کے نام نمود کا جو نقشہ حفیظ خان نے ”تماشے
وال“ میں کھینچا ہے وہ اس طبقے کی رزالت اور سفاکی کا پردہ چاک کرنے کے لیے کافی ہے۔

حفیظ خان کے کالموں میں دو کالم ”کہیں یہ ہنری کسنجر تو نہیں“ اور ”صدام حسین کی پھانسی“ عالمی
سیاست پر ہیں۔ ان کالموں کو پڑھ کر تاریخ کا کوئی بھی شناور اندازہ کرے گا کہ کالم نگار کالونیلزم اور
سامراجیت کے خلاف کن جذبات کا حامل ہے۔ حفیظ خان ان چند گنے چنے کالم نگاروں میں سے ہیں
جو مابعد سرد جنگ میں نہ تو امریکی سامراجیت کی نام نہاد روشن خیالی، سیکولر بڑھک بازی سے متاثر
ہوئے اور نہ ہی فسطائیت کے بہروپیوں کی جہاد اسلام کے نام پر سامراج مخالف ڈھکوسلے بازی سے
متاثر ہو کر انارکی پھیلانے والوں کے کیمپ میں گئے۔

حفیظ خان نے اپنے کالموں کے ذریعے خطے کے نگہ دار ہونے (Watch dog) کا کردار
بخوبی ادا کیا ہے۔ سرائیکی زبان سے جڑے مسائل ہوں، انٹری ٹیسٹ کا معاملہ ہو، بے ڈھنگے تعمیراتی
کلچر کے پھیلاؤ کی بات ہو، بے ہنگم ٹریفک اور ناقص حکمت عملی کا سوال ہو، ان کے کالموں میں ان پر
تبصرہ، تنقید اور تجویز سب موجود ہیں۔

حفیظ خان کے یہ کالم بیانیہ طرز تحریر ہونے کے اعتبار سے سپاٹ نہیں ہیں۔ ان میں رچاؤ چاشنی
اور ادبیت کا عنصر موجود ہے۔ حفیظ خان کے کالموں میں کئی جگہ کہانی، افسانے، خاکے کا رنگ آ گیا
ہے۔ ان کالموں میں کئی جگہ حفیظ خان کی اپنی زندگی کا احوال بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ”بڑے دل والا

آدمی'' خاکہ نگاری بھی ہے۔ ''شاکر کی پریشانی'' بھی ایسا ہی کالم ہے جو افسانہ زیادہ کالم کم۔ ''عجیب مانوس اجنبی تھا'' بھی افسانوی رنگ لیے ہوئے ہے۔ تابش صمدانی سے ملتے جلتے کرداروں سے ملتے ہیں۔ جو احباب حفیظ خان کی سرائیکی کہانیوں سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ حفیظ خان کے ہاں ''عورت'' کا مقام کیا ہے اور وہ کس قدر فیمنسٹ (Feminist) ہے ''جواب آں غزل'' ایسا ہی ایک کالم ہے جس میں ''بس ہوسٹس'' کو موضوع بنا کر انہوں نے مردحامی معاشرے پر گرفت کی ہے۔

حفیظ خان ''ولی دکنی کی قبر'' کی تباہی پر نوحہ کناں ہیں۔ ویسے یہ سوچنے کی بات ہے کہ ہندو فسطائی ٹولہ ہندوستان میں ولی دکنی کی قبر مسمار کر کے، گجرات کے کالجوں میں مخلوط تعلیم پر پابندی لگا کر ہندوازم کا احیاء کرتا ہے اور پاکستان میں طالبان خیبر ایجنسی میں 100 سالہ قدیم مزار کو گرا کر اور بچیوں کی تعلیم پر پابندی لگا کر احیائے اسلام کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ اختلاف کے باوجود افعال واعمال میں کتنی مماثلت ہوتی ہے۔

''اس شہر خرابی میں'' دنیا کی تصویر شکستہ، غم زدہ، محزون، مضمحل، تناؤ زدہ سی ہے۔ یہ تصویر حقیقت نگاری پر مبنی ہے۔ آج ہمارا معاشرہ بدل چکا ہے۔ لمحہ موجود کا منظر زیادہ تکلیف دہ ہے، تاریکی بڑھ گئی ہے، مایوسی میں اضافہ ہوا ہے۔ خرابی شہر میں کمی نہیں، اضافہ ہوا ہے۔ میں ان کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔ انھوں نے اپنے کالموں کے مجموعے کا عنوان بالکل درست چنا کیونکہ:

اس شہر خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات، بڑی بات ہے پیارے

O

(روزنامہ ''خبریں'' ملتان، 3/اپریل 2009ء)

''اس شہرِ خرابی میں'' حفیظ خان کا اُجلا کردار

الیاس میراں پوری

اردو کالم نگاری اپنے دامن میں بہت سے موتیوں سے لبریز ہے۔ ایسے موتی جن کی چمک بہت سوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ اس میدان میں مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، چراغ حسن حسرت، مولانا ظفر علی خان، مولانا غلام رسول مہر، شورش کاشمیری، عبدالمجید سالک، مجید لاہوری، حمید نظامی...... اور اس قطار میں کتنے نام ہیں جنھوں نے اسے پیشے کی بجائے فریضہ گردانا اور جن کا نام آج بھی صحافت کی تاریخ میں درخشاں اور روشن تر ہے۔

کالم کی زندگی اگرچہ ایک دن ہوتی ہے لیکن یہ ایک دن میں بھی پوری زندگی کا نصب العین متعین کر سکتا ہے۔ یہ انسانیت سے عاری لولے لنگڑے معاشرے کو چلنے پھرنے کا سلیقہ اس ادا سے سکھاتا ہے کہ خوشحالی و شادابی اپنی پوری تمکنت اور رعنایت کے ساتھ وجود میں آ جاتی ہے۔ اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ...... ایک اچھا کالم نگار نہ صرف اپنے قاری کی رہنمائی کرتا ہے بلکہ وہ اپنے وطن عزیز کو ایک ایسا لائحہ عمل بھی دے سکتا ہے جس سے ملک کا مستقبل ضیاء بار ہوتا ہے۔

حفیظ خان کا خمیر نہ جانے کس مٹی سے اٹھایا گیا ہے کہ ادب کا وہ کونسا شعبہ ہے، جس میں اس نے اپنے وجود کا احساس نہ دلایا ہو۔ وہ کونسی صنف ادب ہے، جس میں اپنے فن کا لوہا نہ منوایا

ہو۔افسانے ہوں یا ڈرامے، شاعری ہو یا صحافت، کالم ہوں یا کمپیئرنگ، تنقید ہو یا تحقیق......سب میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔اس کے سر میں ہر کام کر گزرنے کا سودا سمایا ہوا ہے۔

حفیظ خان نے روزنامہ ''نوائے وقت'' میں ایک عرصہ تک ''بے ساختہ'' کے عنوان سے کالم لکھے۔ حال ہی میں ان کے کالموں کا انتخاب ''اس شہرِ خرابی میں'' منظر عام پر آیا ہے۔اس مجموعے میں 49 مختلف النوع کالم ہیں۔جن میں سیاسی، ادبی، معاشرتی و سماجی موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

''اس شہرخرابی میں'' گہری معنویت کی حامل کتاب ہے۔ اس شہر (شہر، جو سماج کے استعارے کے طور پر برتا گیا ہے) میں حفیظ خان نے جو محسوس کیا اور جو مشاہدہ کیا اسے صفحۂ قرطاس پر پوری صحافیانہ صداقت کے ساتھ رقم کر دیا ہے۔شہر کی خرابی کا رونا ہی رویا بلکہ اس کا حل بھی بتایا ہے۔ مسائل کی گتھی سلجھانے کی کوشش کی ہے۔مسائل کے انبوہ کو کم کرنے کی تراکیب بتائی ہیں۔حفیظ خان نے سماج کی بدلتی اقدار، اہلیت کی موت اور نااہلیت کی حیات افروز ترقی ، نئی تہذیبی صورت حال، انسان کا المیہ، کائنات کی وسعت میں فرد کی تنہائی، انسانی سماجی بے توقیری اور طبقاتی فرق کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ مجموعے کے دیباچے ''ہم کالم نگار اور کالم نگاری'' میں انھوں نے کالم نگاروں کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

> ''ہمارے ہاں کے کالم نگاروں میں عمومی طور پر وہ تمام ''خوبیاں'' پائی جاتی ہیں جو کسی بھی نوع کے ڈکٹیٹر کی ذات اور افعال میں ''خامیوں'' کے زمرے میں گنی جاتی ہیں۔ مثلاً کالم نگار بھی صرف اور صرف اپنے فرمائے یا لکھے کو ہی مستند سمجھتا ہے۔تصویر کا دوسرا رخ کیا ہے، اُسے دیکھنے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔اپنے سوا ہر کسی کو نالائق، ناقص العقل اور جاہل سمجھنا، اپنی رائے کو دوسروں پر تھوپنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا، اپنے گریبان میں جھانکنے کی کوئی گنجائش نہ رکھنا اور اپنے ذہن کے دروازے اس طرح مقفل کیے رکھنا کہ کوئی غیر جانبدارانہ خیال یا رائے وہاں در آنے ہی نہ پائے ہمارے ہاں کی کالم نویسی کا طرہ ءامتیاز رہے ہیں۔اسی طرح ہم کالم نگار اکثر اوقات اخباری ادارے کی نظریاتی (دراصل معاشی) پالیسی کی خوشامدانہ اتباع یا اپنی ذات میں بوجوہ

پالے ہوئے خبث اور تعصب (Bais) کی ترویج میں اس قدر آگے چلے جاتے ہیں
کہ کبھی کبھار گمان ہونے لگتا ہے کہ کہیں ہم وہ تو نہیں کہ جو کہا کرتے تھے کہ ''وہ کام
کیسے کریں جو ہمارے باپ دادا نے نہیں کیا تھا۔''

حفیظ خان چونکہ اس دھرتی کا بیٹا ہے۔ اس کا دکھ درد اور مسائل پر وسیع مشاہدہ ہے۔ اس لیے اپنے افسانوں اور ڈراموں کی طرح کالموں میں بھی وسیب کی محرومیوں کو موضوع بنایا ہے۔ حفیظ خان کا ناسٹیلجیا سے گہرا ربط ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے رفتگانِ ملتان کی یادنگاری بڑی عمدگی سے کی ہے۔ یہ کالم کہیں تو سیاست کا جامہ پہنے نظر آتے ہیں تو کہیں معاشرتی مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ کہیں، نئی تہذیب کا رونا رویا گیا ہے اور کہیں جامعاتی سیاست کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ ''اس شہرِ خرابی میں'' صرف کالموں کا انتخاب نہیں۔ کہیں تو اس میں آپ بیتی کا رنگ جھلکتا ہے، کہیں خاکہ نگاری نظر آتی ہے، کہیں انشائیہ نگاری کی گئی ہے اور کہیں علامت نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ ''بڑے دل والا آدمی'' دراصل یہ کالم خاکہ کے زمرے میں آتا ہے جو انھوں نے اپنے عزیز دوست نور احمد قریشی (جسے ''لالہ نور'' کہتے ہیں) کے بارے میں لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے یادوں کی مالا بنائی ہے۔ اس کے ساتھ گزرے شب و روز کو اس کمال مہارت سے بیان کیا ہے کہ اُنس والفت اور پیار و محبت میں گوندھے الفاظ کی ایک ایسی کہکشاں بن گئی ہے جو خان صاحب کے دل و دماغ کو معطر کیے رکھتی ہے۔
بہت عمدہ یادنگاری کی گئی ہے۔ آخری پیراگراف کس قدر اداسی طاری کر دیتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''چند روز کے بعد اسلام آباد میں اطلاع ملی کہ لالہ نور دِل کے ہاتھوں چل بسا، تدفین بھی ہوگئی اور یوں اُس کا چہرہ دیکھنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ اُسے گزرے ہوئے برسوں بیت گئے مگر میں اب تک سوچتا ہوں کہ شاید وہ نہیں چاہتا ہوگا کہ میں زندہ دِلی کو مردہ، آنکھوں میں مچلنے والی شرارتوں کو بے جان، مسکان کو منجمد اور قہقہوں کو پتھرایا ہوا دیکھوں۔ شاید وہ یہ بھی نہیں چاہتا ہوگا کہ میں اُسے کہہ سکوں کہ زندہ رہنے کے لیے ہمیشہ بڑا دِل نہیں رکھنا پڑتا، بڑھا ہوا دِل کبھی کبھی مار بھی دیتا ہے۔'' (''بڑے دل والا آدمی''۔ ص: 131)

حفیظ خان چونکہ تخلیق کار ہیں۔ اس لیے سسکتی انسانیت کے لیے ان کا دل ہر وقت پسیجتا رہتا

ہے۔ آنکھیں نم آلود رہتی ہیں۔ اور حساسیت اپنے پورے جوبن پر نظر آتی ہے۔ ان کے اندر کا ڈراما نگار انھیں کہیں اور نہیں جانے دیتا۔ وہ کالم لکھ رہے ہوں یا مضمون یا کچھ اور...... کسی نہ کسی شکل میں [illegible] نثر میں افسانوی رنگ ضرور ہوتا ہے۔ ان کے اندر کا افسانہ نگار دھیرے دھیرے باہر نکل آتا ہے۔

''مجھے اُن آنکھوں سے بھی خوف آتا ہے کہ جن کے آنسو موتی بن کر پلکوں پر جگمگاتے نہیں بلکہ تیزاب بن کر اندر ہی اندر رِستے اور دکھائی نہ دینے والے چھید کرتے رہتے ہیں۔ آنسوؤں کا خشک ہو جانا اور بات مگر آنسوؤں کا روک لیا جانا قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ یہ وہ اشک ہوتے ہیں جو جسم وجاں کی آگ بجھاتے نہیں بلکہ اور بھڑکائے چلے جاتے ہیں۔ بظاہر مضبوط دکھائی دینے والے لوگ اپنے آنسوؤں کو روک کر اپنا اندر کھوکھلا کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ باہر کی سج دھج تو برقرار ہے۔ اندر سے دیمک زدہ درخت بھی باہر سے اپنے تنے کی شان وشوکت پر نازاں ہو کر آندھیوں سے چھیڑ خوانی کے خواہاں ہوتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا۔'' (''وہ آنسو جو بہہ نہیں پاتے'' ص:20)

حفیظ خان کے کالموں کے بعض عنوانات بڑے دلچسپ اور یک مصرعی ہیں۔ مثلاً: ''آنسو جو بہہ نہیں پاتے، کیکوں حال سنڑاواں دل دا، ملنا، بچھڑنا، بچھڑ کر نہ ملنا، فرد کا حد سے گزر کے خدا ہو جانا، کسے وکیل کریں، ایک اور دریا کا سامنا......، عجیب مانوس اجنبی تھا'' وغیرہ اس کی شاندار مثالیں ہیں۔ وہ ان کالموں میں لگی لپٹی کے بغیر اپنی بات کہہ گئے ہیں۔ یہی تفرد حفیظ خان کو عہدِ حاضر کے دوسرے کالم نگاروں سے ممتاز و ممیز کرتا ہے۔

''اس شہرِ خرابی میں'' کالم نگاری میں اہم اضافہ ہے۔ کالم نگاری کی تاریخ لکھنے والا وسیع القلب مؤرخ اس اہم تصنیف کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا کیونکہ ہماری صحافتی تاریخ میں زمینی تاریخ تہذیب اور ثقافت اغلباً پہلی مرتبہ کالم نگاری کی صورت میں عیاں ہوئی ہے۔

O

(11 ستمبر 2009ء)

حفیظ خان بحیثیت نقاد

حفیظ خان دا تنقیدی شعور

خالد اقبال

حفیظ ہوراں داناں سرائیکی ادب دے انہاں اولیں نقش نگاراں، تخلیق کاراں وچ شامل ہے جہاں اپنی تخلیقی توانائی اتے خلوص دی سچائی نال اپنے کم دی اینجھی بنیاد رکھی ہے جو آون والیاں کیتے سنگ میل بن ویندی ہے۔

حفیظ خان ہوراں دی سرائیکی ادب وچ اول جان سنجان کہانی کار اتے ڈرامہ نگار دی ہے ''کچ دیاں ماڑیاں'' انہاں دے ولوں سرائیکی ڈرامیاں دی پہلی کتاب ہے جینکوں اکادمی ادبیات پاکستانی دی طرفوں ایوارڈ ڈتا گیا تے ''ویندی رت دی شام'' انہاں دے سرائیکی افسانیاں دا مجموعہ ہے تے ایندے تے وی انہاں کوں اکادمی ادبیات پاکستان دی طرفوں ایوارڈ عطا کیتا گیا۔

جدید سرائیکی ادب وچ ادبی صنف افسانہ، ڈرامہ دے علاوہ بالاں کیتے انہاں دے لکھیل سرائیکی ڈرامیاں دی کتاب ''ماماں جمال خان'' کوں پہلی کتاب دا اعزاز حاصل ہے اتے اینویں ای انہاں پاکستان ٹیلی ویژن کیتے پہلی سرائیکی ڈرامہ سیریل ''کوئی شہریں جنگل کوکدا'' لکھی ہے تے ایہ سبھے اعزازات انہاں دی کمٹمنٹ دا نتیجہ ہن۔ حفیظ خان اپنی دھرتی، اپنے وسیب، ایندی تہذیب ثقافت تاریخ اتے ایں وسیب دیاں سماجی قدراں، فکر و فلسفے، تحریکاں تے اتھ دے وسینکاں نال بہوں جڑے ہوئے ہن۔ انہاں دی ہیں جڑت اتے سچل سوچ نے ساکوں انہاں دی تنقیدی

بصیرت توں آ گاہ تھیون دا موقع ڈ تے۔ انہاں دے ولوں سرائیکی تنقید دیاں ڈوں کتاباں ''رفعت عباس کی سرائیکی شاعری۔ نوآبادیاتی خطوں کا نیا مکالمہ''، ''خرم بہاولپوری۔ شخصیت، فن اور منتخب سرائیکی کلام'' دے علاوہ انہاں دے پئے بہوں سارے تخلیقی تنقید دیاں رمزاں نال مڑھیے مضامین ایں گالہہ دی گواہی ہِن جو بلاشبہ ذہین تخلیق کار جے اپنیاں تخلیقی صلاحیتاں اتے عمیق مطالعے کوں بروئے کار گھن آوے تاں او تنقید دے باغ وچ خوشبو چنبیلی مہکا سکدے۔ حفیظ خان ہوراں متنوع تخلیقی صلاحیتاں رکھن دے نال نال وسیع مطالعہ رکھن والے شخص ہِن تے اناں دا مطالعہ محض وسیلہ شوق نئیں بلکہ انہاں اپنے تخلیقی وژن دی بنیاد اتے سرائیکی وسیب کوں ہک جدید تخلیقی تنقیدی شعور وی عطا کیتے۔ ایہ بہوں غیر معمولی واقعہ ہے جیندا اعتراف آون والے ڈینہاں وچ ضرور تھیسی کیوں جو حفیظ خاں ہوراں سرائیکی تنقید کوں ہک نویں طرز احساس اتے ادراک دان کیتے تے اینکوں اساں سرائیکی وسوں وسیب، تہذیب، ثقافت، اسطور تاریخ اتے ادب کوں نویں سروں ڈیکھن دی نویں دید (Gazz) دی آ کھ سگدے ہیں۔ حفیظ خاں ہوراں ایں نت نویں تخلیقی تنقیدی شعور کوں انگریزی یا وت اوندے الٹھے اردو ادب دے منگویں تنقیدی معیارات دی بجائے سرائیکی ادب، سماج، تاریخ، تہذیب، اسطور اتے ثقافت دی واہدوچوں آپ گولیئے ایہا وجہ ہے جو حفیظ خاں ہوراں کوں ایں صدی 2009ء وچ آون والے تنقید نگاراں دی صف وچ پہلے سرخیل تنقید نگار ہوون دا اعزاز حاصل تھیندا اپے جہاں سرائیکی تنقیدی معیارات اتے عملی و فکری تنقید دے نویں زاویے متعارف کرائن۔ جینویں جو او لکھدن:

> ''ہر عہد اپنے ساتھ تخلیق، تنقید اور تحقیق کے نئے اعتبار لے کر آتا ہے سرائیکی زبان اور تاریخ بھی اپنے احیا کے دور سے گزر رہی ہے نہ صرف وادی سندھ کے اس خطے کا نیا رخ دنیا کے سامنے اجاگر ہوا ہے بلکہ کلاسیک کی تفہیم نو بھی سامنے آ رہی ہے بابا فریدؒ کے اشلوک، شاہ شمس کے گنان سے لے کر خواجہ فریدؒ کی کافیوں تک گفتگو کا انداز بدل چکا ہے یہ ادبی، تحقیقی اور تنقیدی کام دراصل قوموں کی سیاسی اور سماجی بیداری کا غماز ہوتا ہے۔'' (1)

سرائیکی خطے وچ بہوں ساری لٹ مار اتے چڑھتل دے سبب ہر حوالے نال سرائیکی قومیت دی سُناخت دا گم تھی ونجن وی اہم ڈسدی ہے۔ سرائیکی ورثے دے گم تھی ونجن دیاں جڑاں پاڑاں وی پرچ پرچول کریندیاں حفیظ خان ہوراں آہدن:

''جئیں ویلے کوئی ادبی ورثہ ٹھیکرانہ راہسی تاں اوندے اتے کہیں وی قسم دی تول یا پرکھ دا کم کینویں توڑ چڑھسی۔ کیوں کہ ایں ویلے ساڈے کول جیڑھا وی سرائیکی زبان تے ادب دا معلوم ورثہ موجود ہے او سارے دا سارا اوں ویلے تخلیق تھیا جڈن ساڈے کول پہلے عربی، ول فارسی تے چھیکڑ وچ انگریزی زباں کوں ہک دے بعد ہئے آون والے حملہ آوراں نے اتھ ساڈے خطے وچ کجھ ایں طرحاں رائج کیتا کہ اوروز دیہاڑے دے عام ورتارے، محاورے، علامتاں اتے ثقافتی استعاریاں دے نال نال پکھی پکھروں، جانوراں تے درختاں دے ناں وی اپنے گھن آئے تاں ول بھلا تل وسیب دیاں قدیمی ادبی اصطلاحاواں کتھوں بچ سگدیاں۔'' (2)

حفیظ ہوراں دے خیالات توں اندازہ لایا ونج سگدے جواؤ کینویں سرائیکی ادب اتے ورثے کوں اپنے قومیتی تاریخی شعور دے چیتے وچوں دریافت کرن دی گالھہ کریندن۔ انہاں دی تنقید دی ہک خصوصیت اے وی ہے جو او پرائی بتھی تے مانگویں معیارات دی تنقید دے تصورات کوں رد کریندن تے آہدن۔

''تنقید داخلی ہووے یا خارجی، فکری ہووے یا میکانکی سائنسی ہووے یا غیر سائنسی، مارکسی ہووے یا اخلاقی، اردو ادب دے تنقیدی شعور وچ اے سارے سوال وی انگریزی ادب دی فہمید دی بنیاد نہ صرف اسارے گئے بلکہ براہ راست یورپی زباناں دے تنقیدی ورثے دے ارتقائی عمل دا نتیجہ ہن۔ سرائیکی ادب وچ تنقید دے مسئلے تے گالھہ کریندے ہوئے انہاں سوالاں کوں اپنے سامنے رکھناں ایں گالھوں وی ضروری ہا کہ پاکستان بنن توں بعد وی ساڈے سرکاری نصاب وچ وسیبی زباناں دی بجائے آنجھیاں زباناں کوں ذریعہ تعلیم بنایا گیا جنہاں دا تعلق نہ تاں اتھوں دے لوکاں دی ثقافتی اقدار نال ہا تے نہ فکری، سیاسی اتے معاشی رجحانات تے انہاں دے مسائل نال۔'' (3)

حفیظ خان رائج تصور تنقید دے محض شدید مخالف ای نئیں بلکہ اوایں رائج شدہ تنقید دے معیارات دی تقلید توں وہ گریز کریندن۔انہاں نے سرائیکی تنقید وچ ورتیجن والے پیمانیاں کوں سب توں پہلے رد کیتے جیندے پاروں ہن اختلافات دے باوجود نواں تنقیدی ذوق، مقامی رنگ دے نال میل نال اسر دا نسر دا پئے۔

دنیا دے سارے خطیاں وچ شاعری بارے ہمیش توں گالہہ مہاڑ تھیندی آندی ہے کہیں شاعری کو جذبات دے اظہار دا ناں ڈتے اتے کتھاہیں شاعری کوں شناخت، شعور ذات آکھیا گئے تے ایندے علاوہ وی بہوں کجھ، حفیظ خان ہوراں شاعری بالخصوص سرائیکی شاعری بارے کیا وژن رکھدن آؤ جلدے ہیں مکالمے دی میز تے:

''شاعری شاید ہمیشہ زندہ رہنے کی تمنا سے کونپلیں نکالتی ہے یہی وہ انسانی ہنر ہے جس کے سامنے فنا کو بار بار پسپا ہوتے دیکھا گیا۔اسی لیے تاریخ اور فلسفے سمیت دنیا کے تمام علوم شاعری میں منقلب ہوجانے کی خواہش سے دامن نہیں بچا سکے۔ دنیا کی بیشتر اقوام کی قدیم ترین جمالیات آج اپنی شاعری کے آئینے سے ہی منعکس ہے ہومر کا یونان ہو یا ورجل کا روم، ویاس جی کا بھارت ہو یا فردوسی کا ایران، شاعری کے حوالے سے ہی جدید دنیا میں معتبر ہیں۔ایک دلچسپ حقیقت، دنیا نے تاریخ سے زیادہ شاعری پر اعتبار کیا ہے اسی لیے شاعر کے جنم میں قومیں صدیوں تک انتظار کرتی رہیں ۔ وادی سندھ میں شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سچل سرمستؒ اور خواجہ غلام فریدؒ کا جنم صرف تاریخی واقعہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسا تاریخی عمل بھی ہے جس کے سہارے قومیں مزید صدیوں کا سفر طے کرجاتی ہیں۔'' (4)

حفیظ خان شاعری کوں تویں حیاتی دان کرن والی اکائی جاندن تے او سمجھدن جو شاعری کہیں قوم یا خطے دے تعلق کوں ماضی اتے مستقبل دے رشتے کوں جوڑیندی ہے۔انہاں دے نقطہ نظر موجب سرائیکی شاعری دی واہند بابا فریدؒ دے اشلوک توں گھن کرانہیں اجو کی جدید سرائیکی شاعری تئیں تہذیبی، ثقافتی، تاریخی اتے سیاسی تسلسل دے اظہار دا اتم وسیلہ بنی ہے تے اناں دے شاعری بارے تنقیدی نقطہ نظر توں ایہ سدھ پوندی ہے جو شاعری کہیں وی خطے یا قوم دے شعور کوں نہ صرف

واضح کریندی ہے بلکہ شاعری دے شعور وچوں نویں حیاتی وی جنم گھندی ہے۔
حفیظ خاں ہوراں دے تنقیدی تصور موجب اگر کوئی فن پارہ ہک مدتائیں اپنی تخلیقی تکر
پاروں ہے لوکائی دے چیتے توں نئیں وسردا تاں وت ایندا مطلب اے تھیا جو چیتے رہن والے فن
پارے کوں قبولیت دا درجہ تے معیاری مقام حاصل ہے۔ خرم بہاولپوری شخصیت فن اور منتخب سرائیکی
کلام اہنجھی تحقیقی تنقیدی کتاب ہے جیندے رائیں انہاں لوکائی دے چیتے وچ وسن والے گمنام شاعر
دی تفہیم نروئے انداز نال کیتی ہے ایہوای کہیں بےلوث دیانت دار تنقید نگار دا کم ہے جو او تخلیق دے
ابدی وصف تے گناں سودھا اونکوں متعارف کروائے اتے ایں تحقیقی تنقیدی زاویے پچھوں محرکات
بارے حفیظ خاں آہدن:

"کسی عظیم شاعر کے نئے جنم کی بات کرنا بظاہر اتنا آسان نہیں یہ ایسا ہے کہ ہم کہیں
کہ اب تک اس شاعر کی تفہیم کا مرحلہ پوری طرح طے ہی نہیں ہوسکا یا پھر یوں کہا
جائے کہ اس شاعر کی تفہیم کا ایک نیا در کھولنے چلے ہیں یہ بظاہر ایک بلند بانگ
دعویٰ ہے لیکن اگر کسی خطے کی زبان اور اس کی ادبی روایات کی توانائی کے لحاظ سے
بات کی جائے تو اسے ایک مخلصانہ کوشش کہا جائے گا۔ اسے ایک علمی و ثقافتی تسلسل
بھی کہا جا سکتا ہے جس کا پھیلاؤ ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ ہے بہرطور خرم
بہاولپوری کے ایک نئے جنم کی بات میں اس لیے کر رہا ہوں کہ مجھے ان کا چہرہ پہلے
سے روشن تر دکھائی دے رہا ہے اور وہ چہرہ ایسا نہیں ہے کہ جسے ہم نفسوں کو دکھایا نہ
جا سکے۔ ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شاعری کے منتخبات اور ان کے تراجم پیش
کرتے ہوئے میں ایک تحیر سے آشنا ہوا ہوں کہ جیسے ہمارے اجداد میں سے کوئی
بزرگ اپنی تصویر کے چوکھٹے سے نکل کر ہمارے سامنے چلنے پھرنے لگے اور اپنی
بھرپور توانائی اور خوشبو کے ساتھ دوبارہ ہماری زندگی میں رچ بس جائے۔" (5)

حفیظ خان دے ایں تنقیدی رویے توں ایہہ گالہ وی نشابر تھیندی ہے جو سچا تنقید نگار تے
کھوج کار ایں گالہہ دی ٹوہ وی لاوے جو کہیں تخلیق پارے دے بارے وچ قاری دا ذاتی تاثر کیا ہے
تے قاری آپ خود جیکر کہیں فن پارے کوں سینے وچ سانبھ سانبھ تے رکھدے تاں ایندا مطلب ہے جو

اوفن پارہ لوکائی دی حیاتی وچ ہندن کار ہے ڈوجھا ایہہ جو حفیظ خاں ہوریں کہیں فن پارے اتے فن کار بارے ایہہ جان وندی رکھدن جو وقت ویلھا خود وی تاں نقاد ہوندے جے وقت کہیں گناں والے فن پارے کوں نمیں وسریندا تاں وت دیانت دار نقاد اینجھی تخلیق دی محافظت ضرور کرے۔ ایں گالھ دا ثبوت خرم بہاول پوری بارے انہاں دی کاوش ہک نمائندہ مثال ہے۔ حفیظ خاں ہوراں سرائیکی تنقید کوں حادثاتی طور تے قبول نی کیتا بلکہ انہاں دا تنقیدی تحقیقی کم ایں گالھ دی سدھ ڈیندے جو انہاں سرائیکی ادب وچ تنقید کوں شعوری طور تے قبول کیتے ات پاروں انہاں دے تنقیدی رویے وچوں نویں نقش نشابر تھیندے ڈسدے پئین۔ حفیظ خاں ہوراں نے عملی تنقید دے نال نال نظری اتے فکری مباحث کوں اگتے ٹورئیے مثلاً

"کاش کہ ہماری تنقید میں غیر یقینی اور مبہم رویوں کی بجائے یقینی اور غیر مبہم اسلوب کو اپنایا جا سکے۔ اس کے واسطے ہمیں سماجی Taboos کے ساتھ ساتھ فکری قدغنوں سے بھی چھٹکارا پانا ہوگا۔ ایک بڑا شاعر، فکری مغالطوں استحصالی اداروں اور استعماری قوتوں سے بیک وقت نبرد آزما ہوتا ہے اگر کوئی نقاد اپنے قویٰ کو اس سطح پر نہیں لے جا سکتا تو اسے کسی نئے تفہیمی مغالطے کو جنم دینے کا حق بھی نہیں دیا جا سکتا۔"(6)

تنقید دا ایہہ وصف ہے او بے لاگ ہوندی ہے مگر اسلوب وچ پیچیدگی اوں ویلھے پیدا تھیندی ہے جڈاں شخصی اظہار اور فن پارہ بھوں اعلیٰ یا بھوں اوسط درجے دا ہووے اتے اوندی بیانیہ صورت اظہار سانگھے روح راضی نہ ہووے تاں اینجھی صورتحال "آئی صورتوں سچار ہون دا تقاضہ کریندی ہے حفیظ خاں ہوراں اینجھے تنقیدی رویاں اتے چوٹ کریندن۔ شاہد ایہ وی ہک وجہ ہووے جو او آپ ادبی منافقت دی وجہ توں تنقید دے میدان وچ آئن اتے کھلے گھیر نال ادبی مسائل و معاملات دی تفہیم کرن لگ پئین۔ کہیں وی تخلیق دی تفہیم بارے ادبی بغداریاں دا عمومی رویہ اے رہیے جو تخلیقی سطح اتے متاثر کرن والے فن پارے بارے بٹوایا و نجے ایہ دروہ جتھاں تخلیق کاراں دے تعصب کوں ظاہر کریندے اتھاں تنقید نگاراں دے قد کاٹھ وی چھوٹا کر ڈیندے۔ حفیظ خاں اپنیاں تخلیقی صلاحیتاں اتے تنقیدی رویاں وچ Sublime دی سطح تے کینویں آئن ایندی وجہ صاف ظاہر ہے جو انہاں دے تخلیقی اظہار وچ کجی کوئے نی تے او تعصب، منافقت اتے ڈوں حرف

پھیندن۔ ایتھے ادبی مُجاوراں کیتے میڈی ہک نظم ہے۔(7)

پڑھ تے کچے پکے اکھر
بن تے بیٹھن آپ مجاور
کوئی کہیں دا ہے دربان
کوئی کہیں دے مقبرے تے
یار ایہ تخت نشیناں
منصب داراں دے سب
اچے تھماں ولیئے دراں
جندریاں دے رکھوالے
جیکر تازہ ہیل گھلے وی
انہاں تیکر پجدی ناہیں

حفیظ خاں ہوراں دی عملی تنقید دا زاویہ ہن تک دے سرائیکی تنقد نگاراں توں انج ات پاروں وی ہے جو انہاں فن پارے اتے فنکار بارے تفہیمی پیمانیاں وچوں مستعار تنقید کوں نی ورتیا بلکہ انہاں تخلیق اتے فنکار دے رشتے رویے دی پھلپھوٹ وچوں تنقیدی اظہار دے نویں نقش نشابر کیتن انہاں دا تخلیقی تنقیدی اظہار سرائیکی سماج دے رشتے نال جڑیا ہویا ہے تے ایندیاں جڑاں تاریخ، تہذیب، ثقافت اتے اجماعی شعور یا نفسیات دے بنے اتے ٹردا ہویا ہک وڈی سطح اتے مکالمے دی میزا تے گھن آندے۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اپنی تہذیبی بازیافت کے ساتھ ہی نو آبادیاتی خطے میں ایک نیا مکالمہ بھی جنم لے چکا ہے سرائیکی خطے کی عمومی رواداری، امن اور محبت سے پھوٹنے والا یہ مکالمہ کسی تہذیبی ٹکراؤ، اشتعال، نفرت اور انتقام سے ماورا ایک ایسا فلسفہ ہے جو حملہ آوروں اور استعماریوں کو ان کے اپنے فراہم کردہ دستاویزی ثبوت کی روشنی میں ضمیر کے ایک بڑے کٹہرے میں کھینچ تو لایا ہے لیکن ایک نئی دنیا اور زندگی کے آغاز کے لیے، انہیں معاف کر دینے کا عندیہ بھی دے رہا ہے اور اب نو آبادیات

مسلط کرنے والی طاقتوں کو جان لینا چاہیے کہ نو آبادیوں نے ان کی زمانوں پر محیط فریب کاریوں کو بے نقاب کر دیا ہے ان کا بھرم بھی اس بات میں ہے کہ وہ تہذیبوں کے ٹکراؤ کے بجائے تہذیبوں کی بقا کی بات کریں کہ تنہائی اور دورافتادگی کے عذاب سے دوچار اقوام اب مکالمے کی میز پر ان کے سامنے ہیں۔" (8)

اتے درج کیتے گئے پیراگراف دا تخلیقی بیانیہ، تنقیدی شعور اتے وڈی سطح دا ایہ مکالمہ ہن تک دی سرائیکی، اردو تنقید وچ ناپید ہے۔ ایندی وجہ اے ہے جو حفیظ خان دے ایں تنقیدی شعور کوں ہن روشن زمانے دی تائید حاصل ہے۔ سرائیکی ادب وچ پرانی بتھی تنقید ہن تک کیوں توجہ حاصل نی کر سگی ایندی وجہ اے وی ہے جو ماضی دے ناقدین فن پاریاں دی سطحی تفہیم توں اگاں نی ودھیئے بلکہ مکھی اتے مکھی مار کے ادبی معاملات وچ بددیانتی کوں رواج ڈیندے رہ گئیں۔ حفیظ خان ہوراں تنقید دے مروجہ تصور تنقید کوں ایں طور چیلنج کیتے جو انہاں تخلیق فن پارے اتے تخلیق کار بارے مختلف محرکات، واقعات، فنی محاسن، سرائیکی زبان دے مزاج کوں دریافت کیتے اتے ادب وچوں سوال بنڑ دے مسائل کوں فکری سطح اتے گھن آتے مکالمے دے دعوت ڈتی ہے ایں طرحاں انہاں دا تنقیدی شعور عملی، نظری، فکری سانجھ جوڑیندا ہویا ادبی تے سیاسی سطح اتے مکالمے دی دعوت ڈیندے۔ کیوں جو ادب جیکر مسائل حیات دی عکاسی کریندے تاں تنقید حیاتی کوں نواں نرویا ڈیکھن چاہندی ہے۔ حفیظ خان ہوراں دا تنقیدی مزاج سرائیکی تاریخی تصور نقد نال گنڈھیل ہے کیونکہ انہاں دے تنقیدی مضامین وچ ادب دا مطالعہ، سرائیکی تہذیب دے حوالے نال کیتا گئے، ایں گالہہ دا ڈوجھا پکھ اے وی ہے جو ایں طرحاں ادب، سماج، تہذیب دے مطالعے دے نال نال سرائیکی وسیب دی نفسیات دے تجزیئے دی کوشش وی برابر ڈسیندی ہے۔

حفیظ خاں ہوراں جینویں ماضی دی ڈُدھڑ وچوں گم تھیندے شاعر خرم بہاولپوری ہوراں دی نو دریافت کیتی ہے انویں ای انہاں اجوکے عہد دے معتبر اتے جدید سرائیکی شاعر سئیں رفعت عباس دی شاعری بارے جتھاں فکری فنی پرکھ پرچول دا فریضہ انجام ڈتے اتے ایں طرحاں رفعت عباس شاعری اتے انہاں دے تخلیقی رویئے دی جان وندی دے نال نال مکالمے دا منڈھ بدھ گئے، حفیظ خاں ہوراں دا ایہہ مکالماتی انداز تنقید معاصر ہمسایہ علاقائی زباناں اتے اردو زبان وچ نویں

مزید داانواں طرز احساس ہے۔ رفعت عباس ہوراں دی شاعری بارے گالھ کریندے ہوئے انہاں دا
مزیدی مکالمہ ہک وسیع تناظر وچ ہدل ویندے۔

"میں سمجھتا ہوں رفعت عباس کی شاعری کا موضوعاتی مطالعہ اس وادی میں ہمارے
بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی اور ثقافتی تناظر کو سمجھنے میں مدد کر سکتا ہے یا پھر یہی وہ
موضوعات ہیں جو ہمارے رویوں کی تبدیلی کا باعث بن رہے ہیں شاعری اور اس کا
اعجاز۔ علاوہ ازیں اس شاعر نے اپنے شعری مذاق اور منطق کے ذریعے ایک ایسا
ثقافتی برتاؤ دریافت کیا ہے جس میں غاصب اور استعماری اقوام کے لیے تلخی اشتعال
یا جارحیت کا کوئی عنصر موجود نہیں بلکہ اپنی لوک حکمت اور شعری دانش کے ذریعے ایسا
مکالمہ وضع ہو گیا ہے جسے ہم مہذب دنیا کا مکالمہ قرار دے سکتے ہیں ضروری نہیں کہ
کوئی قوم خود ارادیت کا دفاع، عدم رواداری دہشت گردی اور خود کش حملوں کے
ذریعے ہی کرے۔ اس کے لیے عہد در عہد اپنی تہذیبی فراست کو بھی بروئے کار لایا
جا سکتا ہے یہی وہ انکشاف ہے جو رفعت عباس نے کیا ہے۔" (9)

حفیظ خان ہوراں اپنے تصور تنقید نال جینویں تخلیق اتے فن کار بارے جائزہ گھندن
اوندے نال نہ صرف جمالیاتی کجھ نمایاں تھیندے بلکہ سرائیکی تہذیبی، تاریخی، سماجیاتی، نفسیاتی تنقید
دے بہوں سارے گوشے وی اپنا واضح درشن ڈیون لگ پوندن جینویں جو انہاں دے تنقیدی رویے
دے مطالعے وچوں پس منظری تنقید (Contextual criticisum) دی پر چھانویں وی
ڈسدن کیوں جو او پس منظری معاشرتی اتے تاریخی وژن وچوں فن پارے اتے تخلیق کار دا ویورا
کریندن اتے بغور ڈیہدن جو فن کار اتے فن پارے اتے کیڑھے کیڑھے سماجی اتے تاریخی عوامل اثر
انداز تھیندے رہ گئین۔ اینویں انہاں دی تنقید وچوں Archetypal Approuch دی جھات
پیندی ہے جیندے ذریعے او اساطیر بارے الونیدن۔ اسلوبیاتی و ثقافتی تناظر وی انہاں دی تنقید دا
سرمایہ ہے۔ حفیظ خاں ہوراں دے تنقیدی رویے رجحان کوئی ہک نام نی ڈتا ونج سگدا۔ البتہ اے
ضرور آکھیا ونج سگدے جو انہاں دا تنقیدی وژن نویں سرائیکی تنقید دا ہک نواں منشور ہے۔

جینویں جو اساں جاندے ہیں جو تنقید نگار دا ایہہ فرض نبڑدے جو او فن پارے دی تہہ تک

پیچے اتے اپنے مطالعے دے زوراتے فن پارے وچوں اپنے ذہن دیاں مختلف پرتاں کوں پھرولے ونت تخلیق دے نمائندہ رجحانات کوں قارئین اتے ادب دے طالب علماں کیتے واضح کرے۔ایں تناظر وچ حفیظ خان ہوراں سرائیکی زبان دے نامور شاعر" ارشاد تونسوی...... زمیں زاد کی ہزیمت اور حرماں نصیبی کا نوحہ گر" اتے سرائیکی ادب دا دلچسپ عہد" جھیں تنقیدی ویورے وچ تخلیق اتے تخلیق کاراں دے رجحانات بخوبی جائزہ گھندن۔نمونے دے طور تے اقتباسات ملاحظہ ہوون۔

"ارشاد تونسوی نے شعوری طور پر صوفی شاعری کے ڈکشن اور روایتی استعاروں کو اپنی آزاد اور پابند، دونوں طرح کی نظموں میں، اپنے سے انداز میں سمو کر بات کرنے کا ڈھنگ اپنایا۔یہ وہ شاعری تھی کہ جس میں معاصر نقاد کو شاہ حسینؒ، بابا بلھے شاہؒ، خواجہ فریدؒ، سلطان باہوؒ، میاں محمد بخشؒ، حافظ برخوردارؒ حتیٰ کہ کبیر داس تک کا معنوی آہنگ جھانکتا ہوا نظر آیا اور اسے اس وقت سرائیکی کی کلاسیک شاعری کی تجدید اور فکری توسیع کا نام دے کر ارشاد تونسوی کی بے مثال پذیرائی کا باعث بنا دیا گیا۔اس رائے کے واسطے اس کی نظموں "ڈکھ ہے آپ" (ص 11)، "لوں لوں پیڑ کرے" (صفحہ 12)، "ڈس نہ آوے پاروں" (صفحہ 13)، میں ناہیں سب توں" (صفحہ 46)، "سلطان باہو دی ویل" (صفحہ 47)، "چیتر دا گاون" (صفحہ 48)، "رتاں بے پرواہ" (صفحہ 53)، "ویڑھے آ وس میرے" (صفحہ 57)، "47ء دی چھیکڑی نظم" (صفحہ 29)، "بھئے کبیرا داس" (صفحہ 70)، "بہہ کندھاں تے رووے" (صفحہ 71)، "پولیٹیکل ورکر" (صفحہ 76)، تے "تر یجھی دنیا دے لوک" (صفحہ 80) کو بنیاد بنایا گیا۔یہاں ملاحظہ کیجئے اس کی دو نظمیں کہ پہلی میں شاہ حسین کے استعاروں میں ایک ایسے حساس انسان کا درد بیان ہوا ہے کہ جس نے ستر کی دہائی میں خطے پر نازل ہونے والا آشوب سہا ہے جب کہ دوسری نظم میں یہی کرب بابا بلھے شاہ کی شعری علامات اور انداز سخن میں اس طرح سمویا ہے کہ عظیم صوفی روایات کو صدیوں کے سفر سے نکال کر خطے کے اس دکھ کو تکلم عطا کیا کہ جو ارشاد تونسوی کے عہد کا اجتماعی دکھ تھا۔" (10)

"صوفی فیض محمد دلچسپ نے آپڑیں قادرالکلامی کنوں کیہڑا کم ہے جیہڑھا نی گدا۔ طویل نظماں ہوون،، نعتاں یا منقبت ۔سی حرفی ہووے، کافی، ڈوہڑہ یا غزل ۔ گیت ہوون، رباعیاں ہوون یا ول مکالماتی نظماں اتے روحانی شخصیات دے قصیدے، اناں دی شاعری کیوں جو وسیبی لوکائی کیتے ہئی، ایں گالھوں اناں نے کہیں نفسیات دے ماہر طرحاں اناں موضوعات کوں آپڑیں شاعری وچ ورتیا جیڑھے عوامی تفریح تے مقصدیت دے نال نال ساڈے وس وسیب دی ریت روایت تے مذہبیات کوں وی نال گنڈھ کرائیں اگوہیں تھیندے ہن ۔ ہک معتوب تے ڈکھ نک وچ مبتلا کرڈتے گئے معاشرے وچ جیون دی سب توں وڈی رمز آپڑیں ڈکھ تے عذابیں تے مُسکن دا ہنر ہوندے۔ جیویں جوجنئیں ویلے ہندوستان وچ انگریزیں دی آمد توں بعد مقامی حکومتاں دی ترٹ بھج نال جیا جنت کیتے حیاتی عذاب بنی تاں نظیر اکبرآبادی جیا شاعر پیدا تھیا جئیں روٹی، ککڑیاں تے پیسے اتے طویل نظماں لکھ کرائیں آپڑیں عہد کوں زندہ، کرڈتا اوئیں ای فیض محمد دلچسپ نے آپڑیں مشہور نظماں "ڈوڈھ شریف" تے "کناری ڈھاندی ہئی" نال وسیب کوں آپڑیں ڈکھ تے غربت تے مسکن تے اوندا حقیقی تجزیہ کرن دا رستہ ڈکھایا ۔میڈے نزدیک اناں دیاں اے ڈوہائیں نظماں آپڑیں معنوی گہرائی تے سماجی تانے پیٹے کوں تجزیاتی اکھ نال ڈیکھن کیتے سرائیکی شعری ادب وچ آپڑیں مثال آپ ہن۔" (11)

حفیظ خان ہوراں دی تنقیدی بصیرت دا اے کمال ہے جو انہاں سرائیکی ادب کوں قومیتی شعور اتے شناخت دی سنجان بنائے اتے ایں حوالے نال انہاں تنقید برائے شعور دی گالھ اگاں ٹورتے سرائیکی ادبی عمل کوں تہذیبی، سیاسی، تاریخی سماجی ترقی دے عمل نال جوڑ ڈتے ۔ایں طرحاں حفیظ خان کا زاویہ تنقید عملی تے فائدے مند تقاضیاں توں انج تھی کرانہیں اعلیٰ مقصد بن ویندے ۔ حفیظ خان ہوراں دا تنقیدی بے غرض نقطہ نظر "مفادات کی لغت اور فریدفہمی کا مدعا" وچ کھل تے سامنے آندے:

"ماضی قریب میں علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کے افکار اور شخصیات کے ساتھ مختلف سیاسی اور غیر سیاسی حکومتوں نے جو حسب منشاء سلوک کیا ہے اس سے

اس نقطہ کی تشریح بہتر طور پر کی جا سکتی ہے کہ عسکری اور سیاسی آمروں نے کس طرح ان کی انقلابی اور ہمہ جہت شخصیات پر تقدیس کی چھتری تان کر ان کے چاہنے والوں پر آزاد تفہیم کے تمام دروازے بند کر کے ان کے افکار کو اپنی خواہشات کے سانچے میں اس طور ڈھالتے چلے گئے کہ تاریخ کے قاری کو وہ بیک وقت آمریت اور جمہوریت کے علمبردار دکھائی دیتے ہیں۔ وگرنہ اتنی سی بات کون نہیں جانتا کہ التفات کو عقیدت، عقیدت کو تقدیس اور تقدیس کو عقلی ممانعت کی سطح پر لے جانے سے ہی فکری تسلسل اور تغیر کے دروازے بند اور تفہیمی مغالطے پیدا ہوتے ہیں۔

''سرائیکی خطے اور زبان کے عظیم شاعر خواجہ غلام فرید کا معاملہ بھی تفہیمی سطح پر ''ہنرمندوں'' کے اس رویے سے محفوظ نہیں رہ سکا کیونکہ ان کی شخصیت، منصب اور افکار کی بوقلمونی نے ہی انہیں اس قدر ہمہ جہت بنا دیا کہ ان کی ذات کے مذکور تین مضبوط ستونوں پر کسی بھی شکل کی عمارت استوار کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ فکر فرید ہی کی بنیاد پر ان کی شخصیت کے ظاہر اور منصب کے تقدس کو ڈھال بنا کر اپنے اپنے مفادات کی لغت مرتب کی گئی اور خواجہ صاحب کے عظیم کلام کی بلاغت اور معنوی محاسن کو متذکرہ لغت کے پس منظر اور فرید فہمی کی آڑ میں نہ صرف اس کے حقیقی ابلاغ سے محروم کر دیا گیا بلکہ ان کے قاری پر وہ تمام راہیں مسدود کر دی گئیں کہ جن کے ذریعے فکر فرید کی روح تک پہنچا جا سکتا تھا۔'' (12)

حفیظ خان تنقید اتے تحسین کوں ہکے کوزے وچ نی بند کریندے اور رسمی تنقیدی تصورات توں ہٹ کرانہیں اپنا فرض ادا کریندے پئن اتے نویں خیالات تے نویں اسلوب تنقید کوں متعارف کرویندے پئین ہک کھرے تنقید نگار دی حیثیت نال او تخلیق دے اصل جوہر دی حقیقت تیئں ہجن دا پورا پورا ترلا کریندن اتے ایندے وچ انہاں خاطر خواہ کامیابی اتے انج سنجان وی ملی ہے۔ انہاں متعین شدہ قدراں دا وت ولا نویں سروں تجزیہ اتے تشریحاتی مطالعے کیتے اور انہاں دا تجزیاتی، تشریحاتی تقابلی انداز تنقید، تحقیق دے نال وی رلواں ہے جیندی بھرویں مثال ''خطہ ملتان سرائیکی مرثیہ گوئی'' تاریخ کے آئینے میں'' وچ واضح ہے۔

''بیں مورخین کی اس رائے سے بھی متفق نہیں کہ ملتان میں مرثیہ خوانی یا عزاداری کا آغاز تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں اس وقت ہوا جب فاطمین مصر کے داعی سندھ سے ہوتے ہوئے ملتان پہنچے اور اس شہر کو اپنا مسکن بنایا۔ اسی طرح اس رائے کو بھی تسلیم کرنے کی کوئی عقلی وجہ نہیں ہے کہ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں بغداد پر منگولوں کی ہلاکت خیز یلغار کے بعد کچھ سادات خاندان ملتان میں آ کر پناہ گزین ہوئے اور مرثیہ گوئی اور عزاداری کی بنیاد رکھی۔ کیونکہ تاریخی حوالوں کے تعین کے لیے جہاں برسوں کا فاصلہ بھی توجیہہ طلب ہوتا ہے وہاں صدیوں کے فاصلوں کو'' تیسری اور چوتھی صدی'' یا'' چھٹی اور ساتویں صدی'' کے طور پر لینا، کسی طور بھی تاریخ نویسی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اس امر واقع سے اختلاف کیے بغیر کہ حملہ آوروں کے متعین تعصبات اور تاریخ کو اپنی خواہشات کے اعتبار سے مسخ کرنے کے عمل میں'' حقائق'' کی بجائے'' قیاس'' زیادہ اہمیت اختیار کر لیتے ہیں، مگر تاریخ کے معاملات میں قیاس آرائی کے لیے بھی تاریخی واقعات کے اسباب و علل، بہاؤ اور اثرات کا پیش نظر رکھا جانا ازبس ضروری ہوتا ہے۔'' (13)

حفیظ خان ہوراں دا مجموعی تنقیدی نقطہ نظر معروضی اتے غیر ذاتی ہوون دے نال نال سرائیکی قومیتی شعور دے مکھ مہاندرے کوں نواں درشن ڈیندا ڈسدے تے او فکری ازادی دے قائل ہن تاں جو مکالمہ، بھانویں اپنے آپ نال ہووے، ہک خطے وچ رل وسن والیاں ہمسایہ زباناں دے وسنیکاں نال ہووے یا ادبی، تہذیبی ثقافتی سیاسی حوالے نال ڈوجھیاں اقوام دے نال، بہر طور ضروری ہے۔

میکوں امید ہے جو حفیظ خاں ہوراں دی آون والے ڈینہاں وچ چھپیل تنقیدی مضامین دی کتاب'' افکار و جہات'' دے چھپن نال سرائیکی تنقید دا مکھ نویں درشن ڈیسی اتے سرائیکی تنقیدی کیتے نواں چشمہ ثابت تھیسی۔ ان شاء اللہ۔

O

(''سرائیکی تنقیدی شعور'' ص 95، نومبر 2009ء)

حوالے

(1) حفیظ خان، ''خرم بہاول پوری شخصیت، فن اور منتخب سرائیکی کلام'' بہاول پور، سرائیکی ادبی مجلس، 2007ء، ص 14:

(2) حفیظ خان، دیباچہ، ''سرائیکی ادب وچ تنقید دا مسئلہ''، مشمولہ: جدید سرائیکی شاعری تے اجوکا بندہ، مصنف محمد ممتاز خان، ملتان، جھوک پبلشرز 2007ء، ص:9

(3) حفیظ خان، دیباچہ، ''سرائیکی ادب وچ تنقید دا مسئلہ''، مشمولہ: جدید سرائیکی شاعری تے اجوکا بندہ، مصنف محمد ممتاز خان، ملتان، جھوک پبلشرز 2007ء، ص:13

(4) حفیظ خان، مکالمے کی میز پر، ''رفعت عباس کی سرائیکی شاعری''، ملتان، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، 2006، ص:9

(5) حفیظ خان، فلیپ، ''خرم بہاول پوری شخصیت فن اور منتخب سرائیکی کلام''، بہاول پور، سرائیکی ادبی مجلس، 2007ء، بیک ٹائٹل

(6) حفیظ خان، مکالمے کی میز پر، ''رفعت عباس کی سرائیکی شاعری''، ملتان، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، 2006، ص:14,13

(7) خالد اقبال، نظم، ''کویلی دی کاوڑ''، ملتان، جھوک پبلشرز، 2004ء، ص:23

(8) حفیظ خان، فلیپ، ''رفعت عباس کی سرائیکی شاعری''، بیک ٹائٹل

(9) حفیظ خان، مکالمے کی میز پر، ''رفعت عباس کی سرائیکی شاعری''، ص:12

(10) حفیظ خان، مضمون ''ارشاد تونسوی: زمین زاد کی ہزیمت اور حرماں نصیبی کا نوحہ گر''۔ ''سرائیکی ادب افکار وجہات''، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ

(11) حفیظ خان، پیش لفظ، ''سرائیکی ادب دا دلچسپ عہد''، دیوان فیض محمد دلچسپ، جھوک پبلشرز، ملتان

(12) حفیظ خان، مضمون ''مفادات کی لغت اور فرید فہمی کا مدعا'' از ''سرائیکی ادب افکار وجہات'' ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ

(13) حفیظ خان، مضمون، ''خطہ ملتان سرائیکی مرثیہ گوئی تاریخ کے آئینے میں'' از ''سرائیکی ادب افکار وجہات'' ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ

خرم بہاولپوری: فن و شخصیت

شعری قوتِ نمو سے زندہ شاعر پہ اوّلیں تحقیق

محبوب تابش

ہم ایسی دنیا میں بس رہے ہیں جہاں ہر لمحہ راز افشانی کا تسلسل ٹوٹنے نہیں پاتا۔ یوں عناصر مخفی طشت از بام ہوتے رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انسان کے زندہ رہنے کا عمل غیر شعوری رہا ہے لیکن اس سب کے باوجود ہم اشیاء کو اپنی علمی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ فنون کے متعلق حتمی رائے دینا کبھی بھی دانش مندی کے قریب نہیں رہا۔ اگر بات فنون سے وابستہ شخصیات اور ان کی زندگیوں کی تحقیق سے متعلق ہو تو یقیناً اس بارے کھوج کار ایک معیاری علمی دریافت تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

کسی بھی تخلیق کار کی باردگر بازیافت ایک طرف تو عجیب ہے لیکن دوسری جانب یہ تجربہ خوشگوار حیرانی کے ساتھ پورا ہوتا ہے۔ یہی دعویٰ حفیظ خان کی تحقیقی کتاب ''خرم بہاولپوری: شخصیت فن اور منتخب سرائیکی کلام'' کے مطلق اتنا ہی درست ہے جتنا یہ الفاظ رقم کرتے ہوئے قلم ذقرطاس کا باہمی رشتہ۔ حفیظ خان گزشتہ تین چار دہائیوں سے مسلسل سرائیکی ادب کو اپنے جواہر ریزوں سے مالا مال کرنے میں مگن ہیں۔ ان کی حالیہ تحقیقی کتاب انیسویں و بیسویں صدی کے ایک بلند قامت شاعر خرم بہاولپوری کی شخصیت،، شاعری اور فن سے متعلق ہے۔ خرم بہاولپوری اپنی منفرد حیثیت کے ساتھ واحد

ایسا شاعر ہے کہ اس نے جو کچھ سرائیکی غزل اور کافی کے پیرائے میں جس طرح سے اپنے محسوسات کو انیسویں اور بیسویں صدی میں ڈھالا، قاری آج اکیسویں صدی میں اسے پڑھ رہا ہے۔

حفیظ خان نے نہ صرف خرم بہاولپوری کی غزل کھوج نکالی بلکہ اس میں مقامی اثر و لب و لہجہ کو جس طرح اپنی تنقیدی نگاہ سے ہم تک پہنچایا یہ اپنی جگہ ایک بڑی کاوش ہے۔ اسے جس قدر سراہا جائے کم ہوگا۔ ایک صدی بعد خرم کی غزل کو نئے سرے سے دریافت کر کے اسے صحیح متن اور لطیف اردو ترجمہ کے ساتھ کتابی صورت میں مدون کر کے شائع کرنا بجا طور پر کسی بے جان پیکر میں روح ڈال دینے کے مترادف ہے۔ حفیظ خان خرم بہاولپوری کے اس دفینہ کے متعلق کتاب میں یوں رقم طراز کرتے ہیں کہ ”خرم بہاولپور کی غزل کو قاری سے چھپا کر رکھنے کی کوشش میں ایک صدی کیوں صرف کردی گئی لیکن ہوا کیا۔ یہ سعی، پھر بھی لاحاصل ہی رہی۔ جب کہ خرم کی غزل کسی آفتاب کی مانند حلقہ گرہن سے آزاد ہو کر پھر سے جہان ادب پر ضوفشاں ہو چکی ہے“۔

جس شاعر لازوال کو مولانا ظفر علی خان، سر عبدالقادر، مولوی عزیز الرحمٰن اور دیگر مشاہیر ادب نے صرف مرصع و مسجع القابات سے نوازنے پر اکتفا کیے رکھا، پہلی بار حفیظ خان کے قلم و کاوش سے ہم اُن کی مکمل شاعرانہ فکر سے آگاہی حاصل کر رہے ہیں۔ تغافل اور عدم توجہی کی گرد میں دب کر رہ جانے والے اس شاعر کی تخلیقات اپنی قوت نمو کے سہارے مدفونیت کے باوجود زندہ رہیں۔ حفیظ خان نے جس جزوی اختصار کے ساتھ ان کا شعری و فکری نقشہ باندھا وہ اپنی مثال ہے۔ محقق کا یہ عمل اس عہد ناپرساں کے خود پرست اور مفادات کی غلامی میں جکڑے محققین و نقادانِ ادب کو دعوت فکر دیتا ہے کہ حقیقی اور زندہ کام ہمیشہ صلے و ستائش کی تمنا سے بالکل بے نیاز ہوتا ہے۔

کسی بھی کھوج کار کی تخلیق تب ہی قابل اعتبار اور درست مانی جا سکتی ہے جب وہ پوری ایمانداری کے ساتھ اس سفر میں متقدمین کے کام کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی تحقیق کی بنیاد کو ترمیم کی سائنسی تبدیلی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ مذکورہ کتاب میں ہمیں یہ بات پورے احساس کے ساتھ ملتی ہے۔ محقق کا یہ اعتراف ہمیں سچائی کے دوسرے کنارے تک پہنچنے میں بڑی آسانی فراہم کرتا ہے۔ وہ شعری سرمایہ جس کے متعلق شاعر کی زندگی میں گمشدگی کے ناقوس بج چکے ہوں، محقق کی عرق ریزی

دیکھئے کہ آج جب اس شاعر کو عدم سدھارے 56 برس بیت گئے ہیں لیکن وہ سب کا سب علمی و شعری
متاع گم گشتہ موجود عہد کے لوگوں کے سپرد کر کے سرائیکی زبان وادب کو تہذیبی توانائی فراہم کی ہے اور
اس سب پر طرہ یہ کہ حفیظ خان نے نہ صرف وہ سارا کلام کھوج نکالا جواب قارئین کی رسائی اور نظروں
سے بہت دور تھا بلکہ اس کتاب میں 75 صفحات پر پھیلی ہوئی خرم بہاولپوری کی جو فکری اساس اس طور
پر سامنے آئی ہے اس میں انھوں نے بطور نقاد خرم کی تفہیم نو اور فکری و شعری اہمیت پہ جو محاکمہ پیش کیا
ہے یقیناً وہ اپنی جگہ لائق تحسین ہے۔اس نقد کے بعد پہلی مرتبہ قارئین خرم اس منفرد اچھوتی حقیقت
سے بہرہ یاب ہوں گے کہ شاہ عبداللطیف سے خواجہ فرید تک کے تمام صوفیاء بھی جب کسی نہ کسی صورت
اشرافیہ کے قصائد لکھ رہے تھے، مختصر یہ کہ اصول، مفادات کی سولی پہ لٹکائے جارہے تھے اور متاثرین
انہی کے تتبع میں محو کلام نظر آتے ہیں۔ایسی صورتحال میں فطری انسانی مزاج میں کلام کرنے والا شاعر
گمنامی کے اندھیروں میں ڈوب کر رہ جاتا ہے۔لیکن خرم بہاولپوری نے خود کو زندہ اور باضمیر انسان
کے طور پر دریافت کر کے جو سخن تراشے ان کی پرت در پرت چھپی شکلیں پہلی بار حفیظ خان کے اس نقد
میں دیکھی جاسکتی ہیں۔اگرچہ حفیظ خان کی یہ عرق ریزی اور محنت کسی بھی صورت اپنی اہمیت کے لحاظ
سے نظرانداز نہیں کی جاسکتی لیکن غزل کے ضمن میں ان کی تحقیق سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔وہ کتاب
کے صفحہ نمبر 65 پر لکھتے ہیں کہ ''خرم صاحب کے پہلے سرائیکی غزل گو شاعر ہونے پر کسی کو معترض نہیں
ہونا چاہیے کیونکہ ان سے قبل تو سرائیکی میں غزل کا وجود ہی ناپیدرہا ہے''۔

جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ دریائے سندھ کے غربی کنارے آباد غازی خان میرانی
کے شہر ڈیرہ غازیخان میں قاضی راضی کے دیوان میں جو ''دیوانِ قاضی راضی'' کے نام سے چھپ چکا
،غزلیں موجود ہیں۔اس تحقیقی وتنقیدی کام میں حفیظ خان کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نہایت
مہارت سے کلام خرم کا اردو زبان میں رواں، سلیس وسہل ترجمہ کر کے اس کو ملک بھر کے لوگوں سے ہم
کلام وہ روشناس کرادیا۔اگرچہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ شاعری کا ترجمہ نہیں ہو پاتا لیکن کلام خرم
کا ترجمہ پڑھتے ہوئے مترجم ہمیں کہیں پر بھی احساس نہیں ہونے دیتا کہ ترجمے میں شعر کی روح
غائب ہورہی ہے۔کئی جگہوں پر ترجمہ پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ مترجم پورے تہذیبی شعور کے

ساتھ شعروں کا لسانی روپ بدلتا نظر آتا ہے۔

سرائیکی شعر و ادب کے طالب علموں اور آئندہ وقتوں میں خرم بہاولپوری کے فکری نظام، شخصیت اور شاعری پر کام کرنے والے تمام قافلوں کو ہر صورت اس شاہراہ سے گزرنا ہوگا کیونکہ ان کے کام نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دوسرا کوئی بھی راستہ اندھیروں کی کال کوٹھڑیوں میں روشنی تلاش کرنے کے مترادف ہوگا۔

O

(روزنامہ ''خبریں'' ملتان، 13 اپریل 2007ء)

رفعت عباس کی سرائیکی شاعری

تہذیبی بازیافت کے جواہر ریزے

ڈاکٹر مختار ظفر

کتابوں کے مصنف اور ادب وشاعری کے خلاق تو اہم ہوتے ہیں کہ ان کی فکر ونظر ایسے نئے رنگ تراشتی ہے جو نوع انسانی کی مسرت وشادمانی، دکھ اور کرب سے نجات، زندگی کی صداقتوں کے ادراک اور رہنمائی ودستگیری کا باعث بنتے ہیں مگر وہ شارحین اور ناقدین بھی کم اہم نہیں ہوتے جو ان تخلیقات کی تفہیم وتعبیر کی نئی جہتیں تلاشتے اور نئے گوشوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ غالبیات کی تفہیم، شاعر کے اپنے زمانے اور اس سے متصل بعد کے دور میں ایک خاص دائرہ فکر میں محصور رہی لیکن ''الہلال'' میں شائع کردہ ان کے ایک غیر مطبوعہ قصیدے کے آغاز میں ابوالکلام آزاد کے تعارفی نوٹ نے تفہیم غالب کی نئی سمتوں کے جو سراغ دیئے اس سے غالب شناسی کے نئے گل وگلزار کھل گئے۔ یہی قصیدہ 1970ء کے ''صحیفہ'' میں دوبارہ طبع ہوا اور اس پر صحیفہ کی طرف سے جو فٹ نوٹ تھا اس میں انہی نو بہ نو مفاہیم کے در کھلنے کے سلسلے میں ابوالکلام کے خیالات کا اعتراف کیا گیا تھا۔

خواجہ غلام فریدؒ کی شعری نغمگی کے سحر سے کون مسحور نہیں لیکن اس کی تفہیم کے جو پہلو علامہ طالوت کے 99 صفحات کے اس مقدمہ (مطبوعہ بہ دیوان فرید 1944ء) نے روشن کیے، وہی بعد

میں فریدیات پر کام کرنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔

اصل میں تشریح اور توضیح کار کا اپنا وژن ہوتا ہے جس میں سلسلہ روز و شب کے وہ حقائق اور پہلو جن سے تشریح نگار خود تجرباتی یا مشاہداتی طور پر گزرتا ہے، بھی اس کی تفہیم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ توضیح کار کا دائرہ نظر جس قدر بڑا ہوگا، تخلیق کے ایسے پہلو بھی سامنے آسکتے ہیں جو ممکن ہے اس کے خلاق کے شعور میں نہ ہوں لیکن تخلیق کار کی خوش قسمتی ہوتی ہے جب اسے اپنے جیسا یا بڑے وژن کا نقاد اور توضیح کار میسر آجائے۔

رفعت عباس کی شعری جدت اور ہنر مندی کا اپنا رنگ اور معیار ہے لیکن یہ خوش بختی ضرور ہے کہ اسے حفیظ خان جیسا شارح میسر آ گیا جس کا ذہنی نیوکلیئس ویسا ہی ہے جیسا کہ رفعت عباس کا اپنا۔ یعنی حفیظ خان کا وژنری نیوکلیئس بھی خطے کی تہذیب، تاریخی بازیافت، لوک دانش سے لگن اور استعمار جس کا دائرہ وسیع و عمیق ہے، کے خلاف اسی شدید ردعمل سے تشکیل ہوا ہے جس نے رفعت عباس کو فکری و شعری طور پر متحرک کیا تھا۔ لہذا ان کی جانچ پرکھ کی سمت بھی اندر سے باہر کی طرف ہے۔ شاید اسی وجہ سے انہیں اپنے فکری اور تجزیاتی نتائج کی صحت پر یہ دعویٰ بھی ہے کہ میری تنقید یا تجزیہ شک وشبہ کی معمولی سی گرد سے بھی ماورئ ہے اور میں نے رفعت سے 20 سالہ رفاقت کے باوجود ایک غیر جانبدار نقاد کا کردار ادا کیا ہے۔ یہیں پر ''مقابلہ انیس ودبیر'' میں حفیظ خان کے اپنے موقف کے مطابق مولانا شبلی نعمانی کی تنقیدی دیانت کو تشکیک اور ان کی ''جانبداری'' کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے اپنی دیانت کا دعویٰ ان کی خود اعتمادی کا مظہر ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تخلیق نگار اور تشریح کار دونوں ایک ہی زمانہ اور ایک ہی خطے میں سانس لے رہے ہیں جب کہ باہمی ذہنی مماثلت کی بات پہلے ہو چکی ہے۔

زیر نظر کتاب میں رفعت عباس کے پانچوں شعری مجموعوں (پڑچھیاں اتے پھل، جھومری جھم ٹرے، بھونڈی بھوئیں تے، سنگت وید، پروبھرے ہک شہر اچوں) پر ایسا توضیحی تبصرہ کیا ہے جس پر بظاہر توصیفی رنگ کا گمان ہوتا ہے لیکن حفیظ خان نے دلائل و براہین اور دیگر نقادین کی آراء سے اپنے موقف کی تصویب کی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے اردو زبان میں تحریر کی ہے اور کتابوں کے عنوانات اور

حوالے کے اشعار کا ترجمہ بھی دیا ہے تا کہ رفعت کے قارئین کا حلقہ وسیع ہو سکے اور ان کی شاعری پاکستانی ثقافتوں اور عالمی تہذیبوں سے ہم آواز ہو سکے۔صرف یہی نہیں بلکہ عالم اس شاعری کے قریب آ سکے۔اور اس ضمن میں انھوں نے بڑی محنت اور جگر کاوی سے کام لیا ہے۔اپنے اس تبصرے میں انھوں نے رفعت کی شاعری کا محاکمہ کرنے والوں کی آراء سے جہاں اپنے موقف کو تقویت دی ہے وہاں ان کے ان خیالات کا موثر دلائل کے ساتھ محاکمہ بلامحاسبہ بھی کیا ہے جن میں اس شاعری پر گرفت کی گئی ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے یہی احساس ابھرتا ہے کہ رفعت نے خطے کی تہذیبی بازیافت، کے ساتھ نوآبادیاتی خطے کی جو طرح ڈالی ہے وہ حفیظ خان کی اپنی روح کا مکالمہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زیرِ نظر شاعری کی دوررس جہتوں کے تعین میں جزئیات تک کو بھی شامل کیا ہے۔ذیل میں ان کے تبصرے اور تنقید کا اجمالی جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

"چٹائیوں پر پھول بنانے کا ہنر" (پڑچھیاں اتے پھل) شاعر کا پہلا غزلیہ مجموعہ ہے اور اس نے صنف غزل کو سرائیکی شاعری کا ایسا باقاعدہ ذریعہ بنا دیا ہے جس میں دھرتی بولتی ہے۔اس غزل میں گو دونوں روایتی رنگ جھلکتے ہیں، ذاتی اور اجتماعی یعنی غم جاناں اور غم دوراں لیکن استعارے غیر رسمی ہیں اور دھرتی سے جڑے ہوئے اور حسن فطرت کے غماز ہیں مثلاً۔

اج تاں کوئی مسیت منارے اینویں لگن رفعت
جیویں کہیں نے انگلیاں چاتے ،جھمر پاتی ہووے

(رفعت! آج کسی مسجد کے مینارے یوں لگ رہے ہیں جیسے کسی نے انگلیاں اوپر اٹھا کے جھمر ڈالی ہو)

حفیظ خان کا خیال ہے کہ اس تخلیق میں وادی سندھ کے قدیم باشندے نے وہ قوت گویائی حاصل کی ہے جو آگے چل کر بڑے مکالمے کی بنیاد بنی کیونکہ اس مجموعے کا پس منظر و پیش منظر اور فکری سکیم یہاں کی لوک دانش کی اولین تفہیم اور رفعت عباس کی فکری اقلیم کی بنیاد ہیں۔

"زمین زاد کی حکمت نو" (سنگت وید مطبوعہ 1997ء) یعنی Wisdom of

Friendship بے نام ونشان لوگوں کی مدح ہے۔اسے تشریح کار نے عوامی دانش کا پرتو اور مقہور کی زبان سے مظلوم کی مناجات کہا ہے۔معروف پنجابی شاعر پروفیسر شارب انصاری نے اسے "پنجواں وید" قرار دیا ہے۔برصغیر میں پہلے چار وید تخلیق ہوئے تھے اوران میں سے "رگ وید" وادی سندھ کی حد تک نہیں بلکہ موجود دنیا میں اوستا کے بعد وجود میں آنے والی دوسری کتاب ہے۔"رگ وید" کو آریاؤں اور دراوڑوں کے تصادم سے جنم لینے والا ایک رزمیہ بھی کہا گیا ہے۔اس کے منتر اوراشلوک بنیادی طور پر دیوتاؤں کی توصیف میں کہے گئے آریاؤں کے نیم مذہبی اور نیم ادبی بھجن ہیں۔نیز یہ دراوڑوں کی داستان محکومی بھی ہے اوراجتماعی دانش کی عکاس بھی۔

یہاں تشریح کار نے "رگ وید" کی فلسفیانہ وسعت،عہد حاضر میں اس کے تسلسل اوراس کی ساختیات پر سیر حاصل بحث کی ہے اوراس کے ڈانڈے سرائیکی شاعری میں تلاش کیے ہیں جن کی وجہ سے سرائیکی شاعری کو مقامی زبانوں کی معاصر شاعری کی نسبت زیادہ وقار ملا ہے۔صاحب تصنیف نے "رگ وید" کے موضوعات کا بھی اجمالی جائزہ لیا ہے اوراس کے ذریعہ ان تاریخی عوامل کے ساتھ اس خاص زمانے کو جاننے کی کوشش کی ہے جس میں نوع انسان نے ایک جغرافیائی خطے میں اپنے مختلف رویوں کی جبلی بنیادوں پر آنے والے زمانوں کی شعوری یا غیر شعوری پرورش کی۔یہی عوامل "سنگت وید" میں Historical awareness کی بنیاد بنے ہیں۔یہاں انھوں نے ہندوستان کے قدیم باشندوں (دراوڑوں) کو وادی سندھ میں تلاش کیا ہے۔یہ مقامی باشندے جو کئی گروہوں میں بٹ گئے تھے آج بھی خانہ بدوشوں،مور،کیہل،کٹانوں اور داس کی شکل میں موجود ہیں۔حرماں نصیبی کے باوجود یہ باشندے آج بھی دھرتی کے عشق میں گرفتار اور استعمار کے مزاحم کار ہیں۔یہی عشق یا مزاحمت تخلیقی بالیدگی اور تاریخی تسلسل کا استعارہ بن کر جدید سرائیکی شاعری میں ایک نئی آواز بنی ہے اور یہی اس خطے کا نیا مکالمہ ہے۔مبصر نے یہاں رفعت عباس کے علاوہ دیگر شعراء اور ادباء کی ایسی آوازوں کا بھی جائزہ پیش کیا ہے۔

"سنگت وید" میں دیوتاؤں کو سنگت یعنی دوستوں سے Replace کیا گیا ہے۔اس سنگت میں اشولال،نادیہ،طاہرہ،رفیق (ڈاکٹر رفیق احمد سندھی فقیر) اور شبیر حسن اختر مرحوم شامل ہیں۔

سنگت وید میں بھی منتر ہیں جو دیوتاؤں کی خوشنودی میں نہیں بلکہ سنگت کے ساتھ جڑے ہوئے اپنوں کے لیے کہے گئے ہیں اور ان کو دیئے گئے دشناموں کا جواب عام آدمی کی مدح کی صورت میں دیا گیا ''سنگت وید'' کی شاعری کے بارے میں پروفیسر شارب انصاری کا خیال ہے کہ ''اس کا سارا سفر عرفان ذات کا سفر ہے جو تاریخ اور جغرافیے کے حوالے سے آگے بڑھ رہا ہے۔شاعر دوران سفر وید کے وقت میں سے گزر رہا ہے اور گزرتے گزرتے اپنے وجود کو پھلانگ کر (موجودہ وقت میں) باہر نکل آتا ہے اور یوں زبان ومکاں کی قیود سے ماورئی ہوجاتا ہے۔اس کی شاعری کا جغرافیہ اور تاریخ، ہڑپہ، وادی سون، ٹیکسلا اور پانچوں دریاؤں کی وسعتوں میں پھیلا ہوا ہے اور وقت کے گہرے سمندروں میں سے اپنی اس طور بازیافت کر رہا ہے کہ اس کے پاؤں پتھر کے زمانے میں اور ہاتھوں کی انگلیاں اکیسویں صدی کو چھو رہی ہیں۔

تشریح نگار نے یہاں رامائن اور مہابھارت کا بھی ایک مختصر تعارف دیا ہے کیونکہ ان کے مطابق اس خطے کے ماضی اور حال کے فکری وثقافتی اور پاکستانی زبانوں بالخصوص سندھی، سرائیکی اور پنجابی کی گہرائی اور گیرائی کو سمجھنے کے لیے اس کا جاننا ضروری ہے۔ان کے مطابق سنگت وید کی شعری روح اس خواہش سے عبارت ہے کہ دنیا میں مصائب، دکھ اور درماندگی کی شکار قوموں کو آزادی کی جملہ نعمتوں کے ساتھ اپنی مرضی سے زندہ رہنے کا موقع ملنا چاہیے۔

پانچویں کتاب ''دورافتادہ شہروں کا مکاشفہ'' (پروبھرے ہک شہراچوں مطبوعہ 2002ء) یعنی From a Remote City ایک طویل نظم ہے۔اس میں جو کتھا بیان کی گئی ہے وہ پروبھرے، پورب واس اور پربھوں کے شہر کی کتھا ہے۔اس کتھا کا بنیادی محور، ایک خاص دور میں ایک ساتھ سانس لیتے ہوئے کئی شہروں کی تن بیتی ہے۔دس ابواب کی اس نظم میں ہر باب کا عنوان، ہندسوں کی صورت میں دیا گیا ہے پھر ہر باب کے تین حصے ہیں جو چھوٹے بڑے کئی مزید Episodes پر مشتمل ہیں۔نظم کے ہر باب میں تخلیق نگار نے شہر کو نئی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔اس کے نزدیک شہر نت نئے روپ بدل کر سامنے آتے ہیں۔کبھی تہذیب وتمدن کی ارتقائی شکل میں، کبھی بنتی بگڑتی روایات کے سنگ، کبھی ان چھوئی دوشیزہ کے رنگ، کبھی زندگی کے تسلسل کی صورت، کبھی حملہ آوروں کے

خلاف مزاحمت کی شکل میں، کبھی اپنے باطن سے ابھرتی سازش کا مہرہ، یوں شہر Bilogical Unit بن کر سامنے آرہے ہیں جو دراصل یہ مشرقی خطہ ہے جسے مغربی استعمار نے صدیوں کی ریشہ دوانیوں سے، پسماندگی کے قعر میں دھکیل دیا اس کے باوجود یہ خطہ اور یہ وسوں اپنے تہذیبی و ثقافتی ورثے کی بنیادوں پر مزاحمت اور اپنی گمشدہ شناخت کو بازیاب کرنے کا عزم کیے ہوئے ہے۔ استعمار کے خلاف یہ مزاحمت انگریزی عہد تک محدود نہیں بلکہ آریاؤں تک پھیلی ہوئی ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ ایک شاہکار نظم ہے جس کے بارے میں شمیم قریشی کا خیال ہے کہ شاعر نے اس نظم کا ''اہر'' کر کے سرائیکی نظم کو ایک نیا اور اگوان اضافہ عطا کیا ہے......اور آنے والے وقت میں یہ سرائیکی نظم کی Pioneer نظم بنتی دکھائی دیتی ہے۔ حفیظ خان کا خیال ہے کہ سرائیکی شاعری کے پس منظر میں اس طرح کے لحن اور اسلوب کی پہلے کوئی مثال نہیں جب کہ صابر چشتی کا کہنا ہے کہ یہ کسی بڑے تصادم سے جنم لینے والی رزمیہ نظم ہے اور یہ دعویٰ بھی کہ ماضی قریب میں گزرے پچاس سالوں میں عالمی ادب میں بھی اس سطح کی نظم کا کوئی تجربہ سامنے نہیں آیا۔ یہ دعویٰ حقیقت ہے یا مبالغہ؟ اس کا فیصلہ عالمی ادب کے مطالعہ کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے جیسا کہ صابر چشتی نے کیا ہوگا۔

بہر حال حفیظ خان نے رفعت کی شاعری کا غائر نظر سے موضوعاتی مطالعہ کر کے ایک گہرے ادراک کے ساتھ اس کی توضیح کی ہے جو بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی اور ثقافتی تناظر کو سمجھنے میں مددگار ہوگی۔ کیونکہ ان کے مطابق عہد کی شعوری بازیافت رکھنے والے رفعت عباس جیسے بڑے شاعر کے ظہور کے ساتھ ایک نیا مکالمہ وجود میں آ گیا ہے جو آج کے استعمار سے کہہ رہا ہے کہ آؤ تہذیبوں کے ٹکراؤ کے بجائے ان کی بقاء کی بات کریں۔

O

(روزنامہ ''خبریں'' ملتان، 16 فروری 2007ء)

''سرائیکی ادب، افکار و جہات''

جاوید اختر بھٹی

حفیظ خان اردو اور سرائیکی کے معروف افسانہ نگار، شاعر، محقق اور نقاد ہیں۔ ان کی بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ مسلسل لکھ رہے ہیں اور ان کی چند کتابیں زیر طبع ہیں۔ ان کے کام کی تفصیل ایک الگ مضمون کا تقاضا کرتی ہے۔ حال ہی میں ان کی کتاب ''سرائیکی ادب، افکار و جہات'' شائع ہوئی اور یہ سات مضامین پر مشتمل ہے۔

(1) خطۂ ملتان، سرائیکی مرثیہ گوئی کی تاریخ کے آئینے میں
(2) مفادات کی لغت اور فرید فہمی کا مدعا
(3) سرائیکی ادب میں ترقی پسندانہ عناصر
(4) خرم بہاول پوری: ایک بھلا دیا گیا شاعر
(5) نقوی احمد پوری: وسیب کے عہدِ جدید میں مزاحمتی شاعری کا معمار
(6) ارشاد تونسوی: زمیں زاد کی ہزیمت اور حرماں نصیبی کا نوحہ گر
(7) تنویر سحر: ہجرتوں کے خوف اور وسیبی مزاحمتوں کا شاعر

حفیظ خان سرائیکی ادب کے بارے میں اردو میں لکھ کر دراصل سرائیکی زبان کا حلقہ وسیع کر رہے ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معیاری سرائیکی ادب کو باوقار انداز میں متعارف کرا رہے ہیں۔ سرائیکی میں لکھنے کا رجحان اب بہت بڑھ گیا ہے لیکن اس کے بارے میں بہت کم لکھا جا رہا ہے اور اگر

لکھا جاتا ہے تو اس میں غصہ ہوتا ہے یا ردِّعمل میں لکھا جا رہا ہے۔ یعنی مزاحمت طبیعت کا حصہ بن گئی ہے لیکن حفیظ خان نے ہمیشہ بہتر انداز اختیار کیا ہے۔ ان کے مضامین اخبارات و رسائل میں اکثر شائع ہوتے رہے۔ زیرِ نظر کتاب کے دیباچے (طرزِ کہن) میں وہ لکھتے ہیں:

''میں نے شعوری طور پر یہ کوشش بھی کی کہ اُن موضوعات پر بات کی جائے جن پر کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا یا اُن دانشوروں کی فکر تک رسائی حاصل کی جائے کہ جنہیں زمانے نے اُن کی تمام تر دانش اور قادر الکلامی کے باوجود اُن کے طبعی وجود کو درگور کرتے ہی انہیں حافظے سے مٹا دیا۔''

خواجہ فرید کے بارے میں حفیظ خان لکھتے ہیں:

''خواجہ فرید جیسے عظیم شاعر کے کلام کے رموز کو اصحابِ دانش کی محفلوں میں زیرِ بحث ہونے کی بجائے محض ''قلم قوالوں'' کی دسترس میں دیکھ کر میں نے بھی ایک عرصے تک محض کڑھنے پر ہی اکتفا کیا۔''

مزید لکھتے ہیں:

''اس مجاورانہ اسٹیبلشمنٹ کے ردِّعمل کے مقابل اس کی وقعت ہی کیا ہوگی۔ کیونکہ لگی بندھی روش سے ہٹ کر جو بھی کہا جائے گا اسے مفادات کے کوڑا دان کی نذر کر دیا جائے گا۔ مگر یہ محض میرا واہمہ تھا۔''

اور اس کے ساتھ ان کا نہایت قابلِ توجہ مضمون سامنے آتا ہے اور یہ مضمون ہے ''مفادات کی لغت اور فرید فہمی کا مدعا''

خرم بہاول پوری، نقوی احمد پوری، ارشاد تونسوی اور تنویر سحر ایسے شاعر ہیں جن کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے اور خرم بہاول پوری کے ساتھ تو بہت ناانصافی ہوئی ہے۔ حفیظ خان نے ان کے کلام کو مرتب کیا ہے اور پہلی بار انھیں بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔

نقوی احمد پوری اور ارشاد تونسوی کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے کہ جن کی وجہ سے جدید سرائیکی شاعری کو فروغ ملا لیکن انھیں نظر انداز کیا گیا۔ ان دونوں شاعروں پر حفیظ خان نے تفصیلی مضمون لکھے۔ تنویر سحر اردو اور سرائیکی کے شاعر ہیں۔ وہ احمد پور شرقیہ میں قیام پذیر ہیں۔ ان کو متعارف کرایا گیا۔ حفیظ خان نے سرائیکی ادب کی خدمت نہایت خلوص کے ساتھ کی ہے اور وہ ہمہ وقت اس میں مصروف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرائیکی کے ادبی حلقوں میں انھیں احترام حاصل ہے۔

O

(سہ ماہی ''الزبیر''، بہاول پور، ص 210,211 شمارہ نمبر 4، 2009ء)

انٹرویوز

ریڈیو پاکستان ملتان کا حفیظ خان

احمد کبیر شاہ

''دیمک زدہ''عنوان دیکھ کر میں چونکا اور جلدی جلدی افسانہ پڑھنا شروع کیا۔اتنی مکمل اور برجستہ تحریر تھی اور انداز تحریر میں جرأت و بے باکی اور جذبوں کا اتنا واضح اظہار تھا کہ مصنف کے دوسرے افسانوں کی تلاش شروع ہوئی اور مختلف جرائد ورسائل میں اس کی لکھی ہوئی تحریریں،''آٹے کی عورت''،''آشنا زخم''اور''بندیا''وغیرہ پڑھیں۔

تاہم تحریر پڑھنے کے بعد یوں لگا جیسے یہ سب کچھ تو میرے ذہن میں تھا۔میرے دل میں تھا اور اسے میں نے ہی لکھا ہے۔ان تحریروں میں معاشرے کے ان تاریک پہلوؤں کو کھنگالا گیا تھا جو انسان کے اندر کی زندگی پر حاوی ہوتے ہیں لیکن ان کا اظہار کبھی کھلم کھلا نہیں ہوسکتا پھر بھی وہ ہر انسان کی تہہ در تہہ خولوں میں مخفی سوچوں کی آواز ہوتے ہیں۔

میں حیرت زدہ تھا اس شخص کی ہمت پر کہ جس نے بڑی بیباکی سے ان سوچوں کو الفاظ کا روپ دیا تھا اور وہ تھا''حفیظ خان''۔میں ان سے ملنا چاہتا تھا اس لیے کہ دیکھوں،اتنی توانائی اور بھرپور تحریر والا شخص کیسی شخصیت کا حامل ہے۔مگر میں نہ جانتا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے،؟کون ہے؟ کیسا ہے؟ یہ ناآشنائی کی دیواریں تھیں جو میرے اور اس کے درمیان حائل تھیں اب ذرا اندازہ کیجئے میری حیرت کا

جب ایک دن برسبیل تذکرہ مجھ پر یہ انکشاف ہوا وہ'' حفیظ خان'' جس کی تحریروں کی کاٹ نے مجھے ان کی تلاش پر مجبور کر دیا تھا ریڈیو پاکستان ملتان کا اناؤنسر اور کمپیئر ہے۔ جس کے کئی ڈرامے ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ جس کے ساتھ بیٹھ کر میں نے بارہا چائے پی ہے۔ گپیں لگائی ہیں۔ مگر نہ کبھی اس نے مجھے اپنی شخصیت کے اس پہلو سے متعارف کرایا اور نہ میرے ذہن نے اس گوشے تک رسائی حاصل کی۔ اب جبکہ میں اس خودنمائی سے دور بھاگنے والے شخص کو پہچاننے لگا ہوں تو کیوں نہ یوں کریں کہ وہ ہم سے باتیں کرے اور ہم اس کی باتیں سنیں!

'' لکھنا لکھانا تو لڑکپن ہی سے میرا مشغلہ رہا تھا مگر باقاعدگی سے اردو جرائد میں میری تحریریں 1973ء میں چھپنا شروع ہوئیں اور ان دوادوار کے دوران وہ طویل ذہنی ارتقاء تھا۔ جس نے میری سوچ کو وسعت اور فکر کو بالیدگی دی۔ کائنات کے اس گوشے کو جسے ہم دنیا کہتے ہیں۔ محسوسات کی بینائی سے دیکھنا شروع کیا اور اپنے احساس کو تحریری کی صورت کاغذ پر منتقل کرنے لگا۔ میرے نزدیک لکھنے والے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ تصورات اور مابعد انسانی جذبوں کی رونمائی کی جائے۔ وہ وہی کچھ لکھے جو اس کے اردگرد ہے جو اس کے اندر کا انسان محسوس کرتا ہے۔ تاریکیوں کی جس دلدل نے اجلی انسانیت کو گدلا رکھا ہے اسے قلم کی نوک سے نکھارے اور اگر اس خوبی کو ذمہ داری کہیں تو یہ نوجوان نسل پر زیادہ عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنی چبھتی ہوئی سوچ سے معاشرے پر جمی ہوئی غلیظ و کثیف روایتوں کی میل کھرچیں اور میں نے مقدور بھر اس کی کوشش کی ہے۔ چاہے میرے افسانے ہوں یا ریڈیائی ڈرامے ہر ایک میں معاشرتی برائیوں اور بے جا گھٹن کو جس میں ہم سب محبوس ہیں۔ ان کو کھنگالنے کی پوری سعی کی ہے۔ جن سامعین نے میرے ریڈیو کے ڈرامے ''ڈوں ڈونگریں ہک''، '' پیلے پتراں دی بہار''، ''ریشم دی کلہی تند'' سنے ہیں وہ میری ان کوششوں کا بہتر طور پر اندازہ کر سکتے ہیں۔

''ہاں تو بات یہ بھی ہونی چاہیے کہ میں نے ریڈیو جوائن کیسے کیا؟ یہاں میں یہ تو نہ کہوں گا کہ مجھے بچپن سے ہی ریڈیو پر بولنے کا شوق تھا۔ ایسی بات ہرگز نہ تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ ریڈیو ملتان کا پروگرام ''سر دسحر'' 1973ء میں بھی اتنا ہی مقبول تھا جتنا کہ آج۔ اس پروگرام میں خطوں کے جواب

کا سلسلہ شروع ہوا اور شرط یہ ٹھہری کہ صرف دلچسپ ترین خطوط کو پروگرام میں نشر کیا جائے گا۔ میں نے خط لکھا اور وہ پروگرام میں خاصے اہتمام سے نشر ہوا۔ بس پھر کیا تھا پھر تو با قاعدہ خطوط کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس دوران ملتان آنا جانا رہتا تھا۔ لہٰذا قمر حسین صاحب (پروڈیوسر سر دو سحر) سے بھی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ انھوں نے مجھے اناؤنسر کے لیے آڈیشن دینے کا مشورہ دیا۔ اتفاقاً انہی دنوں اناؤنس منٹ کے لیے نہیں مگر ڈرامہ کے لیے آڈیشن ہو رہے تھے۔ میں نے ڈرامہ بولنے کا آڈیشن دیا۔ کچھ دنوں بعد مجھے گھر ایک خط موصول ہوا جس میں میرے آڈیشن کے حوالے سے یہ بات کہی گئی تھی کہ کارپوریشن فی الحال آپ کی خدمات حاصل کرنے سے معذرت خواہ ہے۔ یہی وہ ناکامی تھی جس نے میرے ذہن میں ایک ضد کی سی کیفیت پیدا کر دی کہ چاہے کچھ ہو جائے مجھے ریڈیو پر بولنا ہے۔

فروری 1975ء میں قمر حسین صاحب سے پھر ملا۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ یہاں تو آرٹسٹوں کی بھرمار ہے گنجائش مشکل ہو سکتی ہے آپ ریڈیو بہاولپور پر ٹرائی کریں جو جون میں اپنی نشریات کا آغاز کر رہا ہے۔ ان دنوں میں بسلسلہ تعلیم بہاولپور میں مقیم تھا۔ بس پھر کیا تھا کالج آتے جاتے سرکلر روڈ سے گزرتا تو ان انجینئرز سے یہ ضرور پوچھتا جاتا کہ مشینری کی تنصیب کا کام کب مکمل ہو رہا ہے جو وہاں بڑی تیزی سے اسپورٹس ہیڈ کوارٹر کی عمارت کو ریڈیو پاکستان بہاولپور میں تبدیل کر رہے تھے۔

16 جون 1975ء جنرل آڈیشن کی تاریخ مقرر ہوئی مگر وہاں تو لوگوں کا ایک جم غفیر تھا جو اپنی آواز کے امتحان کے لیے جمع تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کا مجمع، ریڈیو والوں سے سنبھل نہیں رہا تھا۔ خیر 19 جون تک ابتدائی آڈیشن ہوتے رہے اور مجھ سمیت تقریباً پینتالیس آوازوں کو فائنل آڈیشن کے لیے بلایا گیا۔

21 جون 1975ء کو ریڈیو بہاولپور کی نشریات کے لیے جو پندرہ آوازیں منتخب ہوئیں ان میری آواز بھی شامل تھی۔ ۲۳ جون سے ۳۰ جون تک الطاف قریشی صاحب (جو اس وقت بہاولپور ریڈیو کے پروگرام منیجر تھے) روزانہ شام کو ہماری کلاس لیتے اور ریڈیو کے رموز سے آشنا کرتے۔ میرے ساتھ کامیاب ہونیوالوں میں اجمل ملک، ماجد خان، عبدالرحمٰن، شہزادی فوزیہ، مسرت

کلانچوی، ثمینہ شانزادہ، شعیب احمد اور انجم گیلانی شامل تھیں۔

نومبر 1976ء تک میں ریڈیو بہاولپور سے منسلک رہا جہاں سے میں نے سرائیکی اناؤنسمنٹ، پروگرام اور فیچرز میں حصہ لینے کے علاوہ ڈسک جوکی پروگرام فارم فورم اور بچوں کے پروگرام ''لشکار'' کے لیے خاصی تعداد میں فیچرز لکھے۔ بہاولپور میں ریڈیو کی زندگی کے آغاز میں جن لوگوں نے مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا ان میں سلمان المعظم اور اکرم شاد خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

میری ریڈیو کی زندگی کا دوسرا دور وہ ہے جو میں نے ریڈیو ملتان سے شروع کیا۔ ہوا یوں کہ کچھ ذاتی امور کے سلسلے میں مستقلاً ملتان منتقل ہونا پڑا۔ اس دوران ریڈیو کی حلاوت رگ و پے میں ایسے گھر کر چکی تھی کہ ریڈیو سے دور نہ رہ سکا۔ یہاں آنے کے بعد میں سرائیکی پروگراموں کے پروڈیوسروں، فخر بلوچ، ملک عزیز الرحمٰن اور نذیر بلوچ سے ملا۔ فخر صاحب نے مجھے بچوں کے لیے ایک ڈرامہ لکھنے کو کہا۔ میں نے لکھ کر دیا جو انھوں نے بھی پسند کیا اور بچوں میں بھی خاصا مقبول ہوا۔

اس کے بعد نذیر بلوچ صاحب نے جو ''عورتاں دی محفل'' کے پروڈیوسر تھے مجھے، خواتین کے معاشرتی مسائل کے بارے میں فیچرز لکھنے کو کہا، ان میں ''منیوا''، ''رکھڑے پندھ''، ''ٹنگل پیسہ'' اور ''ایویں وی تھیندا ہوندے'' خاص طور پر میری پہچان بنے اور بے حد مقبول ہوئے۔ فروری 77ء میں سرائیکی اناؤنسر کے طور پر بھی میری آواز ریڈیو ملتان سے سنائی دینے لگی۔ سرائیکی نشریات میں پندرہ روزہ پروگرام ''ہک رنگ'' اور ''ساڈی دھرتی ساڈے گیت'' جو میں نے باقاعدگی سے کمپیئر کیے ہیں اور ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ سامعین کے لیے اچھی سے اچھی باتیں نئے سے نئے انداز میں سامنے لاؤں کیونکہ انفرادیت اور جدت ہی وہ دو خوبیاں ہیں جو اگر کسی پروگرام میں ہوں تو وہ شہرت کے مدارج طے کرتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ''ہک رنگ'' کی مقبولیت میں ان دونوں باتوں کا بہت حصہ تھا۔

ریڈیو ملتان سے وابستگی کے دوران جن پروڈیوسرز کے پرخلوص تعاون نے میری صلاحیتیں (اگر کوئی ہیں) اجاگر کیں، ان میں فخر بلوچ، ملک عزیز الرحمٰن اور نذیر بلوچ ہیں جن کے تعاون کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ خاص طور پر ڈرامہ نگاری میں بطور ڈرامہ پروڈیوسر کے فخر بلوچ کے ساتھ کام

کرکے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور میری رائے میں کسی ڈرامے کی کامیابی کے لیے مصنف، پروڈیوسر اور فنکاروں کی ذہنی ہم آہنگی بہت ضروری ہے۔ فن میرے نزدیک فنکار کی منزل ہے جس کے راستے میں بیکراں فاصلے بے پناہ صعوبتیں، مشکلیں ہی مشکلیں ہیں۔ فنکار کے لیے منزل پر پہنچنا تو درکنار اگر نشانِ منزل کی جھلک دیکھنی بھی نصیب ہو جائے تو وہی معراج ہے۔

بحیثیت انسان کے مجھ میں بھی دو کمزوریاں اور ہیں اور وہ ہیں ریڈیو اور مطالعہ۔ مطالعہ چاہے نصابی ہو یا غیر نصابی دونوں میری تنہائی کے رفیق ہوتے ہیں۔ ساتھی فنکاروں میں جنھوں نے مجھے اپنی ذات اور فن سے متاثر کیا۔ وہ قیصر نقوی اور تسنیم انصاری ہیں۔

ٹیلی ویژن کے فنکاروں میں طلعت حسین، بدیع الزمان، انور سجاد، فرزانہ صدیقی، شجاعت ہاشمی اور روحی بانو پسندیدہ ہیں۔

O

(پندرہ روزہ ''آہنگ'' کراچی، یکم سے 15 مارچ 1979ء)

حفیظ خان ''خبریں'' کے روبرو

انٹرویو: صابر چشتی

حفیظ خان کا نام سرائیکی اور اردو ادب کے حوالے سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے افسانوی، ڈرامائی اور بچوں کے ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ گزشتہ 30 برس سے اپنے تخلیقی تسلسل کی بدولت وہ اس خطے کے ادبی تناظر کا ایک معتبر حوالہ بن چکے ہیں۔ حفیظ خان نے 3 اکتوبر 1956ء کو احمد پور شرقیہ کے ایک علمی وادبی گھرانے میں امان اللہ خان کے ہاں جنم لیا۔ زمانہ طالب علمی سے ہی کہانی لکھنے کا شوق ہوا۔ ملتان میں قانون کی تعلیم کے حصول کے دوران ریڈیو سے بطور صداکار منسلک ہو گئے۔ 1981ء میں ریڈیو پروڈیوسر منتخب ہوئے۔ ریڈیو سے ان کا تعلق والہانہ اور تخلیقی توانائیوں سے بھرپور رہا۔ 1985ء سے باقاعدہ شعبہ قانون سے وابستہ ہو گئے۔ ریڈیائی ڈراموں پر مشتمل ان کی پہلی کتاب ''کچ دیاں ماڑیاں'' 1989ء میں شائع ہوئی جبکہ افسانوی مجموعہ ''ویندی رت دی شام'' 1990ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ دونوں کتابوں کو نہ صرف ادبی حلقوں میں بے پناہ پذیرائی حاصل ہوئی بلکہ اکادمی ادبیات اسلام آباد کی طرف سے مصنف کو ان کتب پر ''خواجہ فرید ایوارڈ'' سے بھی نوازا گیا۔ 1990ء میں ہی ان بچوں کے ریڈیائی ڈراموں کی کتاب ''ماما جمال خان'' چھپ کر سامنے آئی۔ اس تصنیف کو سرائیکی میں بچوں

پہلی طبع شدہ کتاب کا اعزاز حاصل ہے۔2003ء میں بچوں کے ڈراموں کی ایک اور
کتاب ''خواب گلاب'' سامنے آئی۔ریڈیو ملتان کے جشن تمثیل ایوارڈ'' اور پی ٹی وی لاہور کے
Best Play Write Award 2003 کے ذریعے ڈرامے سے متعلق ان کی تخلیقی صلاحیتوں
کا اعتراف کیا گیا۔سرائیکی کہانیوں کی کتاب ''اندر لیکھ دا سیک'' 2004ء میں طبع ہو کر مقبول
ہوئی۔پاکستان کی سیاسی تاریخ اور صورتحال کے حوالے سے ان کی کتاب ''اتفاق سے نفاق تک'' احمد
میزان کے قلمی نام سے 1993ء میں چھپی۔اردو کہانیاں ''یہ جو عورت ہے'' 1997ء اور شعری
مجموعہ ''پہلی شب تیرے جانے کے بعد'' 1999ء بھی ان کے تخلیقی تسلسل کا حصہ ہیں۔آج کل وہ اپنی
کہانیوں، ڈراموں اور تنقید و تحقیق کے ساتھ ساتھ ایک سرائیکی ناول پر بھی کام کر رہے ہیں۔حفیظ
خان طویل عرصے سے شعبہ قانون میں اہم مناصب پر فائض چلے آ رہے ہیں۔''خبریں'' نے ان سے
شخصی اور تخلیقی زندگی کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی جو نذر قارئین ہے۔

خبریں: جناب حفیظ خان صاحب! یہ بتائیں کہ آپ ادب سے کس طرح وابستہ ہوئے؟

حفیظ خان: ہمارے گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا۔والد صاحب تاریخ اور مذہب کی کتابیں پڑھا
کرتے تھے۔بچپن میں ہی ہمیں انھوں نے بچوں کے میگزین پڑھنے کو دیئے۔مجھے یاد ہے کہ
1967ء میں اخبار جہاں آیا تو اس کا پہلا شمارہ جو 60 پیسے کا تھا، میں نے خود خریدا۔بچوں کے میگزین
پڑھنے اور ان میں لکھنے سے ادب میں تھوڑی دلچسپی پیدا ہوئی۔میرے نانا جی کو بہت سی داستانیں یاد
تھیں۔مثلاً مومل میندھرا، سسی پنوں اور مرزا صاحباں۔وہ ہمیں اکثر رات کو یہ منظوم داستانیں سنایا
کرتے۔ایک قصہ کئی کئی راتوں تک چلتا۔مجھے مومل میندھرا کا قصہ بہت متاثر کرتا تھا۔اسے بار بار
سننے سے میری ادب سے وابستگی بڑھتی گئی۔پھر یہ بھی کہ میرا آبائی تعلق احمد پور شرقیہ سے ہے جسے میں
سرائیکی وسیب کا لکھنؤ سمجھتا ہوں۔صادق عباس ہائی سکول احمد پور شرقیہ میں پڑھا، میرے کچھ سکول فیلو
کمہار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔میں ان کے محلے میں ان کے ساتھ جاتا اور وہاں ''چاک'' پر برتن
بنتے دیکھتا جس سے میرے اندر ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوتی اور میں سوچتا کہ محض انگلی کے ایک
خاص توازن اور ترتیب سے مٹی کو چھونے پر کس طرح مختلف اشکال اور اقسام کے برتن بنتے

ہیں۔ برتن بننے کے اس منظر نے میرے اندر کی تخلیقی قوت کو پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ پانچویں جماعت میں، میں نے اخبارات میں بچوں کی کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ یہ کہانیاں زیادہ تر سبق آموز ہوتی تھیں۔ 1971ء میں جب میں فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا، میں نے پہلی بار ایسی کہانی لکھی جسے میں واقعی ایک کہانی سمجھتا ہوں۔ یہ کہانی میں نے ظریف شہید سٹیشن کے پاس ہونیوالے ریلوے حادثے سے متاثر ہو کر لکھی۔ اس دور میں اردو کے مختلف ڈائجسٹ بڑے پاپولر تھے۔ میں نے یہ کہانی ایک ڈائجسٹ میں چھپوائی۔ سیکنڈ ائیر میں میری کہانیاں بہت سے ڈائجسٹوں میں شائع ہو رہی تھیں۔

خبریں: آپ نے ڈائجسٹ پڑھے اور ان کے لیے لکھا بھی، یہ بتائیں کہ آپ ڈائجسٹ ادب کو کس سطح پر دیکھتے ہیں؟

حفیظ خان: حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے ڈائجسٹوں میں بین الاقوامی ادب پڑھنے کو ملا بلکہ میں نے موپساں کو پہلی بار ''سب رنگ'' میں پڑھا۔ فرسٹ ائیر میں ہمارے ایک استاد پروفیسر سہیل اختر تھے جو خود بھی بہت اچھے شاعر ہیں۔ وہ کلاس میں اکثر بیت بازی کا مقابلہ کرواتے، ہمارے دو ونگ بنتے، ایک کا میں جبکہ دوسرے ونگ کا محمد حسین ملک لیڈر ربنتا۔ محمد حسین ملک بھی ادبی رحجان رکھتا تھا۔ آج کل وہ ڈاکٹر ہے اور اس کے فرسٹ کزن انو ملک انڈیا کے معروف میوزک ڈائریکٹر ہیں۔ بیت بازی کا پہلا مقابلہ جیتنے پر پروفیسر سہیل اختر نے مجھے ''سب رنگ'' پڑھنے کو دیا۔ میں نے اسے پڑھا اور پہلی بار بین الاقوامی ادب سے روشناس ہوا۔ ویسے ذاتی طور پر میں ''ڈائجسٹ'' کو ''حلیم'' کے مترادف سمجھتا ہوں کہ جس طرح حلیم پکاتے ہوئے اس میں بہت سی چیزیں شامل کی جاتی ہیں بعینہٖ ڈائجسٹوں میں جہاں بین الاقوامی معیار کا ادب شامل ہوتا ہے وہاں عام سی کہانیاں بھی ملتی ہیں۔ ڈائجسٹ کو آپ ایک گلدستہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

خبریں: آپ سرائیکی ادب کی طرف کب اور کس طرح آئے؟

حفیظ خان: اچھا! سرائیکی ادب سے وابستگی کا سلسلہ عجیب ہے۔ 1975ء تک میں نے صرف افسانہ لکھا۔ اسی دوران ایس ای ایس کالج بہاولپور میں بی ایس سی کا طالب علم تھا تو ریڈیو پاکستان بہاولپور شروع ہوا۔ وہاں سرائیکی ڈرامہ لکھنے والا کوئی نہ تھا تو مجھے کہا گیا کہ آپ ڈرامہ لکھیں۔ اس سے

پہلے ریڈیو بہاولپور کے ایک سرائیکی ادبی پروگرام ''پھوار'' کے لیے بھی افسانہ لکھنے کا کہا گیا۔ ریڈیو بہاولپور کے پروگرام میں، میں نے سرائیکی افسانہ ''ہیرے تے کنکرے'' پڑھا پھر میں نے ڈرامے اور فیچر بھی لکھے۔ خواتین اور بچوں کے علاوہ زرعی پروگرام اور ''جمہور دی آواز'' کے لیے سکرپٹ بھی لکھتا رہا۔ بی ایس سی کرنے کے بعد اکتوبر 1976ء میں، میں نے یونیورسٹی لاء کالج ملتان میں داخلہ لیا اور ریڈیو ملتان کے لیے لکھتا رہا۔ ریڈیو بہاولپور کے قیام سے قبل میں اور میرے دوست تنویر سحر اور رفعت انجم (انجم لاشاری مرحوم) بہاولپور سے ملتان آتے اور یہاں ریڈیو پر ''یونیورسٹی میگزین'' پروگرام کیا کرتے تھے۔ اس دور میں، میں نے ریڈیو کے لیے بے تحاشا لکھا۔ ریڈیو بہاولپور کے معروف ڈرامے ''آبگینے'' اور ''زرد چاندنی'' میری تخلیق تھے۔ میرے اردو ڈراموں میں معروف شاعر ظہور نظر نے بھی بطور صداکار کام کیا۔

خبریں: اردو کے ساتھ ساتھ سرائیکی میں تخلیقی اظہار کیسا لگا؟

حفیظ خان: زبان ایک ذریعہ اظہار ہے، اس کے بدلنے سے تخلیق کی نوعیت نہیں بدلتی۔ میرے ساتھ ہوا یہ کہ 80-1979ء میں جو افسانہ میں لکھ رہا تھا وہ اس وقت کے لحاظ سے بہت آگے کا تھا لیکن جب میں نے ڈرامہ لکھنا شروع کیا تو وہ افسانہ وہیں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ڈرامے سے مجھے فرصت ہی نہ ملی کہ میں کہانی کی طرف پلٹتا۔ میں جو بھی ڈراما لکھتا اس میں کہانی شامل ہو جاتی۔ پھر ایک عرصے بعد جب دوبارہ کہانی کی طرف سے آیا تو میری کہانی میں ڈرامہ بھی آ گیا۔ پھر یہ کہ 1975ء کے بعد کا جو عہد تھا اس میں کہانی کے لیے موضوع مقامی نہیں رہے تھے۔ الیکٹرانک میڈیا ایک نئی انگڑائی لے رہا تھا۔ بین الاقوامیت کی یلغار تھی۔ معاشی مسائل زیادہ پیچیدہ ہو گئے تھے۔ اخلاقی اور لسانی مسائل کہیں پیچھے چلے گئے۔ منافقت کا چلن عام ہو گیا۔ اس صورتحال میں سب سے زیادہ مسائل نوجوان نسل کے لیے تھے اور میں نے نوجوانوں کے حوالے سے ہی لکھا اس دور میں، میں یوتھ ہی کا نمائندہ تھا۔ میں اب بھی سرائیکی کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی لکھتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اردو میں جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں سرائیکی وسیب کو ہی پینٹ کیا ہے۔ میری اردو کہانی سے بھی سرائیکی وسیب کی خوشبو آئے گی۔

خبریں: آپ نے بچوں کے لیے بے شمار ڈرامے لکھے، بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے کا عمل کیسا لگا؟

حفیظ خان: نقادوں نے بڑوں کے ادب کو ادب عالیہ کا نام دیا ہے اور میں بچوں کے ادب کو ادب عظمیٰ سمجھتا ہوں۔ یہ ہماری بنیادی نفسیات ہے کہ بچہ جتنی بھی عقل کی بات کرے ہم اسے بچہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہم سے بہتر اور آنے والے کل کا مکمل انسان ہے۔ حالانکہ وہ تیس چالیس سال آگے کی نسل کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس نے ہمیں دفن کر کے اپنی دنیا خود بسانی ہوتی ہے۔ میں نے ہمیشہ بچوں کو آنے والی نسل کا نمائندہ سمجھ کر ان کے لیے لکھا۔ میرے بہت سے ڈرامے بچوں سے متعلق ہیں لیکن کسی بھی ڈرامے میں میں نے بچے کو چھوٹا کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔ ڈراموں پر مشتمل میری تخلیق ''ماما جمال خان'' سرائیکی زبان میں بچوں کی پہلی مطبوعہ کتاب ہے۔ یہ ڈرامے 78-1977ء میں ریڈیو ملتان سے پروڈیوس کیے گئے۔ اس وقت احمد کبیر شاہ (موجودہ سٹیشن ڈائریکٹر) اس کے پروڈیوسر تھے۔ 13 اقساط پر مشتمل ان ڈراموں میں ''لبھو'' نامی ایک سٹاک کریکٹر تھا جو منیر شامی کیا کرتا تھا اس طرح اس میں بچوں کے دو سٹاک کریکٹر بھی تھے۔ اس ڈرامہ سیریز میں میں نے اس بات کو اجاگر کیا کہ جب ہم فوک وزڈم کی بات کرتے ہیں تو وہاں چائلڈ وزڈم کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے؟ میں نے اپنے ڈراموں میں بچوں کی دانش کو تلاش کیا ہے۔ مجھے بچوں کا ادب لکھ کر بہت خوشی محسوس ہوئی۔

خبریں: سرائیکی ہی نہیں بلکہ دنیا کی بہت سی زبانوں میں بچوں کا ادب بہت کم لکھا گیا ہے، آپ کے خیال میں اس کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں؟

حفیظ خان: سرائیکی لوک روایت میں بچوں کی بہت سی کہانیاں، لوریاں اور کھیل موجود ہیں جو سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچے۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے یہ قصے اور لوریاں سنیں لیکن اب بعض وجوہات کی بناء پر جن میں معاشی اور معاشرتی دباؤ اہم ہیں، بچے نظر انداز ہوئے ہیں۔ ماں تھکی ہاری ہوئی ہے جبکہ باپ معاشی مسائل میں الجھا ہوا ہے وہ اپنے بچوں کی طرف توجہ ہی نہیں دے سکا۔ اس نفسیاتی رویے کا یہاں کے تخلیق کار پر بھی اثر ہوا۔ جب تخلیق کار بڑوں کے مسائل نہیں سلجھا سکا تو بچوں کے کیا

سکھائے گا؟ اسی بناء پر بہت سے تخلیق کاروں نے بچوں کے ادب کی طرف توجہ ہی نہیں دی حالانکہ بچے کی متوازن تربیت کے لیے ضروری ہے کہ انہیں ان کا ادب دیا جائے۔ جن قوموں نے شعور پالیا ہے ان کے ہاں بچوں کا ادب بے بہا ملے گا۔ ہمارے ہاں بچوں کا ادب کم لکھے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں بنیادی تعلیم مادری زبان میں نہیں۔ ہمارے بچوں کو بنیادی تعلیم سرائیکی میں ہی ملنی چاہیے۔ اس کے لیے انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ سرائیکی میں درسی کتب موجود ہیں۔ ویسے بھی ادب اور درسی کتب میں بہت فرق ہوتا ہے۔ درسی کتب میں ادب زینہ بہ زینہ شامل ہوتا رہتا ہے۔ اگر بنیادی تعلیم سرائیکی میں شروع ہو جائے تو بچوں کا ادب اتنا زیادہ لکھا جائے گا کہ سبھی حیران رہ جائیں گے۔ اس حوالے سے یہ بات بھی اہم ہے کہ ایک طرف گلوبل ویلیج کی بات ہو رہی ہے تو دوسری طرف مادری زبان میں تعلیم اور لوکل ازم کی۔ میں گلوبل ویلیج کو نہیں مانتا۔ یہ تصور بہت پرانا ہو گیا ہے۔ اب تو دنیا کثیر الثقافتی اور کثیر اللسانی سماج کا روپ دھارتی جا رہی ہے اور یہی اس کا حسن ہے۔ آئندہ دس پندرہ برس تک ہر زبان کی ہیئت اور گرامر بدل جائے گی۔ وہ اس لیے کہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے بچے ٹی وی پر بیٹھتے ہیں تو بے شمار چینلوں پر انہیں دنیا بھر کی زبانیں سننے اور پڑھنے کو ملتی ہیں۔ میں نے اپنے متعدد افسانوں میں بھی اس تصور کو اجاگر کیا ہے۔ ٹھیک ہے کہ ثقافت زمین سے جڑی ہوتی ہے لیکن اب زمین سے اور بھی بہت کچھ جڑ گیا ہے جہاں ہم اقدار بدل رہے ہیں وہاں ہمیں پرانی تعریفیں بھی بدلنا پڑیں گی۔

خبریں: بطور افسانہ نگار آپ سرائیکی افسانے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

حفیظ خان: سرائیکی کا پہلا اہم افسانہ نگار احسن واگہ ہے جس نے ''ڈھل کرن دریا'' کی صورت میں سرائیکی افسانے کو ایک جمپ بلکہ سمت بھی دی۔ ''ڈھل کرن دریا'' میں کہانی کا عنصر موجود تھا لیکن اسے علامت سے بوجھل نہیں کیا۔ سرائیکی میں علامتی افسانہ عامر فہیم نے لکھا۔ میرے خیال میں اس کی کتاب ''جاگدی اکھ دا خاب'' کے بعد سرائیکی میں علامتی افسانہ سامنے نہیں آیا۔ عامر فہیم نے جو علامتیں استعمال کیں وہ اس عہد کی نہیں تھیں۔ یہ بہت بعد کے عہد کی علامتیں تھیں۔ اسی وجہ سے عامر فہیم کے افسانوں کی تفہیم نہیں ہو سکی۔ مسرت کلانچوی کے کچھ افسانے بہت اچھے ہیں۔ اسماعیل

احمدانی کے افسانے اس سطح کے نہیں ہیں جہاں پر انہیں ہونا چاہیے۔معذرت کے ساتھ میں اسمٰعیل احمدانی کو اچھا افسانہ نگار نہیں مانتا۔افسانہ دراصل رسوم ورواج اور اقدار وغیرہ سے بالاتر اور انسان کے اندر اور باہر کی شکست وریخت بیان کرتا ہے۔رسوم ورواج سے متعلق تحریر کو رپورتاژ اور کلچرل ڈاکومنٹری کہہ سکتے ہیں۔افسانہ تو ایک ایسی تخلیق ہے جو نئی سمت اور نیا زاویہ سامنے لاتی ہے۔قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ اس طرح کا کوئی واقعہ اس کے اندر بھی رونما ہوا ہے۔افسانے میں رسوم اور اقدار ہوتی ضرور ہیں لیکن انہیں بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔باسط بھٹی نے جو افسانے لکھے ہیں ان میں زبان کی نفاست اور بناؤ سنگھار تو ہے لیکن افسانے کا بنیادی عنصر بہت کم ہے۔باسط بھٹی احمد پور شرقیہ کا باسی ہے۔میں بہاولپور سے جنوب کی طرف کے علاقے کو جس میں احمد پور شرقیہ، محراب والا اور قلعہ ڈیراور آتے ہیں سرائیکی کا لکھنؤ گردانتا ہوں۔اس علاقے کی زبان میں نفاست اور سنگھار تا ملے گی۔ اس طرح ملتان سرائیکی زبان کا دلی ہے۔خطہ ملتان کی زبان فصیح و بلیغ ہے۔ظفر لاشاری نے اچھا افسانہ لکھا لیکن وہ پہلا آدمی ہے جس کے افسانے کو ناول کہا گیا۔اس کے ناولوں ''پہاج'' اور ''نازو'' میں اگرچہ رسوم ورواج بیان کیے گئے ہیں لیکن اس کا ٹریٹ منٹ خالص ناول کا ہے۔ظفر لاشاری کے ناولوں ایسا اور کوئی بھی سرائیکی ناول سامنے نہیں آسکا۔اسماعیل احمدانی کے ناول ''چھولیاں'' کی میں بات نہیں کرتا لیکن ''امر کہانی'' میں ناول کی خوشبو موجود ہے۔اسلم انصاری کا ناول ''بیڑی وچ دریا'' بھی سامنے آچکا ہے لیکن اس کا صرف پہلا باب ہی کام کا ہے۔پہلے باب کے بعد وہ ناول کی اٹھان کو برقرار نہیں رکھ سکے۔یوں لگتا ہے کہ بقیہ باب بہت عجلت میں لکھے گئے ہیں۔ میں خود بھی 1991ء سے ایک ناول پر کام کر رہا ہوں۔

خبریں: آپ نے سرائیکی ناول کے حوالے سے بات کی،آپ کے خیال میں عالمی معیار کا سرائیکی ناول کیوں سامنے نہیں آیا؟

حفیظ خان: ناول سرائیکی میں باہر سے آیا ہے۔ہمارے ہاں داستان یا قصہ موجود ہے۔ناول کو سرائیکی میں ڈھالنے کے لیے بہت سی چیزوں کا خیال رکھنا ہوگا۔پہلی بات تو یہ کہ اس کے جو اہم عناصر ہیں وہ پورے ہونے چاہئیں۔اس میں داستان یا قصے کا عنصر نہیں آنا چاہیے۔ظفر لاشاری نے سرائیکی

ناول کی ابتدائی شکل ہمیں دی ہے۔ارشاد تونسوی کے ناول ''دیگر ویلا'' کا پہلا باب جو شعبہ سرائیکی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے جریدے ''سویل'' میں چھپا کو ہم عالمی ادب کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں لیکن مجموعی ناول کے معیار کا فیصلہ تو اس کے چھپنے کے بعد ہی ہوگا۔سرائیکی میں تو افسانے کی عمر بہت بہت کم ہے۔1976ء میں مسرت کلانچوی کے افسانوں کا مجموعہ ''اچی دھرتی جھکا آسمان'' شائع ہوا اور اسے جلد ہی افسانہ نگار تسلیم کرلیا گیا پھر ایک دوڑ لگ گئی۔لوگوں نے راتوں رات اپنی پہچان بنانے کے چکر میں تخلیق پر بہت کم توجہ دی۔اس دوڑ میں جو لوگ شامل تھے ان کی یا تو ذہنی وفکری سطح وہ نہیں تھی جو ایک بڑے پراجیکٹ کے لیے درکار ہوتی ہے یا پھر شہرت پانے کے لیے انھوں نے شارٹ کٹ تلاش کیے۔اگر کسی تخلیق کار کی تخلیقی سطح بلند تھی بھی تو اس نے یہی سہل جانا کہ ایک ناول کو چار پانچ سال دیئے جانے کے بجائے وہ اتنے ہی عرصے میں افسانوں کی چار پانچ کتابیں کیوں نہ سامنے لے آئے۔پھر یہ بھی کہ 1970ء کے بعد ریڈیو ملتان، ریڈیو بہاولپور اور ریڈیو ڈیرہ اسماعیل خان بن جانے سے جہاں سرائیکی زبان وادب کو بہت زیادہ شناخت اور فروغ ملا وہاں ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ بہت سے جینوئن تخلیق کار یا تو ریڈیو سے وابستہ ہوگئے یا پھر اس کے لیے باقاعدہ لکھنے لگے۔ریڈیو کے لیے جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ عموماً معروضی حالات کے تحت ہوتا ہے۔بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے کہ جن کا ریڈیو کے لیے لکھا گیا کام سالڈ (Solid) بھی ہو۔عالمی سطح کے ناول کا نہ لکھا جانا صرف سرائیکی کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اردو میں بھی رہا ہے'' آگ کا دریا'' تو خیر بہت بڑا ناول ہے مگر ''اداس نسلیں'' اور ''علی پور کا ایلی'' ایسے ناول بھی تخلیق نہ ہوسکے۔ناول تو بڑی بات ہے گزشتہ کئی برس سے کوئی بہت بڑا افسانہ بھی نہیں لکھا گیا۔

خبریں: تو کیا آپ اس صورتحال کو فکشن کا زوال کہیں گے؟

حفیظ خان: نہیں ایسا بھی نہیں۔بہت سے اچھا لکھنے والے ابھی شناخت کے عمل سے گزر رہے ہیں۔یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک شخص نے اگر ایک دور میں اچھا افسانہ لکھا ہے تو وہ ہمیشہ اچھا افسانہ لکھے گا۔اچھا افسانہ سرزد ہوجاتا ہے۔شعوری طور پر لکھا نہیں جاتا۔ٹھیک ہے گزشتہ 30,20 برس میں کوئی بڑا ناول سامنے نہیں آیا لیکن یہ ایک فیز ہوتا ہے جسے میں ڈارمنسی (Dormancy) فیز کہتا ہوں۔یہ انتہائی انتشار کا دور ہے۔مقامی، قومی اور بین الاقوامی انتشار، اس میں آدمی اپنی سوچ کو کسی

ایک نقطے پر مرتکز کر ہی نہیں پا رہا۔ ناول لکھنے کے لیے بے پناہ ارتکاز چاہیے۔ ناول لکھنا شب دیگ پکانے کے مترادف ہے یعنی بہت صبر آزما کام۔ یہ چند منٹوں میں پریشر ککر میں کھانا پکانے کی بات نہیں۔ ناول لکھنے میں زندگی صرف کرنا پڑتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کشمکش کے عہد میں بہتر ادب تخلیق ہوتا ہے۔ آج کا عہد کشمکش کا نہیں بلکہ انتشار کا ہے۔ اس میں ٹھہراؤ نہیں ہے۔ ہم لوگ مسلسل حالت جنگ میں ہیں۔ محاذ پر بیٹھ کر مفصل خط نہیں لکھا جاتا۔ یہ وہ بنیادی وجہ ہے جس نے کسی تخلیق کو کار کو ابھرنے نہیں دیا۔ ایک اور بات یہ بھی کہ بہت سے لوگوں کو سمجھ ہی نہیں آ رہا کہ انہیں کیا لکھنا ہے۔ آج کا تخلیق کار جب یہ سوچتا ہے کہ اس کے ذہن میں ناول لکھنے کا کوئی زبردست آئیڈیا آیا ہوا ہے مگر اس پر کئی برس لگ جائیں گے تو وہ کہتا ہے کہ میں اتنے برس کی محنت سے ناول لکھوں، پتہ نہیں اسے کوئی پڑھے گا بھی یا نہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ میں 13 قسطوں کا ڈرامہ لکھ کر اصغر ندیم سید بن جاؤں اور راتوں رات مشہور ہو جاؤں۔ اچھا! کوئی اہم ناول نہ آنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ آج کا تخلیق کار بے شمار مسائل کا شکار ہے۔ اسے اپنے بچوں کی سکولنگ کرنی ہے، گھر چلانا ہے اور سماجی زندگی میں حصہ بھی لینا ہے تو ایسے میں ہر تخلیق کار کے لیے مرزا ہادی رسوا بننا اور محض تخلیق پر توجہ دینا بہت مشکل ہے۔

خبریں: آپ کے خیال میں آج کے تخلیق کار کو اور کون سے مسائل درپیش ہیں؟

حفیظ خان: آج تخلیق کار کو جن مسائل کا سامنا ہے وہ زیادہ تر عمومی نوعیت کے ہیں۔ معاشی اور سماجی حوالے سے اسے بھی ہماری سوسائٹی کے اور لوگوں کی طرح پریشانیوں اور الجھنوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں تخلیق کار نے اچھا افسانہ لکھا، اب حکومت اس کی امداد کا بندوبست کرے تو اس بات سے مجھے اختلاف ہے۔ ادیب کوئی چیز تخلیق کر کے سماج پر احسان نہیں کرتا، وہ تو اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے لیے ریاست پابند نہیں کہ وہ اسے تسلیم کرے اور اُس کی مالی معاونت بھی کرے۔ مصور، گلوکار یا کسی اور فنکار کی طرح ایک ادیب بھی اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے۔ آج کل ایک چلن بن گیا ہے کہ ادیبوں کے مسائل حکومت حل کرے۔ نہیں! میں ایسا نہیں سمجھتا۔ اس طرح تو سبھی فنکار گھر بیٹھ جائیں گے۔ میرے خیال میں اگر کہیں کوئی چرواہا بیٹھا بانسری بجا رہا ہے اور وہاں سے گزرتے ہوئے مسافر نے اس کی

کچھ نہیں۔ دستوفسکی اور منشی پریم چند کو کس نے تسلیم کیا؟ خرم بہاولپوری کو دیکھ لیں، ان کی زندگی میں جو ہوا سب جانتے ہیں لیکن کیا خرم بہاولپوری مٹ گیا؟ نہیں! تخلیقی پوٹینشل روکے نہیں رکتا، وہ ہمیشہ رواں اور خود کو منوا کے رہتا ہے۔ بعض لوگ خود کو منوانے کے لیے ادبی تنظیم بنا لیتے ہیں یا اس کا سہارا لیتے ہیں۔ تخلیق کار کے لیے یہ بات بھی مناسب نہیں۔ میں تنظیم کے کسی لیڈر کو ادیب نہیں مانتا۔ میرے قریب ادیب بھی ایک مبہم سی اصطلاح ہے، اس کے لیے تخلیق کار کی اصطلاح زیادہ بہتر ہے۔ تنظیم سازی غیر تخلیقی سرگرمی ہے۔ سچا تخلیق کار تنظیم سازی سے ماورا ہوتا ہے۔

خبریں: آپ ریڈیو سے بھی وابستہ رہے یہ تجربہ کیسا رہا؟

حفیظ خان: ریڈیو سے میرا تعلق 1970-71ء سے بن گیا تھا۔ 1979ء میں ملتان سے لاء کرنے کے بعد جب میں واپس آبائی شہر گیا تو کچھ عرصہ وہاں وکالت کی لیکن میرے اندر ریڈیو اس قدر گھس گیا تھا کہ اسے میں کبھی باہر نہ نکال سکا۔ 1981ء میں، میں نے مقابلے کے امتحان میں پہلی پوزیشن لی اور پروگرام پروڈیوسر بن گیا۔ ریڈیو کے معروف نام احسن واگھا، خورشید ملک، مدثرہ منظر اور بلبل یاسمین میرے بیچ فیلو تھے۔ میری خواہش کے مطابق ریڈیو ملتان پر پوسٹنگ ہوئی۔ یہاں میں نے صرف ایک، ڈیڑھ برس گزارا مگر بہت کچھ سیکھا۔ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ میں نے جو بھی اچھا یا برا سیکھا ہے اس میں ریڈیو کا بڑا عمل دخل ہے۔ ریڈیو نے ہی مجھے بولنا اور لکھنا سکھایا۔ اسی میڈیم پر ہی مجھے لوگوں کے رویوں کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس دور میں ریڈیو پر کام کرنا تخلیقی عمل تھا۔ لیکن میں آج کے ریڈیو کو ریڈیو ہی نہیں مانتا یہ تو چلتا پھرتا مائیکروفون ہے۔ (یہ پروگرام 1981ء میں ریڈیو ملتان سے میں نے ہی شروع کیا تھا) ماضی میں ریڈیو کی کچھ روایات تھیں۔ مثلاً کسی بھی پروگرام کے ذریعے خفیہ پیغام دینا ٹھیک نہیں تھا۔ ریڈیو کے مائیک کو اس طرح استعمال کرنا کہ جیسے آپ کسی کی خواب گاہ میں سرگوشی کر رہے ہوں، برا تصور کیا جاتا تھا۔ لوگوں میں ایک تخلیقی جذبہ تھا، جواب مفقود ہو چکا ہے۔ پروڈیوسر اور قلم کار دونوں کمٹڈ جنونی ہوتے تھے۔ میں نے فخر بلوچ اور اکرم شاد جیسے پروفیشنل پروڈیوسر نہیں دیکھے۔ میں نے ریڈیو کے لیے لکھا اور پروڈیوس بھی کیا۔ ٹی وی کے لیے بھی لکھا۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ ریڈیو کا بہتر سامع ایک بہتر تخلیق کار بھی بن سکتا ہے۔

O

(روزنامہ ''خبریں'' ملتان، 19 اگست 2005ء)

ہمارا محور پاکستانیت ہے مگر اس کی جہتیں بیکراں ہو چکی ہیں

(اردو اور سرائیکی کے شاعر، افسانہ نگار، ڈراما نگار، محقق، نقاد اور کالم نگار حفیظ خان سے گفتگو

انٹرویو: طارق شاہد

تخلیقی عمل یا عدم سے وجود کا ظہور، تخلیق کائنات کا حصہ اور اس کا تسلسل ہی ہے۔ یہ وہ وصف ہے جو خدا اپنے ان بندوں کو عطا کرتا ہے کہ جن پر کائنات کے حسن کو فراواں کرنے اور اس کی اس طور بقا کی ذمہ داری ڈالنا مقصود ہوتی ہے۔ یہ بات عام مشاہدے کی ہے کہ وقت کی رفتار کے سامنے نہ تو زمانے ٹھہر پاتے ہیں اور نہ ہی انسانوں کا طبعی وجود، مگر حسن تخلیق کا ادنیٰ سا پرتو بھی دوام کا اعتبار پالیتا ہے۔ انسان ہو کہ انسان کا فکری وجود، بنیادی طور پر دونوں تخلیقی عمل کی تقدیس کے مظہر اور اس سے مشروط ہوتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ کوئی بھی تخلیقی وصف ہو، وجود یا رویہ اگر اپنے تخلیق کے تقدس اور بنیادی مقاصد سے ہم آہنگ ہے تو لطیف ترین ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ بصورت دیگر تمام تر حشر سامانیوں کے باوجود حرف غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے ان خیالات کا اظہار اردو اور سرائیکی کے شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، محقق، نقاد اور کالم نگار حفیظ خان نے روزنامہ ''جناح'' کے ادب نامہ کے لیے تخلیقی عمل پر طارق شاہد سے گفتگو کرتے ہوئے کیا۔

اپنی تخلیقات کے بنیادی محور کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میری تخلیقات

کا بنیادی محور انسان اور اس سے جڑے ہوئے وہ تمام آلام اور مصائب ہیں کہ جن کے سبب دنیا اپنی خوبصورتیوں سے محروم ہوتی جارہی ہے۔ اپنی تخلیقات میں احترامِ آدمیت، رواداری، برداشت اور وطن دوستی کو مقدم رکھتا ہوں۔ بلا تفریق رنگ و نسل ہر دنیا زاد کے چہرے پر شادمانی اور لبوں پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنی تحریروں کے ذریعے ہزیمت زدہ لوگوں کے واسطے تکریم اور کھلے ہوئے طبقات میں جینے کی آرزو چاہتا ہوں۔ معاشرتی بُنت اور انسانی رویوں کے باہمی طرزِ عمل میں توازن کا قائل ہوں، ایسا توازن جو ہر قسم کی جارحیت اور غاصبیت کی نفی کرتا ہو۔

پاکستانی ادب میں مزاحمتی رویہ پر بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پاکستان کا غالب حصہ جغرافیائی لحاظ سے وادیٔ سندھ پر مشتمل ہے جو قدیم ترین ادوار میں بھی اپنی زرخیزی کے سبب بیرونی حملہ آوروں کی زد میں رہی ہے۔ یہ خطہ مال و دولت اور اناج کی فراوانی اور اپنے کھلے میدانوں کے سبب ہمیشہ سے مہم جو نسلوں کے لیے تر نوالہ بنا رہا ہے۔ اس خطے پر ہزاروں سال پہلے آریاؤں کی یلغار ہو یا صدیوں قبل وسط ایشیا کے جنگجوؤں کی مہم جوئی، منگولوں کے حملے ہوں یا یورپی اقوام کی یورش، یہ خطہ اور اس کے باسی ہمیشہ اپنے دفاع کے واسطے مزاحم ہی رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ بیرونی حملہ آوروں کو جتنی مزاحمت اس علاقے میں سہنا پڑی اس کی نظیر کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے اس خطے میں تخلیق پانے والا ادب مزاحمتی رویوں سے بھلا کس طرح صرف نظر کر سکتا تھا۔ لہٰذا ہر دور میں دنیا کا بہترین مزاحمتی ادب ہمارے ہاں ہی تخلیق ہوا۔ ایک پاکستانی ہونے کے ناطے اپنی اس حیثیت پر فخر ہے کہ ہم دنیا کے بے مثال ادبی ورثے کے امین ہیں۔ 1857ء کی جنگ آزادی ہو یا تحریک پاکستان، پاکستان کی بقا کے واسطے لڑی جانیوالی جنگیں ہوں یا عہد موجود میں دہشت گردی کے خلاف ہمہ جہت جنگ، ہمارے تخلیق کاروں نے ہر سطح پر مزاحمتی رویوں کے تسلسل کو تمام تر سنہری روایتوں کے ساتھ قائم رکھا ہوا ہے یہ ہمارے ادب میں مزاحمتی رویوں ہی کا اعجاز ہے کہ جس نے دیہاتوں میں رہنے والی عام لوگوں کو بھی اعلیٰ پائے کی دانش اور شعور عطا کیا ہوا ہے۔

پاکستانی ادب کی مجموعی صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ قیام پاکستان کے بعد کا ادب چاہے قومی زبان کا ہو یا پاکستانی زبانوں کا، وہ مجموعی طور پر ہجرت کے مصائب اور مسائل کا

احاطہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔اس وقت کے تخلیق کاروں نے اجتماعی کرب کو بھی اپنی ذات کے حوالے سے دیکھا، محسوس کیا اور برتا جب کہ ساٹھ کی دہائی کا ادب اس مایوسی سے عبارت ہے جو آزادی کے ثمرات سے محرومی کے نتیجے میں عام آدمی کا مقدر بنی۔اس دور میں پاکستانی زبانوں میں تخلیق کیا جانے والا ادب ون یونٹ کے قیام کے مضمرات اور صوبوں کی انفرادی شناخت کے کھو جانے کا نوحہ گر بن کر سامنے آیا۔اس دور میں سندھی زبان کے ادب نے پہلی بار اپنی الگ پہچان کرائی جو کہ شدید ترین مزاحمتی بنیادوں پر استوار تھی۔ستر کی دہائی کا تمام تر ادب اس سناٹے کی تصویر ہے جو سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد ہمارے قومی مزاج میں در آیا۔ملک کے ایک بازو کو توڑ کر الگ کر دیا جانا، جنگ میں شکست اور ایک لاکھ سے زیادہ فوجیوں کا جنگی قیدی بنا لیا جانا اس ہزیمت کی تفہیم کے لیے کافی ہے جو اس وقت کے تخلیق کاروں کے قلم اور رویوں میں اتر چکی تھی۔یہ سناٹا اس وقت مزید گہرا ہوتا چلا گیا جب 1977ء کی تحریک نظام مصطفیٰ بھی اپنے مطلوبہ نتائج سے محروم رہی۔اس کے بعد کے برسوں میں بھی ایک عمومی سرد مہری، بے حسی اور قنوطیت ہمارے ادبی مزاج کا حصہ رہی ہے جس میں وقفوں کے ساتھ مزاحمتی عنصر بھی نمایاں ہوتا رہا۔قومی زبان کے تخلیق کاروں نے چند استثنائی صورتوں کے علاوہ زیادہ تر اپنے ہی خول میں بند ہو کر تخلیقی عمل جاری رکھا جب کہ اس کے برعکس پاکستانی زبانوں میں بھرپور طریقے سے اجتماعی مسائل و مصائب پر مبنی مزاحمتی ادب نے نئی نئی کروٹیں لیں۔خاص طور پر سندھی سرائیکی اور پنجابی زبانوں میں۔

موجودہ دور میں سرائیکی ادب کی صورتحال کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ موجودہ دور تخلیقی توانائی کے اعتبار سے سرائیکی ادب کا سنہرا دور کہا جا سکتا ہے کہ جب پورے عالمی شعور کے ساتھ جملہ اصناف، ادب میں بھرپور طور پر تخلیقی عمل جاری ہے۔ناول، افسانہ، ریڈیائی ڈرامہ، ٹیلی ڈرامہ، انشائیہ، تنقید، تحقیق، غزل، نظم، طویل نظم، کافی اور تراجم کے میدانوں میں نئے نئے میلان داخل ہو رہے ہیں۔تخلیق کار کی ادراکی سطح بلند ہوئی اور زاویہ نگاہ بدل رہا ہے۔ملٹی لینگوئل شاعروں اور ادیبوں نے وسعت نظر کے ساتھ دنیا بھر سے جڑنا شروع کیا ہے۔تنقید، تحقیق اور تراجم میں خاص طور پر طرز کہن کو ایک طرف رکھ کر مبہم اور معذرت خواہانہ رویہ ترک کر کے دوٹوک بات کرنے کا ڈول ڈالا

جا چکا ہے۔ گو کہ اس روش کی مزاحمت وہ طبقہ اب بھی کر رہا ہے جو کسی بھی صورت میں سٹیٹس کو کے خلاف نہیں جاتا، مگر اب اس قسم کی مزاحمت کا وقت بھی گزر چکا ہے۔ آج کا قاری کسی بھی لگی لپٹی کے بغیر صرف سچ جاننا چاہتا ہے اور میڈیا کی اس بیداری کے دور میں سچ کو کب تلک چھپایا جا سکتا ہے۔ یہی حال تراجم کا ہے۔ اب سے پہلے یہ حال تھا کہ تخلیقی کام بھی سرائیکی اور اس پر نقد و نظر بھی سرائیکی میں۔ ترجمہ بھی صرف دوسری زبانوں کے ادب کو سرائیکی میں ترجمہ کرنے تک محدود تھا کہ جس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ سرائیکی ادبی ورثے کو مع تنقید و تحقیق اردو یا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تا کہ سرائیکی ادب دنیا سے روشناس ہو سکے۔ اس سلسلے میں میں نے دو تنقیدی و تحقیقی کتب کے ذریعے اس تحریک کا آغاز کر دیا ہے۔ جسے قومی اور عالمی سطح پر بھرپور پذیرائی ملی ہے اور نان سرائیکی قاری بھی ہماری شاعری اور شاعروں سے آشنا ہوا ہے۔ شاعری میں بھی آج کے تخلیق کاروں کو انہیں عناصر کی جانب سے میرے خیال میں آخری مزاحمت کا سامنا ہے جو اب بھی فارسی اور عربی نظام عروض میں کی گئی غیر مقبول شاعری ہی کو سرائیکی شاعری مانتے ہیں۔ آج کا شاعر فارسی اور عربی عروض کو چھوڑ کر خالصتاً مقامی نظام و عروض کی پابند شاعری کرنا چاہتا ہے کہ جو برصغیر میں فارسی بولنے والوں کی آمد سے قبل بھی کی جا رہی تھی اور آج کی طرح مقبول تھی۔ مقامی نظام عروض میں کی گئی شاعری کی مقبولیت کو دیکھ کر لگتا ہے کہ اب کسی بھی طرح اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

قاری اور اشاعت کے حوالے سے پاکستان میں کتب کی صورتحال پر بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پاکستان میں کتاب کی صورتحال بہت مایوس کن ہے۔ خواندگی کی کمتر سطح کے پیش نظر کتاب کا خریدار ویسے بھی نہ ہونے کے برابر ہے اور اگر کوئی سنجیدہ قاری کتاب خریدنا بھی چاہے تو اپنی قیمت کے سبب وہ اس کی قوت خرید سے باہر ہو چکی ہے۔ مہنگا کاغذ، پبلشرز اور بک سیلرز کی بے مہابہ منافع خوری نے جہاں تخلیق کار کو مایوس کیا ہوا ہے وہاں قاری کی بھی حوصلہ شکنی ہوئی ہے جب کہ وہ ادبی ادارے جو حکومتوں سے لاکھوں روپے کی گرانٹ لیتے ہیں، وہ کتابوں کی اشاعت پر خرچ کی جانیوالی رقم کو بے کار تقریبات کی نذر کر کے اپنا اُلو تو سیدھا کر لیتے ہیں لیکن کتاب کی ترویج سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ سال میں ایک آدھ بار اگر وہ کوئی کتاب چھاپتے بھی ہیں تو صرف اس شخص کی جو اُن

میں سے ہے یا انکی خوشامد میں مہارت کے رتبے پر فائز ہے۔

اپنی زندگی کے سفر کے حوالے سے انھوں نے بتایا کہ تین اکتوبر انیس سو چھپن کو ڈیرہ نواب صاحب (احمد پور شرقیہ ضلع بہاولپور) میں پیدا ہوا۔ والد مرحوم امان اللہ خان ایس ای کالج بہاولپور میں احمد ندیم قاسمی کے کلاس فیلو رہے اور بعد میں نواب بہاولپور کی آرمی میں کمیشن لیا جہاں نواب صادق محمد خان خامس کے صاحبزادے لیفٹیننٹ جنرل ایس ایم عباسی ان کے بیچ میٹ تھے مگر جلد ہی طبی وجوہات کی بنا پر فراغت کے بعد پہلے ریاست کی پولیس اور پھر محکمہ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن جائن کر لیا جہاں وہ اپنی وفات (12 فروری 1980ء) تک رہے۔ میں نے صادق عباس ہائی سکول احمد پور شرقیہ سے 1970ء میٹرک اور 1975ء میں ایس ای کالج بہاولپور سے بی ایس سی (میڈیکل) کیا۔ 1977 کے سیشن میں کہ جس کا رزلٹ 1979ء میں آیا میں نے ملتان یونیورسٹی سے ایل ایل بی اور اس کے ایک سال بعد تاریخ میں ماسٹرز کیا۔ 1980ء میں ایک برس احمد پور شرقیہ اور بہاولپور میں وکالت کی اور فروری 1981ء میں مقابلے کا امتحان دیکر ریڈیو پاکستان میں بطور پروگرام پروڈیوسر ملازمت کر لی۔ اسلام آباد میں پانچ ماہ کی ٹریننگ کے بعد ریڈیو پاکستان ملتان میں تعینات ہوا۔ 1982ء میں ایک اور مقابلے کے امتحان کے بعد عدلیہ میں چلا گیا۔ وہاں سے آنے کے بعد جنوری 1984ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے قانون کے شعبے میں بطور لیکچرار جاب کر لی مگر ستمبر 1984ء میں پی سی ایس کرنے کے بعد لاہور میں ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر کے طور پر تعینات ہوا۔ اسی سال سی ایس ایس کرنے کے بعد بارہویں کامن کورس میں پہلے پوسٹل اور بعد میں آڈٹ اکاؤنٹس گروپ میں ملازمت کی پیشکش ہوئی مگر اس کے اگلے برس ایک اور مقابلے کے امتحان کے بعد پھر سے عدلیہ میں چلا گیا۔

اپنے ادبی سفر کی روداد بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ادبی سفر کا آغاز پانچویں جماعت میں بچوں کے رسائل اور اخباری ایڈیشنوں میں نظمیں اور کہانیاں لکھنے سے ہوا۔ میری پہلی باقاعدہ کہانی 1970ء میں ماہنامہ ''شباب'' لاہور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ''شمع'' کراچی، ''آداب'' لاہور میں چھپتا رہا۔ 1974ء میں ''سب رنگ'' اور پھر ''سورج'' ڈائجسٹ میں لکھتا رہا جہاں اس وقت

کہانیوں کی السٹریشنز نامور مصور اقبال مہدی بنایا کرتے تھے۔1975ء میں جب بی ایس سی کا
طالب علم تھا، سرائیکی افسانہ ریڈیو بہاولپور کے ادبی پروگرام میں نشر ہوا۔ ریڈیو بہاولپور سے میں بطور
اناؤنسر، کمپیئر اور ڈرامہ صداکار کے بھی وابستہ رہا۔ یہیں 1975ء ہی میں سرائیکی فیچر، ڈرامے اور
بچوں کے ڈرامے لکھنے شروع کیے۔1976ء میں لاء کرنے کے دوران میں اسی حیثیت میں ریڈیو
ملتان سے وابستہ ہوا جہاں 1979ء تک ڈرامے، فیچر، بچوں کے ڈرامہ سیریل، خصوصی مواقعوں پر نشر
ہونے والے غنائیے اور فیچر بھی لکھتا رہا۔ لاء کالج ملتان کے ادبی مجلّے ''العدل'' کا مدیر بھی رہا اور ایک
یادگار نمبر شائع کیا۔1979ء سے جنوری 1981ء تک ایک بار پھر ریڈیو بہاولپور کے لیے سرائیکی
اور اردو فیچر اور ڈرامے لکھتا رہا۔

1989ء میں جہاں پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے سرائیکی ڈرامہ لکھا وہیں اسلامیہ یونیورسٹی
میں سرائیکی شعبے کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے میرے ریڈیائی ڈراموں کا پہلا انتخاب ''کچ
دیاں ماڑیاں'' بھی شائع ہوا جو سرائیکی میں ڈراموں کا پہلا مجموعہ تھا۔ اسے اکادمی ادبیات نے ''خواجہ
فرید ایوارڈ'' عطا کیا۔1990ء میں سرائیکی افسانوں کا مجموعہ ''ویندی رُت دی شام'' شائع ہوا۔
اسے بھی اکادمی ادبیات نے ''خواجہ فرید ایوارڈ'' سے نوازا۔ یوں مجھے متواتر دو برس تک اکادمی
ادبیات کے دو ایوارڈ حاصل ہونے کا منفرد اعزاز حاصل ہوا۔1990ء ہی میں بچوں کے ڈراموں کا
انتخاب ''ماما جمال خان'' شائع ہوا جو کہ سرائیکی میں بچوں کے ڈراموں کی پہلی کتاب تھی۔1993ء
میں پاکستان کی آئینی تاریخ کے ایک عہد پر مبنی کتاب ''اتفاق سے نفاق تک'' اپنے دوسرے قلمی نام
احمد میزان کے حوالے سے لکھی۔

1993ء ہی میں حالات حاضرہ کے منفرد ماہنامے "The Competitior" کا اجراء
کیا۔1997ء میں اردو کہانیوں کا موضوعاتی انتخاب ''یہ جو عورت ہے'' کے نام سے شائع ہوا۔
1999ء میں اردو نظموں کا انتخاب ''پہلی شب تیرے جانے کے بعد'' شائع ہوا۔2003ء میں بچوں
کے سرائیکی ڈراموں کا دوسرا انتخاب ''خواب گلاب'' شائع ہوا اور 2004ء میں سرائیکی افسانوں کا
دوسرا مجموعہ ''اندر لیکھ دا سیک'' سامنے آیا۔ اس دوران چونکہ ٹیلی وژن کے لیے لکھنے کا سلسلہ جاری رہا

2003ء میں پاکستان ٹیلی ویژن لاہور سے ''بہترین ڈرامہ نگار'' کا ایوارڈ بھی دیا گیا جو پاکستانی زبانوں کے ڈرامائی ادب کے لیے پہلی بار جاری ہوا تھا۔ 2005ء میں سرائیکی ڈراموں کا ایک انتخاب ''رِھڑے پندھ'' کے نام سے شائع ہوا۔ 2006ء میں تحقیق، تنقید اور ترجمے پر مبنی کتاب'' رفعت عباس کی سرائیکی شاعری، نوآبادیاتی، خطوں کا نیا مکالمہ'' چھپ کر سامنے آئی۔ 2007ء میں اسی نوعیت کی ایک اور کتاب ''خرم بہاولپوری: شخصیت، فن اور منتخب سرائیکی کلام'' شائع ہوئی ہے۔ ایک نجی ٹی وی چینل کے لیے سرائیکی ڈرامہ سیریل ''ہک رات دا بجھ'' بھی تحریر کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔ ''نوائے وقت'' ملتان میں ''بے ساختہ'' کے عنوان کے تحت کالم اور معاصر اخبار و جرائد کے لیے تنقیدی و تحقیقی مضامین میں بھی لکھتا رہتا ہوں۔

پاکستانی ادب کے مستقبل کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ پاکستانی ادب کو لسانی اعتبار سے وسیع تر تناظر میں دیکھتا ہوں۔ ہر وہ ادب پاکستانی ہے جو پاکستان کی جغرافیائی حدود میں تخلیق ہو رہا ہے یا جس کے تخلیق کار پاکستانی ہیں چاہے وہ انگریزی سمیت کسی بھی زبان میں ہو، اگر ہم پاکستانی ادب کو کسی ایسی زبان تک محدود کرتے ہیں جو اکثر پاکستانی بولتے ہیں تو میرا خیال ہے ہم اپنے آپ کو اور اپنے ادب کو محدود کرتے چلے جائیں گے۔ پاکستانی ادب کی اس تعریف کے پس منظر میں دیکھتا ہوں کہ ایک طویل عبوری دور سے گزرنے کے بعد پاکستانی ادب نہ صرف اپنے شناختی بحران سے نکل چکا ہے بلکہ اپنی منزل کا تعین بھی کر چکا ہے۔ آج کا پاکستانی شاعر، ادیب یا دانشور نہ تو اپنے اطراف سے غافل ہے اور نہ ہی اپنی ذات کی بقا اور بقا کے تقاضوں سے۔ پاکستانی زبانوں میں تخلیق کیا جانے والا ادب بے بسی کی حدود سے نکل کر بازیافت کے مدار میں داخل ہو چکا ہے۔ دکھی انسانیت سے آگے بڑھ کر ہم احترامِ آدمیت کی بات کرنے لگے ہیں۔ ہمارا محور پاکستانیت ہے مگر اس کی جہتیں بے کراں ہو چکی ہیں۔ ہمارا تخلیق کار اب دنیا میں تنہائی کے عذاب کا شکار نہیں بلکہ وہ خود کو ہر اس خطے میں موجود محسوس کرتا ہے کہ جہاں انسانی حقوق کی نفی کی جا رہی ہو یا وہ کسی طور بیرونی جارحیت اور غاصبیت کا شکار ہو۔ ہمہ گیری کے ان اوصاف کے ہوتے ہوئے پاکستانی ادب کا روشن مستقبل دیکھ رہا ہوں۔

سرائیکی افسانے کے ارتقاء اور مستقبل پر بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مطبوعہ سرائیکی

افسانے کا سفر ابھی بمشکل نصف صدی سے بھی کچھ کم عرصے پر محیط ہے۔ ہر زبان کی طرح سرائیکی میں بھی پہلے شاعری نے جنم لیا اور پھر نثر نے جب کہ نثر میں بھی محبوب ترین اصناف داستان اور ڈرامہ ہی رہیں۔ انسان جوں جوں مصروف ہوتا چلا گیا داستان گوئی بھی افسانے تک سکڑتی چلی گئی مطبوعہ سرائیکی کہانیوں کے اوّلین کہانی کاروں میں غلام حسن حیدرانی کا نام سب سے اہم ہے اگر چہ ان کا افسانہ کرافٹ اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے اپنے سے بعد کے افسانہ نگاروں جتنا جامع نہیں مگر پھر بھی افسانے کے بنیادی اوصاف کا حامل ضرور ہے۔ سرائیکی افسانوں کا پہلا مجموعہ 1976ء میں مسرت کلانچوی کا سامنے آیا مگر ستر کی دہائی کے آغاز ہی سے سرائیکی افسانہ نگاری میں بہت سے معتبر نام شامل ہوتے چلے گئے جن میں حبیب فائق، عامر فہیم، بتول رحمانی، شیما سیال، احسن واگھا۔ ظفر لشاری، اسلم قریشی، باسط بھٹی، سجاد حیدر پرویز، رحیم طلب، غزالہ احمدانی وغیرہ شامل ہیں۔ میرے سرائیکی افسانے ستر کی دہائی کے اوائل ہی میں ماہنامہ ''سرائیکی ادب'' ملتان میں چھپنا شروع ہو چکے تھے لیکن پہلا مجموعہ ''ویندی رُت دی شام'' 1990ء میں اور دوسرا مجموعہ ''اندر لیکھ داسیک'' 2004ء میں شائع ہوا۔ جہاں تک سرائیکی افسانے کے مستقبل کا تعلق ہے تو میں اس سے مایوس نہیں بلکہ خاصا پرامید ہوں۔ ستر کی دہائی کے بہت سے افسانہ نگار، افسانہ لکھنا چھوڑ چکے ہیں لیکن پھر بھی بہت سے سینئر کہانی کاروں کے ساتھ ساتھ نئے لوگوں کا اضافہ سامنے آ رہا ہے جو پوری توانائی کے ساتھ آج کی وسیبی دانش کو نہایت ہنرمندی سے افسانے کے قالب میں منتقل کر رہے ہیں۔

O

(روزنامہ ''جناح'' اسلام آباد، 3 اپریل 2007ء)

آج کا سرائیکی تخلیق کار عالمی شعور کا حامل ہے: حفیظ خان

انٹرویو: رازش لیاقت پوری

سوال: سرائیکی ادب میں افسانہ کہاں کھڑا ہے۔ کیا سرائیکی کہانی جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عالمی ادب کا مقابلہ کر رہی ہے۔

حفیظ خان: اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں ایک مغالطے کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں جو سرائیکی افسانے کی عمر اور پہلے سرائیکی افسانے کے لکھے جانے سے متعلق ہے۔ ہمارے نقاد ابھی تک یہی رائے رکھتے ہیں کہ سرائیکی افسانے کی عمر شاید تیس پینتیس برس ہے یا وہ اسی بحث میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ سرائیکی کا پہلا افسانہ نگار غلام حسن حیدرانی تھا یا تحسین سبائے والوی۔ یعنی انہیں پہلا سرائیکی افسانہ نگار قرار دینے کے لیے ہم سرائیکی افسانہ لکھے جانے کی تاریخ کے بجائے پہلے مطبوعہ سرائیکی افسانہ کی کھوج میں اُلجھ کر سرائیکی کہانی کے عرصہ تخلیق کو بلا جواز گھٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ حالانکہ سرائیکی کہانی یا افسانہ اپنی غیر مطبوعہ صورت میں تو حیدرانی صاحب یا تحسین سبائے والوی سے بھی بہت پہلے کا موجود ہے، لہذا سرائیکی افسانے کی شروعات کو ہمیں کسی طور پر ان دو حضرات سے نہیں لینا چاہیے اور نہ ہی اس مغالطے میں رہنا چاہی کہ سرائیکی افسانے کی عمر محض تیس پینتیس برس ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ سرائیکی ادبی پرچوں کے اجراء اور ان میں سرائیکی افسانوں کی اشاعت کی

شروعات کو سرائیکی افسانے کا آغاز سمجھ لینا خلافِ حقائق ہے۔اب جہاں تک سرائیکی ادب میں افسانے کے مقام کا تعلق ہے تو میرے نزدیک مقدار سے قطع نظر معیار کے اعتبار سے وہ دیگر پاکستانی زبانوں کی نسبت زیادہ بہتر مقام کا حامل ہے۔کیونکہ ہمارا کہانی کار سندھ وادی میں حملہ آوری، کالونی گیری اور استعماری تسلطائیت کے آلام اور مصائب کا تاریخی ادراک اپنے صدیوں کے شعوری ورثے میں رکھتا ہے۔اس طور سرائیکی افسانہ اپنے موضوعات کے تنوع اور ان کے برتنے کے حوالے سے ایسی تخلیقی تاثیر سے مزین اور ان امکانات کا جہان اپنے جلو میں لیے ہوئے ہیں جو اسے دیگر زبانوں کے افسانوں سے ایک امتیازی مقام عطا کرتے ہیں۔آپ میرے سرائیکی افسانے ''منشا تے میاں منشا'' کو ہی لے لیں، جو کئی عالمی زبانوں میں ترجمہ ہو کر ان کہانیوں میں شمار ہوتا ہے جو معیاری عالمی ادب کے زمرے میں لی جاتی ہیں۔افسانہ چاہے احسن واگھا کا ہو یا اشولال، مزار خان، مسرت کلانچوی، ظفر لشاری، باسط بھٹی، حبیب موہانہ، جہانگیر مخلص، فرحت عباس، ملک مہر علی اور اسلم قریشی کا، وہ کسی بھی طور افسانوی ادب کے عالمی تقاضوں سے تہی نہیں ہے۔گزشتہ چند برسوں سے سرائیکی کے معروف شعراء کا افسانہ نگاری کی طرف چلے آنا، میرے نزدیک ایک ایسا کرشماتی فینا منا ہے۔جو دورِ حاضر میں نظم کے مقابلے میں نثری ادب کے ابلاغ اور تاثیر کی Recognition سے عبارت ہے۔ابھی چند دن قبل چولستان میں کنگن والے بنگلے پر منعقدہ ''کہانی رات'' میں جہانگیر مخلص، فرحت عباس اور شاہد عالم شاہد کا صدیوں کے تاریخی شعور کے ارتقاء کے پس منظر میں افسانے پڑھنا میرے لیے خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔میں اپنے دوست علی تنہا کی اس رائے سے قطعی متفق نہیں ہوں کہ سرائیکی افسانہ ابھی ابتدائی مراحل میں اور باقی زبانوں سے بہت پیچھے ہے۔تنہا صاحب نے جب سرائیکی افسانہ پڑھا ہی نہیں اور نہ ہی وہ سرائیکی افسانہ نگاروں کے نام اور کام سے واقف ہیں تو پھر سرائیکی افسانے کے بارے میں ان کی رائے کس طرح سنجیدگی کی حامل قرار دی جا سکتی ہے۔

سوال: سرائیکی ادب میں نثر کی کمی کے کیا اسباب ہیں۔کیا نثر کی کمی اب بھی ہے جب کہ کئی کتابیں آچکی ہیں؟

حفیظ خان: زبان کوئی بھی ہو، اس میں پہلے نظم آتی ہے اور پھر نثری ورثہ تخلیقی اثاثے کے طور پر

سامنے آتا ہے ۔سرائیکی میں بھی کم وبیش اسی قسم کی صورت حال رہی ۔ثانیاً سرائیکی وسیب چونکہ صدیوں سے بیرونی حملہ آوری کا نشانہ بنا رہا،لہذا جو بھی حملہ آور آتا ،مقامی تہذیب کے نشانات مٹانے اور اپنی زبان ،تہذیب وثقافت رائج کرنے کے واسطے آتے ہی یہاں کی درسگاہوں اور لائبریوں کو بلاتمیز نذر آتش کرنا شروع کردیتا،اس لیے جتنا بھی نثری ورثہ تھا وہ عہد بہ عہد خاکستر ہوتا رہا۔جب کہ منظوم ادب لائبریریاں اور کتب جلائے جانے کے باوجود بھی لوکائی کے حافظے میں نہ صرف محفوظ رہا، بلکہ نسل درنسل یادداشتوں میں منتقل ہوتا رہا۔ثالثاً نثری ادب تخلیق کرنا چونکہ ڈیسک ورک ہی کی صورت ہے۔جس میں ارتکاز اور مطالعہ از حد ضروری ہے اس لیے عمومی تخلیق کار کالاابالی پن اور زندگی کے دیگر بکھیڑے اسے کم ہی اس طرف آنے دیتے ہیں ،جب کہ اس کے برعکس چونکہ شاعری چلتے پھرتے بھی ہوسکتی ہے۔جس میں ابلاغ سہل اور شہرت کا گلیمر بھی نثر نگاری کی نسبت زیادہ میسر ہوتا ہے،اس لیے نئے لکھاریوں کے لیے شاعری میں زیادہ کشش ہوتی ہے اور یوں دور حاضر میں بھی زیادہ کتب شاعری ہی کی شائع ہورہی ہیں۔گو کہ زبانوں کا حسن شاعری کے دم سے ہی نکھرتا ہے مگر ان کا لسانی سگھڑاپا ،فکری رچاؤ اور تہذیبی پرداخت نثری ادب سے ہی ممکن ہیں جس کی کمی سرائیکی ادب میں اب بھی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

سوال: کیا آپ محسوس کررہے ہیں کہ مادری زبانیں سرکاری زبانوں پر غلبہ حاصل کررہی ہیں۔ پاکستان میں مادری زبانوں کو پیچھے دھکیلنے والے کون سے عناصر ہیں؟

حفیظ خان: میرے نزدیک یہ کہنا حقائق کے برعکس ہوگا کہ مادری زبانیں اب غلبہ حاصل کررہی ہیں ۔بلکہ مادری زبانیں تو ہمیشہ سرکاری زبانوں پر غالب رہی ہیں ۔اگر ایسا نہ ہوتا تو آج سرائیکی وسیب کے گھر گھر میں سرائیکی کی بجائے ان حملہ آوروں اور کالونی گیروں کی زبانیں بولی جارہی ہوتیں،جنھوں نے ہر حملہ آوری کے بعد بزور شمسیر اپنی زبانیں نافذ کرنے کی کوششیں کیں۔ہاں اتنا تو ضرور ہوتا ہے کہ ہر حملہ آور اور غاصب کو مقامی طور پر چند ایسے افراد کا ٹولہ مل جاتا ہے جو معاشی وسماجی مفادات اور درباری وسرکاری مناصب کے واسطے اپنا گھر ،در اور ضمیر فرشِ راہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا لباس ،وضع قطع اور زبان تک میں بھی فوری طور پر حملہ آور آقاؤں کی فخریہ

اتباع اور نقالی کو جز وایمان بنا لیتے ہیں۔اپنے غیر ملکی آقاؤں کے یہ ''ٹوڈی'' ہر دور میں قدم قدم پر مقامی زبانوں اور ثقافتوں کے لیے حوصلہ شکنی اور ہزیمت کے اسباب پیدا کرتے رہتے ہیں۔ذرائع ابلاغ پر ان لوگوں کے کنٹرول کے سبب ایسا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ مقامی مادری زبانیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیئے جانے کے بعد اپنا وجود کھورہی ہیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔حملہ آور اور غاصب زبانیں ہی کہیں فنا کے گھاٹ اتر ہی ہوتی ہیں۔اس تاریخی تناظر میں آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وطن عزیز میں وہ کون سے عوامل تھے جو یہاں کی مادری زبانوں کو پیچھے دھکیلنے کی سعی میں تو عصر حاضر میں بھی اپنی پوری ابلاغی توانائی کے ساتھ ارتقائی حیات کی جولانیوں میں ہیں۔

سوال: پنجابی ادب کے مقابل سرائیکی ادب کو آپ کہاں دیکھتے ہیں؟

حفیظ خان: مختلف زبانوں کا ادب کبھی مقابل کے طور پر نہیں پرکھنا چاہیے۔کیونکہ مختلف زبانوں کے اکثریتی علاقوں کے اپنے اپنے معروضی حالات ہی وہاں کے ادب کی تخلیقی توانائی کا تعین کرتے ہیں۔پنجابی زبان کا خطہ بھی سرائیکی وسیب کی طرح صدیوں سے بیرونی حملہ آوری کا شکار رہا ہے جب اس کا مرکز لاہور خاص طور پر شمالی حملہ آوروں کی گزرگاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے جہاں منڈی کی معیشت اور سیاسی طاقت کی اجارہ داری کا خواہاں ایک ایسا موثر اور مقتدر طبقہ وجود میں آ گیا جس نے حملہ آور زبانوں اور ثقافتوں کا حاشیہ نشیں بن کر پنجابی بولنے والوں کو اب تک تہذیبی ،لسانی اور ثقافتی سطح پر نہایت شدت سے اس طرح احساس کمتری میں مبتلا کیا ہوا ہے کہ وہ اب بھی غیر پنجابی زبان وثقافت میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کو ہی سٹیٹس سمبل سمجھتے ہیں اور یوں یہ تہذیب ولسانی کنفیوژن لاہور سے باہر کے پنجابی بھائیوں کو بھی متاثر کیے ہوئے ہے۔جب کہ اس کے برعکس سرائیکی بولنے والوں کے ہاں حملہ آوری کے حاشیہ نشینوں کا طبقہ وجود میں آیا مگر اس میں منڈی کی معیشت کے عنصر کی بجائے جاگیرداری اور گدی نشینی کا تڑکہ لگا ہوا تھا۔یوں عوامی سطح سے بالا اور ان سے فاصلہ رکھنے کے باعث یہ طبقہ لوک دانش اور لوک زبان وثقافت کو غتر بود کرنے کی بجائے اپنی حویلیوں اور محلات تک ہی محدود رہا۔اس طرح سرائیکی کا لسانی ،تہذیبی اور ثقافتی شعور کسی کنفیوژن کا شکار نہیں ہوا،اس لیے یہاں کا دانشور اور تخلیق کار ایک واضح سوچ کے ساتھ معاشرے کی اجتماعی رہنمائی میں بھرپور کردار ادا

کر رہا ہے۔

سوال: سرائیکی خطے میں تین آرٹس کونسلز ہیں۔لاکھوں روپے کے فنڈز بھی ان کے لیے مختص ہیں لیکن ان کی کارکردگی کے بارے میں انگلیاں اُٹھ رہی ہیں ایک گہری نگاہ رکھنے والے سرائیکی دھرتی کے بیٹے اور ادیب کی حیثیت سے آپ اسے کیسے دیکھتے ہیں؟

حفیظ خان: ہمارے سرکاری اداروں کا سب سے بڑا مسئلہ کسی واضح مقصد اور وژن کا نہ ہونا اور مستقل پالیسی سازی کا فقدان ہے۔اس کے علاوہ ہر محکمے کی طرح آرٹس کونسلز میں بھی ایسے لوگوں کو بٹھا دیا گیا ہے جو اپنے اندر بھی نہ تو کوئی clarity of thoughts رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کے اندر فیصلہ کرنے کی کوئی جرات باقی رکھی گئی ہے۔لہذا نوکری بچانے کے چکر میں، عافیت اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ حالات کو جوں کا توں رکھا جائے اور کہیں سے بھی کوئی آواز نہ اُٹھنے پائے۔تو ایسے میں لاکھوں کیا کروڑوں کے فنڈز بھی مختص کر دیئے جائیں تو حالات دگرگوں ہی رہیں گے۔ہمارے ہاں وژن کا تو یہ حال ہے کہ سارا سال نہایت اہم ضروریات پر بھی بجٹ خرچ نہیں کیا جاتا اور جب جون کا مہینہ سر پر آتا ہے اور بجٹ Laps ہونے کی تلوار سر پر گرا چاہتی ہے تو جیسے تیسے بے کار اور بے مقصد مدات میں بجٹ کو اُڑا کر رکھ دیا جاتا ہے۔اگر آپ موچی کی جگہ جولاہے کو اور جولاہے کی جگہ ڈاکٹر کو بٹھائیں گے تو ایسا ہی ہوگا۔بات سیدھی سی ہے، ہر جاب پر اس سے متعلقہ اہلیت کے بندے کو بٹھائیں اور اسے فیصلہ سازی میں آزادی دیں اور تحفظ مہیا کریں، پھر دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔

سوال: آپ ریڈیو سے وابستہ رہے یہ تجربہ کیسا رہا اور اس شعبے سے کن تلخ تجربات کی وجہ سے منہ موڑا؟

حفیظ خان: ریڈیو سے میں عملی طور پر جون 1975ء سے جولائی 1982ء تک مختلف حیثیتوں میں وابستہ رہا۔میرے ادبی تشخص کی ابتداء ریڈیو سے نہ سہی مگر اس کی ارتقائی منازل ریڈیو ہی کی مرہون منت ہیں۔اسی طرح میری شخصی تشکیل میں بھی ریڈیو کے تلخ اور خوشگوار تجربات دونوں کا حصہ رہا ہے۔میں ریڈیو کے شاندار ماضی کے آخری دنوں اور اس کی بحیثیت ایک ادارہ کے، بربادی کے آغاز کا بھی عینی شاہد ہوں۔یہ ادارہ شاندار تخلیقی روایات کے تقدیسی شعور کے ہوتے ہوئے بھی

"کرکری" کی جی حضورانہ اور "صاحب سلام" کلچر میں کیسے منقلب ہوا، میری آنکھوں دیکھی بات ہے۔ بے مثال فنکاروں کی گیٹ سے لے کر مائیکروفون تک تذلیل، کلرک پروڈیوسروں کی ابوجہلی خواتین فنکاروں پر مختلف ذیلی شعبوں کے لوگوں کی چھینا جھپٹی، خوشامد کی بے محابہ درامد اور پذیرائی پروگرام پروڈکشن میں سہل پسندی اور "منہ دیکھے" کی بکنگ کا چلن اور جینوئن تخلیق کاروں کی تکریم کی بجائے ان کے استحصال کے رویے نے ریڈیو سے اس کا شاندار ورثہ چھین لیا۔ جہاں دن رات تخلیقی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی بجائے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے گھٹیا سازشوں کی آبیاری ہونے لگے، وہاں اس ماحول کو اپنا مستقبل بنانا بڑے دل گردے کا کام تھا، جو سچی بات ہے میرے پاس نہیں تھا اور نہ ہی میں اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھتا تھا۔ لہٰذا 15 جولائی 1982ء کو اسے بطور پروگرام پروڈیوسر ہی خیرآباد کہہ دیا۔

سوال: پچھلے دو برس سے آپ ملتان کی تاریخ پر کام کر رہے ہیں۔ یہ خیال کیسے آیا اس کی کوئی غرض وغائیت؟

حفیظ خان: یوں تو تاریخ بچپن سے ہی میرا پسندیدہ موضوع رہی ہے مگر ملتان کی تاریخ کو غیر جانبدارانہ اور بلا کسی تعصب کے لکھنے کی تحریک ہمارے دوست علی تنہا کی تھی جو دو اڑھائی برس قبل ریڈیو ملتان پر اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ پہلے پہل اسے ہفتہ وار سرائیکی سلسلہ تقاریر کی صورت "ملتان سدا آباد" کے نام سے شروع کیا گیا جو تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ بعدازاں میں بوجہ ملتان سے دوری اور دیگر مصروفیت اسے ریڈیو پر تو جاری نہ رکھ سکا، مگر اسی عنوان سے یہی سلسلہ آرٹیکلز کی صورت ایک معاصر میں شائع ہونا شروع ہو گیا۔ جہاں تک غرض وغائیت کی بات ہے تو میرے نزدیک ملتان کی تاریخ کو اب تک نہ صرف مسخ کیا گیا ہے، بلکہ مقامی مورخین نے اسے تاریخ نویسی کے مسلمہ اصولوں سے ہٹ کر اپنے اپنے تعصب کے زاویے سے لکھا اور حقائق کی بجائے مفروضوں پر انحصار کیا ہے۔ دیگر وجوہات کے علاوہ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ملتان کے اب تک کے مورخین فن تاریخ نویسی میں کوئی باقاعدہ تحقیقی مہارت اور علمی سند کے حامل نہیں تھے۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ ملتان کی تاریخ کو غیر جانبدارانہ حقائق اور ہمہ قسم کے تعصبات سے الگ ہو کر تاریخ نویسی کے مروجہ اور مسلمہ اصولوں

کے مطابق لکھا جائے۔ بدقسمتی سے ہماری پوری دستیاب تاریخ مغالطوں اور تضادات سے اس طرح بھر دی گئی ہے کہ ایک عہد کا قاتل بھی ہمارا ہیرو اور اسی قاتل کا مقتول بھی ہیرو کے طور پر ہمارے سامنے "ہیرو ورشپ" کے لیے رکھ دیا گیا ہے اور ہم مزے سے دونوں کے نام کی قوالی کیے جا رہے ہیں۔ کہیں کوئی تو ایسی کسوٹی ہو کہ حقائق نظر انداز کرنے کی روش ترک کرتے ہوئے اپنا "ہیرو ورشپ" کا کوئی معیار مقرر کر سکیں۔ اگر شخصیت پرستی ہی کرنی ہے تو کسی دلیل کے ساتھ اور کسی "پچ" کے ساتھ تو کی جائے۔ نہ کہ بلا دیکھے اور بلا سوچے سمجھے۔

سوال: بحیثیت مجموعی سرائیکی وسیب میں آپ تخلیقی رویوں کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟

حفیظ خان: تخلیقی رویوں کو اگر جملہ اصنافِ ادب اور ادبی معیار کے تناظر میں دیکھا جائے تو معاملہ کچھ اتنا بھی حوصلہ افزا نہیں ہے۔ لیکن انفرادی طور پر خاصہ معیاری اور معاصر زبانوں کے مقابلے میں کہیں بہتر تخلیقات سامنے آ رہی ہیں۔ میرے نزدیک اس کی بنیادی وجہ آج کے سرائیکی تخلیق کار کا Multi lingual اور عالمی شعور کے ادراک کا حامل ہونا ہے۔ کروڑ لعل عیسن میں بیٹھا ہوا اشولال، ملتان کا رفعت عباس، شمیم عارف، شوکت مغل، وسمل پنوار، بہاولپور کا نصر اللہ خان ناصر، جاوید چانڈیو، احمد پور کا جہانگیر مخلص، تنویر سحر، ظفر لاشاری، مظفر گڑھ کا سجاد پرویز، دیرے کا عاشق بزدار اور رسول پور کا اسلم رسول پوری کسی طور پر بھی، دنیا کے کسی کونے میں جاری تخلیقی عمل، عوامل اور مزاحمتوں سے ناآشنا نہیں۔ مگر جس بات کی کمی میں محسوس کرتا ہوں وہ اس سے ہٹ کر ہے۔ کسی بھی عہد کے تخلیق کاروں اور دانشوروں میں معاصرانہ چشمک اور اختلاف رائے کا اپنا حسن ہے، مگر اسے ذاتی اختلاف کبھی بھی نہیں بننا چاہیے۔ ضرورت ایک دوسرے کا ہنر تسلیم کر کے آگے بڑھنے کی ہے، نہ کہ ایک دوسرے کو رگید کر۔ اگر کسی ہم عصر نے کوئی بہتر کام کرنے کی کوشش کی ہے تو اس پر مکالمے کا آغاز ہونا چاہیے، نہ کہ چپ سادھ لی جائے۔

سوال: سرائیکی ڈرامے اور سرائیکی کتب کے حوالے سے ہمارے میڈیا کا رویہ کیسا ہے؟

حفیظ خان: اس حوالے سے میں شدید نوعیت کے تحفظات رکھتا ہوں۔ سرائیکی ٹی وی چینل آنے کے بعد یوں محسوس ہوا تھا کہ یہاں کا تخلیق کار اور فنکار نہ صرف سرکاری میڈیا کے استحصالی

رویوں سے چھٹکارا حاصل کر سکے گا بلکہ اپنے ''حقوق دانش'' کا تحفظ بھی بہتر طور پر کر پائے گا مگر ان چینلز کے آنے کے بعد معکوس نتیجہ اور استحصال کی نئی نئی صورتیں سامنے آئیں، جن میں لٹنے والا اب بھی یہاں کا دانشور اور تخلیق کار ہی تھا۔ ان چینلز کو نہ تو سرائیکی زبان و ادب سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی تہذیب و ثقافت سے۔ ان کے نزدیک ٹی وی کی سکرین پر کچھ نہ کچھ دکھائی دیتے رہنا چاہیے۔ اور وہ بھی کسی کو کچھ ادا کیے بغیر۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اگر کوئی ایک تخلیق کار ان کے ہاں سے لُٹ کر آتا ہے، تو دوسرا نو آموز لٹنے کو تیار بیٹھا ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف ڈرامے کا معیار گرا ہے بلکہ سرائیکی تہذیب و ثقافت کو بھی انتہائی مضحکہ خیز صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ جس کی پرواہ نہ ہماری ادبی ثقافتی تنظیموں کو ہے اور نہ ہی اداروں کو اور نہ ہی ''حقوق دانش'' کے تحفظ کے واسطے رہنمائی کا کوئی ذریعہ ہے۔

جہاں تک سرائیکی کتب کا معاملہ ہے تو ہمارے اکثر قومی اخبار اپنے کتب پر تبصرے کے صفحات پر نو طبع سرائیکی کتب کو جگہ ہی نہیں دیتے۔ مگر تعصب کا الزام پھر بھی اس درماندہ خطے اور خطے کے لوگوں پر۔

O

(روزنامہ ''خبریں'' ملتان، 5 جون 2009)

قوم پرستی سیاسی شعور کی بجائے جذباتی نعرے بازی پر مبنی ہے: حفیظ خان

انٹرویو: عامر حسینی

ہم شہری: سرائیکی قومی تحریک کا ثقافتی پس منظر کیا ہے؟

حفیظ خان: میں کبھی بھی قوم کو اس کی ثقافت سے الگ کر کے نہیں دیکھتا۔ لیکن آج سے 30,25 سال قبل قومیت کی بنیاد ثقافت پر جیسے رکھی جاتی تھی، انقلاب زمانہ کی وجہ سے اب اسے بطور بنیادی جزو کے نہیں لیا جا سکتا۔ میرے نزدیک شناخت کے اعتبار سے قوم اور ثقافت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ کسی خطے کی الگ شناخت اس وقت تک ہوتی ہے جب تک اس خطے میں دوسری قومیتوں کا انجذاب نہ ہو، دوسری ثقافتوں اور زبانوں کا وہاں اثر نہ آئے اور دوسری قومیتوں کو اس خطے میں تفاعل نہ ہو۔ اب اگر اس تناظر میں ہم اس خطے کو دیکھیں جسے سرائیکی خطہ کہا جاتا ہے تو وہاں زمانہ قدیم سے ثقافت کا عمل مسلسل دوسری ثقافتوں، زبانوں اور دوسری قومیتوں سے انجذاب، اثر اور تفاعل کے عمل سے گزرتا رہا ہے۔ یہاں غیر ملکی لسانی برتری بھی رہی۔ غیر ملکی تہواروں کو آج بھی مقامی تہوار سمجھ کر منایا جاتا ہے اس خطے کا جو ثقافتی رنگ ڈھنگ ہے وہ کسی بھی طور سے کسی الگ قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ قومیت کی بنیاد زبان پر ہے تو کثیر لسانی انسانوں کے اس جنگل میں قومیت کی رہی سہی یہ شناخت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ میری نظر میں قومیت کی بنیاد کی الگ سے

بلکہ زبان ابھی تک مطلوب ہے ثقافت اپنی تمام تر شناختی علامات کھو چکی ہے۔

ہم شہری: گویا آپ قومیت کی سرے سے کسی تعریف ہی کو ٹھیک نہیں مانتے؟

حفیظ خان: بالکل، میں نے 30,25 سالوں میں بطور تاریخ، ثقافت اور ادب عالم کے طالب علم کے قومیت کی معقول تعریف تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عالمی سطح کے ماہرین تاریخ نے اب تک قوم کی جتنی بھی تعریفیں متعین کی ہیں وہ بہت زیادہ مجرد اور تصوراتی ہیں۔ زبان، مذہب، لباس اور نفسیاتی ہم آہنگی پر مبنی قوم کی تعریفیں ناقص ہیں۔ مذہب کو قوم کی بنیاد مانا جائے تو پھر مسیحی دنیا کا ایک ملک ہونا چاہیے، مسلم دنیا کا ایک ملک اور اسے ایک قوم ہونا چاہیے۔ زبان کی بنیاد پر تمام انگریزی بولنے والوں کو ایک قوم ہونا چاہیے۔ جغرافیے کو بنیاد مانیں تو آپ کو ایک ہی ملک کے اندر کئی ٹکڑے کرنا پڑیں گے۔ میری نظر میں جغرافیائی تبدیلیوں کے عوامل بدلتے رہتے ہیں۔ اب آپ ذرا قومیت کی تعریف کی جملہ کمزوریاں دیکھئے۔ پاکستان 47ء میں مذہب کی بنیاد پر بنا اور محض 24 سال بعد خطہ پھر زبان کی بنیاد پر تقسیم ہو گیا۔ قومیت ہم تک مجرد شکل میں آئی ٹھوس شکل میں نہیں۔ اسے دو جمع دو چار کی طرح نہیں لیا جا سکتا۔ اس حوالے سے اگر ہمارے خطے میں زبان بنیاد ہے، سرائیکی قومیت کی تو میں صاف کہوں گا کہ اگر یہاں بسنے والے ایک لسانی ہوتے تو یہ قومیت کی بنیاد بن سکتی تھی لیکن ہمارے یہاں تو خطہ اور سماج کثیر لسانیت کی طرف چلا گیا ہے یہی حال سندھ اور سرحد میں بھی ہے اور بلوچستان میں بھی یہی۔ اب دیکھئے ہمارے یہاں جنرل مشرف کے دور میں نعرہ لگا ''سب سے پہلے پاکستان'' اور اس کے مقابلے میں کہا گیا ''سب سے پہلے اسلام'' تو یہ دونوں فریق بھی قومیت کی کسی ایک تعریف پر متفق نہیں ہوتے۔

ہم شہری: حفیظ صاحب! آپ کا یہ جواب سن کر میں یہ سوال کرنے پر مجبور ہوں کہ آپ پاکستان میں قوم پرستی کے مظہر کو کیسے دیکھتے ہیں؟

حفیظ خان: میری نظر میں موجودہ قوم پرستی سوائے جذباتی نعرے اور مبالغہ آمیز ماضی پرستی کے کچھ نہیں ہے۔ قوم پرستی ماضی کو معروضی ڈھنگ سے جانچنے کے بجائے رومانی نکتہ نظر سے دیکھتی ہے کہ ماضی میں ہمارا مذہب یہ تھا، ہماری زبان وہ تھی، ہم دھوتی کرتا پہنتے تھے یا پاجامہ۔ قوم پرست

عناصر ایسے ماضی پرست ہیں کہ یہ قومیت کے وہ قومی اشارے تلاش کرتے ہیں جو ان کے لیے مفید طلب ہوں۔ ہمارے ہاں قوم پرستی کا مظہر جذباتی نعروں پر استوار ہے۔ اگر اس مظہر سے ابھرنے والی تحریکیں حقیقت پر استوار ہوتیں تو شاید کامیابی سے ہمکنار ہو جاتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سرائیکی خطہ ہمیشہ ہجرتوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ مختلف گروپوں کی آمد و رفت یہاں ہوتی رہی ہے۔

ہم شہری: وادیٔ سندھ کی تہذیب کیا ہے؟ اور اسی ضمن میں ایک سوال یہ ہے کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب سے جو آثار ہڑپہ سے دریافت ہونے وہ موہنجو داڑو، بستی جلیل اور ٹیکسلا سے بھی دریافت ہوئے۔ اسی تہذیب کے آثار مشرقی پنجاب اور ہریانہ سے مل رہے ہیں۔ گویا یہ ایک ہی تہذیب ہے جس کو وادی سندھ کی تہذیب کہا جاتا ہے۔ پھر یہ سندھی، سرائیکی، پشتون، پنجابی میں کیوں منقسم ہے؟

حفیظ خان: دیکھئے، ویسے تو پورا مغربی پاکستان قدیم وادی سندھ میں شامل ہے۔ تاریخ میں وادیٔ سندھ کی تشکیل میں سات دریاؤں کو دخل رہا ہے۔ اگر ہم وادی سندھ کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کریں تو سندھ، پنجاب سے پشاور تک کا علاقہ ہے، وسطی سندھ ہمارا موجودہ سرائیکی خطہ ہے، جبکہ جنوبی سندھ میں اسے مہران اور شمالی سندھ میں اسے اباسین کہا جاتا ہے۔ لیکن اب دریاؤں کے کنارے تہذیب کی بنیاد کا تصور بھی ختم ہو گیا ہے۔ قومیت کے اجزا بالکل بدل رہے ہیں۔ وادیٔ سندھ کے اندر ''قوم پرستانہ لہروں'' کی بنیاد سیاسی تو ہو سکتی ہے لیکن تاریخی نہیں۔ یہ جو قومیت کے نعرے لگائے جاتے ہیں، یہ نہایت جذباتی اور غیر سائنسی ہوتے ہیں۔ آج کوئی احیائی تحریک ایسی نہیں جو ''حال'' کو سیاست سے ہٹ کر ماضی کے ساتھ کامل ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتی ہو۔ لیڈر بننے کا خبط ہے کبھی مذہبی خطابت کا سہارا لے کر سیاسی مقاصد کے لیے لوگوں کو اکٹھا کیا جاتا ہے پھر تماشائی اکٹھے کیے جاتے ہیں انہیں ہجوم بدتمیزی میں بدلا جاتا ہے۔ حاکم طبقات سے دوغلی پالیسی اختیار کرتے ہوئے سودے بازی کی جاتی ہے۔

ہم شہری: آج کی سرائیکی ادبی تحریک کہاں کھڑی ہے؟

حفیظ خان: میرے خیال میں سرائیکی ادبی تحریک بہت توانا ہے۔ اس میں روز بروز دانشوارانہ گہرائی آ رہی ہے۔ اب یہ ادبی تحریک تخیلاتی نہیں رہی بلکہ سماجی مسائل کا احاطہ کر رہی ہے۔ کسی حد

ہی نا سٹیلجیا بھی اس میں ملوث ہے ۔سرائیکی ادبی تحریک جگ جہان کو ساتھ ملا کر دیکھنے کی تحریک ہے۔اگر آپ بین الاقوامی تناظر میں دیکھیں تو ادب وشاعری کے روایتی اور بنیادی سمجھے جانے والے لوازم ختم ہو گئے ہیں۔اب سماجی تفاعل اہمیت اختیار کرتا جار ہا ہے اور یہی سماجی تفاعل سرائیکی ادبی تحریک میں بھی جھلک رہا ہے۔

ہم شہری: سرائیکی ادبی تحریک کا سرائیکی قومی تحریک سے کوئی رشتہ ہے؟

حفیظ خان: دیکھیں ،اس حوالے سے میرا اپنا نقطہ نظر ہے اور ہوسکتا ہے اس سے دوسرے لوگ اتفاق نہ کریں ۔میری نظر میں صرف سرائیکی ادبی تحریک ہی نہیں بلکہ پاکستان میں تمام ادبی تحریکوں کا قومی تحریکوں سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔قوم پرست اپنی تحریکوں کو ہائی جیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اردو ادب میں سرسید کی جدیدیت کی تحریک تھی یا ترقی پسند تحریک تھی انہیں بھی سیاسی مفادات کے تحت قوم پرستوں نے ہائی جیک کرنے کی کوشش کی اور یہی کچھ سرائیکی ، پنجابی ،بلوچ ،پشتون ادب کی تحریکوں کے ساتھ بھی ہوا۔اصل میں قوم پرستوں نے ادبی شخصیات کی مقبولیت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

ہم شہری: پاکستان میں علاقائی زبانوں کی اپنی تحریکوں میں بہت بڑی خلیج ہے ۔وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعافل سے نہیں گزر رہیں ،اس کی کیا وجہ ہے؟

حفیظ خان: اس فاصلے کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ معلومات کے نام پر جہالت کو فروغ دے رہے ہیں ۔ہمارا معاشرہ مجموعی طور پر دانش وذہانت کا مخالف ہو چکا ہے۔یہاں ادبی تحریکوں کے درمیان مکالمے کی حالت صفر ہے ۔میں کراچی ،لاہور ،پشاور ،کوئٹہ جاتا ہوں ۔ہر علاقہ کے اہل دانش ،ادیب ،نقاد اور قاری دوسرے کے علاقے کے بارے میں بے خبر ہیں ۔اخبارات مقامی ہو گئے ہیں ۔ان کے ادبی صفحے مقامی ہو گئے ہیں جبکہ الیکٹرانک میڈیا پر یا تو نیوز چینل ہیں یا پھر تفریحی چینل جہاں عورتوں کی پسند کے ڈراموں اور پکوان کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔اب ایسے میں جب صوبوں اور علاقوں کے درمیان مکالمہ ہی نہیں ہو رہا تو پھر افہام وتفہیم کا دروازہ کیسے کھلے گا ۔ متنازعہ امور کا کوئی حل کیسے نکلے گا۔قوم کی بازیافت کا راستہ بھی اسی طرح ہموار ہوسکتا ہے ۔میرے

خیال میں اس میں خود قوم پرستی کے علمبردار سیاسی گروپوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے جن کے ہاں تعقل، ہنر، دانش کا فقدان ہے۔ سستی جذباتیت، انانیت، خود پسندی اور نفرت بھرے نعرے ہیں اور تحقیق و تدقیق کا میدان بنجر نظر آتا ہے۔

ہم شہری: سرائیکی خطے میں مقامی آبادی کے حوالے سے اپنی شاعری کو بین الاقوامی تناظر میں دیکھنے کی کوشش ہمیں رفعت عباس کے ہاں نظر آتی ہے۔آپ نے ان پر ایک کتاب بھی لکھی اور اسی طرح اشولال کی شاعری۔ رفعت اور اشولال کی شاعری نے خطے پر اہم اثرات مرتب کیے ہیں، آپ انہیں کیسے دیکھتے ہیں؟

حفیظ خان: اشولال فقیر اور رفعت عباس کے ہاں یہ نکتہ مشترک ہے کہ دونوں نے اپنی شاعری کا آغاز اردو شاعری سے کیا۔ اشولال فقیر اشرف شعاع ہوتے تھے جبکہ رفعت عباس، غلام عباس تھے۔ انھوں نے اردو شاعری سے سرائیکی شاعری کی طرف رُخ کیا۔ دونوں عالمی ادب پر گہری دسترس رکھتے ہیں۔ خاص طور پر نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی دور میں مظلوم و محکوم قوموں کی شناخت پر استوار شعری اودبی تحریکوں پر دونوں کی نظر ہے۔ اشو اور رفعت اس خطے کے باقی شعراسے اپنے مطالعے کی وسعت اور تاریخ عالم کے شعور سے آگہی کی وجہ سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ دونوں شاعروں کو خطے میں جتنی شہرت ملی ہے اتنی کسی اور شاعر کو نہیں ملی ہے۔ رفعت اور اشو میں فرق یہ ہے کہ رفعت اساطیری حوالوں کو خطے سے نہیں بلکہ پوری دنیا سے جوڑتا ہے جبکہ اشو مقامی اساطیری حوالوں کو مقامی تناظر ہی میں استعمال کرتا ہے۔ رفعت مقامی اساطیر کو بین الاقوامی تناظر میں دیکھتا ہے۔ اشو نے اسے مقامی تناظر میں دیکھا ہے۔ ''چھیڑو ہتھ نہ مرلی'' ضیاء دور میں پھیلی بربریت، رجعت پرستی اور تاریک خیالی کے تناظر میں لکھی گئی نظموں کا مجموعہ ہے۔ لیکن دونوں میں ایک بات مشترک ہے کہ دونوں نے اپنی ابتدائی شعری روش کو ترک کر دیا ہے۔ ''عشق اللہ سئیں جا گیا'' میں رفعت کی شاعری کی سمت کی تبدیلی کے ابتدائی اشارے ملے۔ ان کی حالیہ کتاب ''مکھ آدم دا'' اس تبدیلی کے مکمل ہونے کا اشارہ دے رہی ہے۔ رفعت عباس کی شاعری آغاز میں استعمار اور بندے کے درمیان تعلق کی نشاندہی اور اس تعلق کو بدل ڈالنے پر مشتمل تھی جس میں قومی خود مختاری اور آزادی کی تحریکوں کے ساتھ جوڑ کر

مقامی صورتحال کو دیکھا جارہا تھا۔اب لگتا ہے کہ رفعت صوفی ازم کے احیاء کی طرف چلے گئے ہیں۔خدا، بندے اور کائنات کے درمیان عہد حاضر میں رشتے کی تلاش ان کی شاعری کا موضوع ہے۔رفعت کی سوچ کا دائرہ یہ ہے کہ کیسے خطے میں حملہ آور اپنی زبان اور تلوار کا نفاذ کرتے اور لوگوں کو محکوم بناتے ہیں۔ان کے پیچھے صوفی آتے جو مقامی بولی بولتے اور مقامی معاشرت اختیار کر کے اپنے فن سے لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھتے۔رفعت نے اسی تناظر کو دیکھتے ہوئے یہ کوشش کی کہ عام آدمی کی بات صوفی کے حوالے سے کی جائے جبکہ اشو اب شاعری سے کہانی کی طرف آ گیا ہے۔

ہم شہری: کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ رفعت اور اشو کے اندر یہ احساس جاگزیں ہوا ہو کہ ان کی شاعری خطے میں ابلاغ نہیں کر پا رہی۔رفعت کو پڑچھیں اتے پُھل'' اور اشو کو ''چھیڑو ہتھ نہ مرلی'' سے جو شہرت ملی، ان کی باقی کتب کا عام قاری سے اس طرح ابلاغ نہیں ہوا؟

حفیظ خان: بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔دونوں شاعروں نے جو کام کیا اس کے ادراک کیلیے جتنے باشعور قاری کی خطے میں ضرورت ہے وہ شاید سرائیکی خطے میں موجود نہیں ہے۔''بھوندی بھوئیں اُتے'' کی نظموں میں کارٹون جیسی نظم ہے اور رفعت جیسا شاعر ہی دو عالمی جنگوں کے درمیان کامک فلموں کے عروج اور چارلی چپلن جیسے کرداروں کے پیچھے ایک پوری فلاسفی کی تلاش کر سکتا ہے۔اب جہاں شاعری روایتی دوہڑوں، ٹپوں اور ایک مخصوص قسم کے ذائقے کی اسیر ہو، وہاں اس سطح کی شاعری قاری کے لیے ابلاغ کا مسئلہ تو پیدا کرے گی۔میرا خیال ہے کہ موضوعات کی یکسانیت سے بھی بور ہو کر رفعت نے اپنی سمت اور اشو نے اپنا میڈیم بدلا ہے۔رفعت آدم کے مرکزی حوالے سے خدا کا چہرہ تلاش کرنا چاہتا ہے۔خدا آج کے آدم سے کیسے متعلق ہے۔اس سے قبل وہ جو شاعری کر رہے تھے، اس کے ردعمل سے انہیں قدرے مایوسی ہوئی۔ابلاغ کے لیے شارٹ کٹ کو اختیار کیا گیا ہے۔رفعت کی کافیوں کی نئی کتاب ''مکھ آدم دا'' میں آج کے بہت سے حوالے ہیں...... جرنیل شاہی، صوبہ تحریک سب یہاں آ گیا ہے۔رفعت اجتماعی منظر نامے سے ذرا ہٹ کر خطے کے منظر نامے تک آ گیا ہے اور تخلیق میں ایسا وقت آتا رہتا ہے جب جن تک بات پہنچانا مقصود ہو ان سے ردعمل نہ ملے تو آپ اپنا ابلاغی طریق بدل لیتے ہیں۔ابلاغ کا اظہار یہ رفعت اور اشو نے تبدیل کر لیا تو یہ اچنبھے

کی بات نہیں۔

ہم شہری: سرائیکی کہانی میں چند ناموں کو چھوڑ کر کوئی گہرائی نہیں۔ سرائیکی تنقید بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ کوئی اوسط درجے کا ناول اب تک سامنے نہیں آیا اور پھر اسی اعتبار سے باشعور قاریوں کی معتدبہ تعداد بھی نظر نہیں آتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

حفیظ خان: میرے خیال میں سرائیکی خطے میں کہانی لکھنا ردعمل کے طور پر شروع ہوا۔ سطحیت زیادہ ہے۔ بیشتر کہانی کاروں کا کوئی علمی پس منظر نہیں۔ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع نہیں۔ کہانی، تنقید اور ناول میں معیار کا مسئلہ ہمارے سماج سے جڑا ہوا ہے۔ ہمارے یہاں ناخواندگی بہت ہے ابھی تک صحیح معنوں میں کوئی ایسی تحریک شروع نہیں ہو سکی جو یہاں کے باشندوں کی تاریخ سے لاتعلقی کی روش کو ختم کرنے میں معاون ہوتی۔ لاہور کئی علمی و فکری تحریکوں کا مرکز رہا۔ سندھ میں سندھی زبان وادب اور تاریخ کے حوالے سے انتھک کام ہوا۔ سندھی زبان وادب کے بڑے عالم دانشور سیاسی تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ہمارے خطے کو تا حال ایسے نابغہ دانشور میسر نہیں آ سکے جو باشعور قاری پیدا کر سکتے تاکہ کہانی، تنقید اور ناول کے میدان میں معاصر ادبی تحریکوں کے برابر کامیابی حاصل کی جا سکتی۔

O

(ہفت روزہ ''ہم شہری'' لاہور، 24/جولائی 2009ء)

انسان ماںبولی وچ ای کھل کے اظہار کر سگدا اے: حفیظ خان

انٹرویو: راحت بابر

راحت بابر: جناب حفیظ خان صاحب تُسی شاعری وی کردے او، افسانہ وی لکھدے او تے ڈراما وی۔

حفیظ خان: جی۔

راحت بابر: اینہاں وچ کیہڑی صنف اے جیہدے راہیں تُساں بہتر تے کھلا ڈلا اظہار کردے او۔

حفیظ خان: راحت صاحب، بنیادی گالھ اے ہے کہ ہک لکھن والا زیادہ آزادی نال اوں صنف وچ آپڑاں اظہار کر سگدے جیندے اُتے کہیں قسم دیاں پابندیاں بظاہر نہ لگدیاں ہوون تے میں سمجھداں اُناں وچوں جیڑھی پہلی پہلی گالھ ہے او شاعری ہے جیکوں بندہ تھوڑے وقت وچ زیادہ موثر طریقے نال آکھ سگدے۔ لیکن جتھاں تک میں سمجھداں کہ جیڑھے میں افسانے لکھن اُناں افسانیاں وچ میں آپڑیں ذات دا، تے جو کجھ میں آکھن چاہنداں، اُوندا میں بُہوں کھل کے اظہار کیتے۔

راحت بابر: افسانیاں وچ!

حفیظ خان: افسانیاں وچ۔

راحت بابر: اساں تہاڈے ڈرامیاں وچ ویکھنے آں کہ تضادات جیڑے نیں، سماجی یعنی اقتصادی، معاشرتی اور اخلاقی، اے سانوں لبھدے نیں تے ایناں دے حوالے دے نال ایں ویکھنیں آں کہ تہاڈے ڈرامے جیڑے نیں، او جدوں Conclude ہوندے نیں، تے کوئی نتیجہ سامعین نوں نیں دیندے، اُناں واسطے open رہ جاندے نیں۔ اے تسی شعوری طور تے open چھڈ دے اوڈراما؟

حفیظ خان: راحت صاحب، اوندے وچ جیڑھے ویلے میں کوئی ڈراما لکھن باہنداں۔ اوندے وچ پہلی گالہہ میں اے کریندا اں کہ جیڑھا پیغام میں ڈیون چاہنداں او میں کردار نگاری نال ڈیواں، یعنی جیڑھا کردار میں Develop کریندا اں، او خود آپڑاں اظہار کرے۔ میڈے کردار کوئی اوپرے نی ہوندے۔ او ہک عام انسان ہوندن جیویں عام انساناں وچ خوبیاں اتے خامیاں وی پایاں ویندن۔ اویں اُناں وچ وی خوبیاں تے خامیاں ڈوہائیں پایاں ویندن۔ او آپڑیں رویے نال تے آپڑیں طور طریقیاں نال، یعنی جیڑھا رویہ اوندھا آپڑیں نال ہے، آپڑیں وسیب دے لوکاں نال ہے، تے پورے معاشرے نال جیڑھا رویہ مجموعی طور پر تے رکھیندے او سارے رویے مل کے آخر وچ سُنڑن والے کوں یا جیڑھے ڈراما پڑھن والے لوک ہن، اُناں کوں خود بخود ہک نتیجہ ایسا ڈیندن جیڑھا ویسے پڑھن وچ یا سنڑن وچ واضح نی لگدا لیکن جیڑھا مجموعی تاثر ہوندے ڈرامے دا، اوندے نال او نتیجہ جیڑھا میں آکھن چاہنداں بڑا کھل کے سامنے آویندے

راحت بابر: ہوں۔ کھل کے سامنے آجاندا اے۔ تہارے ڈرامیاں وچ اک چیز ہور نوٹس کیتی جاندی اے تے او ہے نوجواناں دے مسئلے اور فیر جیندے وچ جنریشن گیپ جیڑھا اے او وی ہے۔ تسی سمجھدے او کہ نوجواناں دے مسائل جیڑے ہائین، او پورے سماج دے مسائل توں ہٹ کے نیں یا کسی طرحاں اُناں دی جڑت وچ سمجھدے او۔

حفیظ خان: راحت صاحب گالہہ اے ہے کہ جیڑھا ہک نوجوان دا مسئلہ ہے ناں، او صرف ہوندا ذاتی مسئلہ کوئی ہوندا۔ اور پورے معاشرے نال گنڈھیا ہویا ہوندے۔ مثلاً ہک نوجوان جیڑھا نواں

نواں پڑھ کے آئے تو اوکوں بہوں توقعات ہن معاشرے نال ،او توقعات کینے پورے کرن ،او توقعات یقیناً معاشرے نے پورے کرن۔

راحت بابر: درست!

حفیظ خان: تے جیڑھے ویلے اساں ہک نوجوان دے مسئلے کو ڈیڈھدے ہیں، او بنیادی طور تے ،تے اجتماعی طور تے ،او پورے معاشرے دا تاثر وی قائم کریندے کہ معاشرہ آپڑیں نوجوان افراد کیتے کتنا اہری ہے یا کتنا مخلص اے۔یعنی نوجوان معاشرے نال کیا کریندے تے معاشرہ آپڑیں نوجواناں نال کیا کریندے۔

راحت بابر: صحیح اے ۔سرائیکی ،اردو، دوواں زباناں دا تہاڈا استعمال اے ،ڈرامیاں وچ ، افسانیاں وچ ،شاعری وچ ،ایدے وچ کیڑی زبان ایسی اے ،جیہدے وچ تسی ،اظہار جیڑھا اے، زیادہ یعنی ،جینوں بھرداں کہیا جاسگدا اے پنجابی وچ کرسگدے او۔

حفیظ خان: اے تاں بہوں کھلی جئی گالہہ اے کہ انسان بنیادی طور تے اوں زبان وچ ای کھل کے اظہار کرسگدے ،جیڑھی اوندی مابولی ہووے ۔میڈی مابولی چونکہ سرائیکی اے تے یقیناً میڈا اوی خیال ہے تے جیڑھے میڈھے پڑھن والے ہن یا سُنڑن والے لوگ ہن ،اُناں دی وی ایہو خیال اے کہ میں سرائیکی وچ بہوں اکھل کے اظہار کرسکیاں۔

راحت بابر: اچھا ۔ظاہر اے کہ ایسے ای ہوندا اے ۔اک چیز ہور تہاڈرے ڈرامیاں دے حوالے نال کہ کردار نگاری تے زبان ،اے دو ہیں بہت مضبوط جاپدے نیں ۔ایدے واسطے تسی کوئی خصوصی سٹڈی (Study) کردے او پہلے ڈراما لکھن توں۔

حفیظ خان: سٹڈی تساں ایں طرحاں آکھ سگدے وے کہ میں جیڑھے ویلے گھر توں باہر نکلداں یا گھر وچ ہونداں ،تے جو کجھ میڈے اردگرد تھیندے ،میں اوکوں اوبزرو (Observe) کریندں، بڑے غور نال ،میں ڈیدھاں کہ عام بندہ جئیں ویلے گالہہ کریندے ،چاہے او آپس وچ گالہہ کریندا پیا ہووے ۔بھین بھراناں گالھ کریندے ،والدین نال گالہہ کریندے یاراں دوستاں نال گالہہ کریندے اے یا جیڑھے او لوک جنہاں نال او محبت کریندے یا نفرت کریندے ،سارے رویے

انسان وچ بیک وقت پائے ویندن، اُناں ساریاں کوں بندہ اگر بغور ڈیکھے تاں ول او لکھن وچ تے اُناں کوں پرفارمنگ آرٹ دی صورت وچ پیش کرن وچ کوئی کمی نی رہ ویندی۔ تے جتھاں تک تعلق ہے زبان دا تاں زبان وچ اے ہوندے کہ جیڑھا بندھا گالہہ کریندے۔ مثلاً ہک کردار اے، جیڑھا کہیں خاص طبقے نال تعلق رکھیندے۔ تلویں طبقے نال، درمیانے طبقے نال یا اعلیٰ طبقے نال، تاں اوندا ایک مخصوص ڈکشن تے مخصوص زبان بن تے رہ ویندی اے۔ تے اوں زبان کوں اگر اُناں کرداراں دے منہ وچوں الوایا ونجے تاں میڈے خیال وچ اُوہا زبان ای زیادہ بہتر لگدی اے۔

راحت بابر: اک میں ہور چاہواں گا گل پچھنی۔ کیوں جو تہاڈے ڈرامیاں وچ نوجواناں دے مسائل جیڑھے نیں، اُو ہک حد تئیں تے بھرویں دے طور تے نظر آ ئوندے نیں۔ تسی ساڈی آج دی سوسائٹی دے نوجوان، اودے واسطے کوئی مسیج (Message)؟

حفیظ خان: ڈیکھو۔ اوندے تے گالہہ اے ہے کہ اخلاقیات دے بغیر کوئی معاشرہ نی چل سگدا۔ بنیاد اخلاقیات ہوندی اے، اوندے بعد جتنے بئے مسائل ہن ناں، او اُوندے نال پیدا تھیندن ویسے وی ڈٹھا ونجے تاں اخلاق جیڑھا اے او کہیں معاشرے کوں بہتر طور تے چلاون کیتے تے معاشرے کو مضبوط کرن واسطے بنیادی گالہہ اے، تے میں ہمیشہ جتنے وی معاشرتی تضادات ہن، معاشرتی رویے ہن، اُناں ساریاں کوں کٹھا کر کے جیڑھا میں آخر وچ کوشش کریندا اں کہ نوجواناں کوں یا جیڑھے وی بئے کردار ہن، اُناں سب دی معاملات وچ اخلاقیات ای حاوی ہوندی اے۔

راحت بابر: خان تُسی PTV لاہور سنٹر دی دعوت تے تشریف لے کے آئے، آپڑیں خیالات دا اظہار کیتا، تہاڈا بہت بہت شکریہ۔

حفیظ خان: تہاڈی بہوں مہربانی۔

O

(پی ٹی وی پروگرام پنجاب رنگ، لاہور 22 / دسمبر 1989ء)

مختلف اخبارات و جرائد کی خصوصی اشاعتوں کے لیے

جناب حفیظ خان کے تاثرات

اردو افسانے کے سو سال

نامور افسانہ نگار حفیظ خان کی روزنامہ ''جناح'' کے ادبی ایڈیشن کے لیے خصوصی رائے

صدی کی وسعت پر محیط افسانے کے سفر کا منزل بہ منزل جائزہ لیں تو دو رویے نہایت شدت سے سامنے آتے ہیں۔ اولاً افسانے میں سے کہانی کے خاتمے کی کوشش ثانیاً معاشرتی اور زمینی حقائق سے عملاً اغماض۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ علامت کی تمام تر مرصع کاری کے باوجود کہانی اپنی بقاء کی جنگ کامیابی سے لڑتی چلی آ رہی ہے اور آنے والے دنوں میں شاید کہانی ہی افسانے کا غالب عنصر رہے۔ اسی طرح خود ساختہ اخلاقی ملمع سازی کے قلعی گروں کی سب اچھا ہے کی نعرہ بازی کے شور میں، وہ چیخیں کبھی نہ دبائی جا سکیں جو انسانی طرزِ عمل کی گٹر لائن سے باہر آتی رہتی ہیں۔ پس واضح ہوا کہ افسانہ ابھی تک منشی پریم چند کے تصویری چوکھٹے اور ترقی پسند تحریک کی ہاؤ ہو سے باہر نہیں آ سکا۔

O

(روزنامہ ''جناح'' اسلام آباد، 10 فروری 2004ء)

جدید سرائیکی ادب: محرکات، رجحانات، اثرات

نامور محقق، کہانی کار، نقاد اور ڈراما نگار حفیظ خان کی نظر میں

میں شکر گزار ہوں ''خبریں'' کا کہ اس ادارے نے معتبر دانش وروں اور علمائے ادب کی موجودگی میں مجھے بھی اس فورم میں شرکت کا موقع دیا۔ یہ موقع اس واسطے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ آج ہمارے ساتھ ڈاکٹر نصراللہ خان ناصر اور ڈاکٹر انوار احمد موجود ہیں جو اس وقت ہمارے وسیب کی دو بڑی یونیورسٹیوں کے سب سے بڑے شعبوں یعنی سرائیکی ڈیپارٹمنٹس کے سربراہ ہیں۔ جہاں تک آج کے فورم کا تعلق ہے تو جدیدیت، اپنے عمومی مفہوم میں آج کے ادب کے طور پر لی جاتی ہے۔ یعنی جو آج کا ادب ہے وہ آج سے پہلے کے ادب سے جدید ہے لیکن اپنے حقیقی معنوں میں ایسا بالکل نہیں۔ انگریزی ادب میں رفعت عباس کا ''جدیدیت'' اور ''مابعد جدیدیت'' کا حوالہ بجا طور پر بالترتیب پہلی اور دوسری عظیم جنگوں کے بعد تخلیق کیے جانے والے ادب سے ہی ہے جس نے اردو زبان وادب میں خاصے عرصے کے بعد 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں رواج پایا۔ جہاں تک سرائیکی زبان ادب کا تعلق ہے تو میرے نزدیک 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے اثرات ہی جدیدیت کی تحریک کا پہلا قدم تھے۔ یہ خواجہ فرید کے لڑکپن کا عہد تھا۔ یہی سبب ہے کہ خواجہ فرید کی شاعری اپنے سے پہلے ادوار کی نسبت یکسر مختلف، انوکھی اور اپنے عصری تقاضوں کے عین مطابق

تھی۔شدید مایوسی کے اس دور میں لوگوں میں پھر سے زندگی سے جڑنا ہی شاعری کا تقاضا تھا جو جدیدیت کی بنیاد بنا۔اس شاعری نے تحریک پاکستان کو وسیب کے عوام کے لیے بھی بنیادی انسانی حقوق، شخصی آزادی اور اپنی شعوری پہچان جیسی امنگوں کی برآوری کی تحریک بنا دیا اور اسی جذبے کے تحت ہی ریاست بہاولپور کی پاکستان میں شمولیت ممکن ہوئی۔مگر اس دوران عوامی منشاء کے خلاف ریاست میں غیر متوازن آبادکاری، ایک ان دیکھی مزاحمت کا نکتہ آغاز بنی اور اس کے مقامی محرکات سے قطع نظر، اس نے اخلاقی حمایت کے واسطے خود کو برصغیر کے ادبی محاذ پر برپا ''ترقی پسند تحریک'' سے بھی جوڑنے کی کوشش کی جس کے سرخیل نقوی احمد پوری تھے۔ڈاکٹر ناصر نے سرائیکی ادب میں جدیدیت کے آغاز کا نکتہ عروج ون یونٹ کے قیام کو قرار دیا ہے مگر میں اس سے متفق نہیں۔خطے کے لوگوں کی امیدیں ون یونٹ کے قیام سے نہیں ٹوٹی تھی بلکہ اس کے خاتمے کے طریقہ کار میں رکھی جانے والی زیادتی کے سبب ٹوٹی تھیں کہ جہاں ریاست بہاولپور کو صوبائی حیثیت میں بحال کرنے کے بجائے پنجاب میں ضم کر دیا گیا۔ہاں، سندھی بھائیوں نے ون یونٹ کے قیام کو اپنے ادب میں جدیدیت کے واسطے استعمال کیا کہ جہاں محض ایک صوبے کی اکثریت کو کچلنے کے لیے بقیہ چار صوبوں کو ان کی شناخت سے محروم کرنے کے بعد اس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا مگر عددی برابری پھر بھی ممکن نہ ہوئی۔

اس طرح میرے نزدیک سرائیکی زبان وادب میں جدیدیت کی ایک توانا متحرک اور بھرپور شکل 1969ء میں ون یونٹ کے ٹوٹنے اور 1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے صدمات کے بعد سامنے آئی۔بظاہر ہزیمت اور مایوسی کا یہ وہ دور ہے کہ جب فکری معنوں میں جدید سرائیکی افسانہ، ڈراما اور انشائیہ لکھا جانا شروع ہوا۔خود میں نے 1971ء میں افسانہ لکھنا شروع کیا۔احسن واگھہ، عامر فہیم، حبیب فائق، مسرت کلانچوی اور بتول رحمانی اسی دور کے کہانی کار ہیں۔شاعری میں یہ دور ردِ تصوف کا دور ہے کہ جس میں نصر اللہ خان اور ارشاد تونسوی کی شاعری سامنے آئی۔لوگ حجروں سے نکل کر عملی زندگی میں آنا چاہتے تھے کہ جہاں زندگی اور اس کے تقاضے ایک نئی روانی کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھے۔لہذا اس کے چند برس بعد ہی 1980ء کی دہائی میں اسی شاعری نے خود اپنے

ردعمل میں ایک اور کروٹ لی کہ جس میں رفعت عباس اور اشولال سامنے آئے۔انھوں نے تصوف کی راسخ شدہ بے عملیت کی تطہیر کے ذریعے آج کے عہد میں تصوف کی اصل اور عملی صورت کو فروغ دینے کی سعی کی۔اسلم جاوید ،عابد عمیق، حسن رضا گردیزی اور ممتاز حیدر ڈاہراس دور کے اہم نام ہیں۔سرائیکی ادب میں جدیدیت فارمیٹ سے زیادہ Content میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ہیئت کے تجربات نظم سے زیادہ نثر میں کیے گئے۔میرے نزدیک ہمارے ہاں مابعد جدیدیت کا دور ابھی ان معنوں میں سامنے نہیں آیا جیسا کہ انگریزی ادب میں مروج رہا ہے۔جہاں تک جدید سرائیکی ادب کے اثرات کا تعلق ہے تو وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔آج ہمیں جو بھی حقوق حاصل ہیں وہ انہی جدید ادبی رجحانات کی دین ہیں۔وگرنہ سرائیکی خطے کی سیاسی شناخت تو ابھی اس فیز میں بھی داخل نہیں ہوئی کہ جہاں پر ہمارا ادب 1960ء کی دہائی کے آخری برسوں میں تھا۔

O

(روزنامہ خبریں ملتان، 11 اگست 2006ء)

نوٹ:اس فورم کے دیگر شرکاء میں ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر نصراللہ خان ناصر، رفعت عباس، عاشق بزدار، اشولال، جاوید چانڈیو، شمیم عارف قریشی، قاسم سیال، عبداللطیف بھٹی، ظہور احمد دھریجہ، علی تنہا اور منور جمیل قریشی شامل تھے۔(مرتب)

سرائیکی خطے کے تاریخی مقامات کی معدومیت، خدشات وتحفظات

روزنامہ ''خبریں'' کے ادبی اڈیشن ''وسیب سنگ'' کے لیے حفیظ خان کی رائے

سرائیکی خطے میں ہزاروں برس کی حملہ آوری، غاصبیت اور غلام گردی کی طویل تاریخ کے حقیقی ابواب، اب ایسے بھی ڈھکے چھپے نہیں رہے۔ میرے نزدیک یہ وہ المیہ ہے جو ہلاکت خیزی اور تباہی وبربادی کے اعتبار سے اتنے تسلسل اور اتنے وسیع پیمانے پر دنیا کے کسی بھی خطے یا کسی بھی تہذیبی اکائی کے ساتھ کبھی بھی روا نہیں رکھا گیا۔ اگرچہ بیرونی حملہ آوروں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ حملہ آوری اور غلام گردی کے شکار خطے کی تہذیبی اور ثقافتی شناخت کو کسی بھی طور باقی رکھنا چاہیں گے ایسا ہی ہے۔ لیکن سرائیکی خطے میں عہد درعہد تباہی و بربادی کی نئی حکایات کا رقم کیا جانا جہاں اس خطے کی بھرپور مزاحمتی توانائی کو ظاہر کرتا ہے وہیں اس امر کی گواہی بھی دیتا ہے کہ یہاں کی تہذیب وثقافت اپنے قومی اور غالب اثرات کے سبب حملہ آوروں کی تہذیب وثقافت کے لیے خطرہ گردانی جاتی رہی ہوگی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر عہد کے حملہ آور نے سب سے پہلے یہاں کے دانشوروں کے قتلام کے ساتھ ساتھ ان تمام عمارتوں اور ذخیرہ کتب کو نذر آتش کرنے کی کوشش کی جو کسی طور پر بھی اس کی حملہ آوری کے قبل کے دور کے واسطے ''حافظہ'' کا کام دے سکتی تھیں۔

ہر غاصب یہی چاہتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے سے قبل کے ادوار اور ان سے جڑی ہوئی تمام علامتوں کو کھوج کر مٹا دے، جلا کر راکھ کر دے۔ خون ریزی کے اس عمل میں غاصبیت کے بوجھ تلے کراہتی

رعیت کی زبان، ادب، لسانی وادبی اصطلاحات، نصاب، نصابی اشارے، ثقافتی رویے، اہل حرفت کے ہنر کا ثقافتی رچاؤ اور تہذیب، عسکری و مذہبی اہمیت کی حامل عمارتیں ہی سب سے پہلا نشانہ ہوتی رہی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سرائیکی خطے میں اس طور ایک عہد کے آثار ہائے قدیم کو اس کے بعد کے ادوار میں مٹائے جانے کے عمل میں ''عمل انگیز'' سمت بدلتے رہے ہیں۔ یعنی کبھی لسانی، کبھی نسلی اور کبھی مذہبی وغیرہ۔ اس طرح ان عمل انگریز عوامل کی بوقلمونی کے سبب تباہی و بربادی کا گھیر بھی وسیع تر ہوتا چلا گیا۔

ہاں ایک اور اہم بات۔ اپنے سے پہلے کی لسانی و نسلی وحدت کی تمام نشانیوں کو بے دریغ مٹا دینے اور اپنے سے پہلے مذاہب کی ہر نوع کی عمارت کو ''آج کے مذہبی عقائد'' کے منافی سمجھ کر ملبے کا ڈھیر بنا دینا جہاں حملہ آوری کا مشن رہا ہے وہیں اس خطے کے اپنے لوگ بھی ''حملہ آوروں کے اثرات'' تلے پرورش پانے کے بعد مختلف مواقعوں پر کم وبیش اسی رویے کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرائیکی خطہ میں آثار قدیمہ کا وجود قابل ذکر حد تک باقی نہیں رہا اور کچھ بچا کھچا اثاثہ کہیں دکھائی بھی دیتا ہے تو ہماری اپنی عدم توجہی کا شکار اور درماندگی کی داستان سناتا ہوا کیونکہ جو لوگ سرائیکی خطے کو اون Own نہیں کرتے ان کے واسطے یہ سب کچھ فضولیات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور جو لوگ اس خطے کو اپنی زبان وثقافت کے تئیں اپنا سمجھتے بھی ہیں تو ان کے واسطے یہ آثار محض ''کفر'' کی نشانیاں ہیں اور اس سے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہر دو صورتوں میں ہم بہر طور ان کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیونکہ نہ تو ہمیں ان کی ضرورت اور نہ ہی ہم اپنی ہزارہا برس کی تاریخ سے کوئی ناطہ جوڑنا چاہتے ہیں۔ شاید ہم یہ حقیقت بھلا بیٹھے ہیں کہ قومیں اپنے ''آج'' سے علیحدہ ہو کر تو زندہ رہ سکتی ہیں مگر ''گزرے کل'' سے قطع تعلق کرنے کے بعد نہیں۔

لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ سرائیکی خطے کے باسی جب تلک ذہنی طور پر اپنے گزرے ہوئے کل کو اپنا ''قومی ورثہ'' تسلیم نہیں کرتے یہاں کچھ بھی باقی رہنے والا نہیں۔

O

(روزنامہ خبریں ملتان، 28 نومبر 2008ء)

نوٹ: اس فورم کے دیگر شرکاء میں اشولال، رفعت عباس، شمیم عارف قریشی، جاوید اختر بھٹی، ظہور احمد دھریجہ، مجاہد جتوئی، عامر حسینی، ظفر اقبال لُنڈ، ڈاکٹر اسلم عزیز درانی، جہانگیر مخلص اور مختیار علی سید شامل تھے۔ (مرتب)

عصر حاضر میں کلام فرید کی معنویت

مہان سرائیکی صوفی شاعر خواجہ غلام فرید کے 168 ویں جنم دن کے حوالے سے روز نامہ "جنگ" کے زیر اہتمام خصوصی مکالمہ میں حفیظ خان کی گفتگو

جب کسی خطے کے باسی اپنے کسی شاعر کی مہانتا میں اپنے دکھ سکھ تلاشنا اور اس کی کہی کو اپنی کتھارسس کا وسیلہ سمجھنا طے کر لیتے ہیں تو اس خطے میں ایک عظیم شاعر کا معنوی جنم وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اور جب اس شاعر کے افکار بلا امتیاز رنگ و نسل، مذہب، زبان اور تہذیب و ثقافت دنیا کے مختلف خطوں میں رہنے والوں کو محض انسانیت کی اساس پر اپنے فکری تسلسل اور شخصی تشکیلات کی بُنت میں ظاہر و پنہاں دکھائے دینے لگتے ہیں تو پھر ایک آفاقی شاعر اپنی تمام تر ابلاغی کرشمہ سازی کے ساتھ ظہور میں آتا ہے جب کہ خواجہ غلام فرید (1845-1901ء) کے بارے میں نہ صرف عقدہ کشا دانشور بلکہ نکتہ بیاں نقاد بھی ان کی عظمت اور آفاقیت کے بارے میں کوئی دوسری رائے نہیں رکھتے۔ لیکن "خواجہ غلام فرید" کو "یار فرید" کا آفاقی منصب عطا ہونا نہ تو کسی کی دانشوری کا محتاج رہا ہے اور نہ ہی نقاد حضرات کی "جے جے" یا "ہاہا کار" کا۔ یہ عوامی رتبہ نہ تو کسی "گدی" سے وابستہ ارادت مندی کا پرتو رہا ہے اور نہ ہی کسی والی ریاست کی سیادت و سعادت سے منسوب کوئی شاہی فرمان۔ کیونکہ اگر خواجہ صاحب کی شہرت کے پس منظر میں ایسی ہی کوئی لابنگ کارفرما رہی ہوتی تو ان کا دیوان یوں ان کی وفات کے 44 برس بعد ساہیوال جیل میں مقید صحافی دیوان سنگھ مفتون کے نواب بہاولپور کے نام مکتوب کے نتیجے میں شائع ہونے کا منتظر نہ رہتا کہ جس نے جیل کے ایک دوسرے قیدی کی زبانی یہ کلام سنا اور اسے اپنی روح میں اترتا ہوا محسوس کیا۔

یہ خواجہ کے کلام کی ہمہ گیر اثر آفرینی اور زمانے کی دست برد سے ماورا معنویت کا اعجاز ہے کہ ہزاروں برس سے بیرونی حملہ آوری کے روندے ہوئے سرائیکی خطے کو نہ صرف شناخت ملی بلکہ یہاں کے باسیوں کو ایک ڈھارس، امید اور نئے سرے سے عالمی سطح پر جرٔت کے ساتھ زندگی کرنے کا ولولہ عطا ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خواجہ فرید نے جس عہد میں طبعی جنم لیا اور جس صدی کے آغاز ہیں میں یہاں سے کوچ کیا، یعنی انیسویں صدی عیسوی کا دوسرا نصف اور بیسویں صدی کا مکمل سفر کہ جو ارتقائی مدارج کے بعد اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے کو طے کیا چاہتا ہے، اپنی سیاسی وسماجی تشکیل نو، انقلابی سائنسی تحقیقات، چاند ستاروں تک انسان کی رسائی، مواصلاتی معجزات، فلسفہ، فنون لطیفہ اور اخلاقی اقتدار کی نو تعین شدہ تعریفات اور مذاہب عالم کے درمیان تناؤ کی انتہا کے بعد مکالمے کی روایات کے احیا سے عبارت ہے۔ قریباً ڈیڑھ سو برس کے اس عرصے میں جس قدر تغیرات اور ارتقا کا سامنا نسل انسانی کو رہا ہے، وہ اس کی تخلیق کے بعد تمام تر عرصے پر ہر لحاظ سے حاوی دکھائی دیتا ہے۔ سب کچھ بدل کر رہ گیا ہے۔ اور اگر کچھ نہیں بدلا تو وہ سرائیکی زبان کے آفاقی شاعر خواجہ فرید کے کلام کی معنی آفرینی ہے جو کہ آج کے انسان کے قلب وذہن پر اسی طرح اپنے نقش ثبت کیے ہوئے ہے کہ جیسے اپنی تخلیق کے زمانے میں۔

میں اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا. کہ آج کے انسان کو عصر حاضر کے معروضی تقاضوں کے پس منظر میں کلام فرید کی تفہیم کی طرف آنا چاہیے بلکہ میں تو اس ایقان پر کار بند ہوں کہ آفاقی کلام اور فکری پیغام جس طرح اپنے تخلیقی یا اولین ابلاغ کے عہد میں انواع قسم کے خطوں میں ان کی لسانیات اور ثقافت سے قطع نظر ایک جیسے اثرات رکھتے ہیں، اسی طرح بدلتے زمانوں میں اپنی معنویت کے اعتبار سے نئی تفہیمات کے محتاج نہیں ہوتے۔ خواجہ فرید نے اظہار ذات کے واسطے اپنی خانقاہی اقدار اور اشرافیہ کی زبان سے بغاوت کرتے ہوئے عام لوکائی کی زبان کو شاعری کا وسیلہ بنایا اور اس کے ردعمل میں اپنے طبقے کی مزاحمت اور نفرت کا سامنا کیا۔ مگر اس کے بدل میں جو محبت انہیں اس خطے کے درماندہ لوگوں سے ملی، اس کی جہتیں ہی ان کی شاعری کا موضوع ہیں کہ ہزاروں برس کے بعد بھی نہ تو ان کی تاثیر میں کسی کمی کا اندیشہ ہے اور نہ ہی معنویت میں کسی ابہام کا۔

O

(روزنامہ جنگ ملتان، جمعتہ المبارک 25 نومبر 2008ء)

گفتگو کے دیگر شرکاء: رفعت عباس، ڈاکٹر نصر اللہ خان ناصر، جاوید چانڈیو، جاوید اختر بھٹی، شمیم عارف قریشی، اقبال سوکڑی، ڈاکٹر مزمل حسین، سلیم شہزاد، ذیشان اظہر اور طارق گجر (مرتب)

خواجہ فرید کا یومِ وصال کب منایا جائے؟

24 / جولائی کو آپ کا یوم وصال منانے کے حوالے سے نام ور دانشوروں سے مکالمہ

میرے نزدیک یہ ایک بے معنی بحث ہے کہ خواجہ فریدؒ کا یوم وصال شمسی کیلیڈر کے مطابق منایا جائے یا قمری کے مطابق۔ کیوں کہ کسی بھی لیجنڈری شخصیت کا دن صرف اور صرف اس لیے منایا جاتا ہے کہ اس کے افکار کی یاد آوری اور ترویج ہو یا یوں کہہ لیں کہ ایک مخصوص فکری سمت کی نشان دہی اور کھوج کا جو ورثہ اس شخصیت نے اپنے علمی ترکے میں چھوڑا، اسے بعد کے زمانوں اور نسلوں میں کس موثر طریقے سے منتقل کیا جا سکے۔ ظاہر ہے یہ Transaction نہ تو کسی مخصوص یوم کی محتاج ہوتی ہے اور نہ ہی کسی مخصوص تقویم کی۔ اسی طرح میرے نزدیک شمسی اور قمری کیلنڈر کی ایک دوسرے پر مذہبی لحاظ سے ترجیح اور برتری کی بحث بھی ''کوا حلال ہے کہ حرام'' کی اس بحث جیسی ہے کہ جو بغداد میں تاتاریوں کے حملے کے وقت جاری تھی۔ ارے صاحبو! اس حقیقت کو کیوں بھلا دیا جاتا ہے کہ شمس وقمر اسلام میں ہیں نہ کہ اسلام شمس وقمر میں اور یہاں یہ بات بھی خاصیت سے پیش نظر رہنی چاہئے کہ متذکرہ دونوں کیلنڈر محض شب و روز کی گنتی کے واسطے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ویسے بھی خالق کائنات کے تخلیق کردہ نظام شمسی میں شمس یعنی سورج کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جس کے سبب زمین اس کے گرد گھومتی ہے اور قمر یعنی چاند زمین کے گرد طواف کرتا رہتا ہے۔ اگر دونوں کی گردش کا سال

جمع کریں تو چاند ہر سال قریباً 10 دن اور زمین چار برس کے بعد ایک دن اس فطری نظام سے پیچھے رہ جاتے ہیں جو میرے رب نے موسموں کی جمع تفریق کے لحاظ سے ترتیب دے کر صرف مخصوص موسموں میں مخصوص دانوں کے خاک میں ملنے اور گل وگلزار ہونے کے زمانوں کی بنیاد پر قائم کر رکھا ہے۔ شمسی نظام میں تو چار برسوں کے بعد فروری کا ایک دن بڑھا کر سال کی "مقدار" پوری کر لی جاتی ہے مگر قمری کیلنڈر میں ایسا کوئی "بندوبست" اب تک نہیں کیا جاسکا۔ لہٰذا اگر ایام کی ترتیب قمری طور پر منائی جائے تو "شمس" کی مرکزیت کے لحاظ سے نہ تو سال مکمل ہو پاتا ہے اور نہ ہی ان موسموں اور رتوں کی خوشبو کو محسوس کیا جاسکتا ہے کہ جن میں وہ یاد کیا جانیوالا واقعہ ظہور پذیر ہوا تھا۔ جس طرح شگوفے کسی مخصوص موسم میں کھلتے ہیں، اسی طرح پھولوں میں خوشبو اور پھلوں میں شیرینی اور رس کا پیدا ہونا بھی مخصوص رتوں کی آمد کا منتظر ہوتا ہے۔ میرے نزدیک خواجہ فریدؒ جیسی آفاقی شخصیت کے افکار کی ترویج اور ان میں موجود تصوف کی شیرینی اور وحدت الوجود کی خوشبو کو ابلاغی لحاظ سے کچھ اور بھی اثر آفریں کیا جاسکتا ہے کہ اگر ان سے منسوب ایامؒ اپنے وقوع پذیر ہونے کے موسموں کے رنگوں میں رنگے ہوں، انہی کی خوشبو میں مہکے ہوں کیوں کہ ان کے یوم وصال 24 جولائی نے ہمیشہ ساون کی پہلی دہائی کے خاتمے پر ہی آنا ہے، یہ نہیں کہ کبھی سردیوں کی شدت میں اور کبھی بہار اور کبھی خزاں کے عروج کے دنوں میں۔

O

(مطبوعہ سپیشل ایڈیشن بیاد خواجہ فریدؒ، روزنامہ جنگ، ملتان 24/جولائی 2008ء)

ماں بولی سے گریز، اقوامِ متحدہ کی قرارداد سے انحراف

حفیظ خان

''ماں بولی سے گریز کی دو صورتیں ہوتی ہیں؛ پہلی تو یہ کہ کسی بھی مخصوص جغرافیائی خطے کی ثقافت و سیادت پر قابض حاکم قوتیں، اُس خطے کی لوکائی کو اُن کی ماں بولی کے خلاف عمل میں لائے گئے ضابطوں کے نتیجے میں احساسِ کمتری اور نہ دکھائی دینے والی شرمندگی میں مبتلا کر دیں؛ اور دوسری یہ کہ اس احساسِ کمتری و شرمندگی اِس قدر راسخ کر دیا جائے کہ اُس ماں بولی کے بولنے والے لاشعوری طور پر خود ہی اپنی زبان سے گریز پر مجبور ہو جائیں۔ پاکستان کے ساتھ ساتھ دنیا کے بیشتر خطوں میں کہ جو ایک طویل عرصے تک بیرونی حملہ آوری اور کالونی گیری کا شکار رہے ہیں، وہاں کے لوکائی کی ماں بولیاں، گریز کی اِس دوسری منزل میں پہنچ چکی ہیں کہ جس کے بعد یہ بولیاں فنا کے گھاٹ اترنا شروع ہو جاتی ہیں۔ بدقسمتی سے ملک عزیز کے تین صوبے پنجاب، سرحد اور بلوچستان اپنے خطے کے عوام کی ماں بولیوں کے حوالے سے اسی گریز کا شکار چلے آ رہے ہیں۔ اِن میں پنجاب کے لوکائی کی محرومی یقیناً بدترین ہے کہ جہاں ابھی تک مادری زبان میں پرائمری تعلیم کا حق عملی طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکا۔ بلکہ اِس صوبے کے ساکنان چاہے پنجابی بولنے والے ہوں یا سرائیکی، دونوں اپنی ماں بولیوں کے تہذیبی حوالوں سے شدید ترین شرمندگی میں مبتلا کر دیے گئے ہیں۔ یہ احساس

کمتری اس قدر زیادہ اور منفی لحاظ سے اتنا پُر اثر ہے کہ اِس صوبے کے اہالیان اپنی ماں بولیوں میں لکھنا، پڑھنا اور بولنا ماسوائے شرمندگی کے، اور کچھ نہیں سمجھتے۔ الیکٹرانک میڈیا کے دور میں داخل ہو جانے کے باوجود پنجابی اور سرائیکی ٹی وی چینلز کا دیکھا جانا، ان زبانوں کے اخبارات کی تعداد اور اُن کا پڑھا جانا اور اِن زبانوں کے ادبی ورثے کی حیثیت اور ادبی شخصیات کے مقام و مرتبے کے تعین اور Recognition کا نہ ہونا اپنی اپنی جگہ ایک علیحدہ مطالعے کے موضوعات سہی، مگر حاکم زبانوں کا اِن سے قصداً اغماض اور دھتکارے جانے کا عمل، ماں بولیوں سے گریز کی عملی اور بدترین استحصالی حالت کو آشکار کرتا ہے، جو نہایت سرعت سے ہمارے روزمرہ کے معمولات اور اختلاط میں درآئی ہے۔ گوکہ بنگلا دیش میں لسانی طور روا رکھے جانے والے سلوک کے بعد اقوامِ متحدہ نے ایک قرارداد کی صورت ماں بولیوں کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اُسے اجاگر کرنے کی سعی بھی کی، مگر یہ کوشش کبھی بھی ''ماں بولی کا عالمی دن'' منانے سے زیادہ نہیں بڑھ پائی۔

ماں بولی سے گریز، اگر اقوامِ متحدہ کی قرارداد سے انحراف ہے تو اِس کا ماں بولیوں کو کیا فائدہ کہ کئی دیگر عالمی مسائل پر قراردادوں کی الماریاں بھری پڑی ہیں۔ اِس کی اہمیت تو تب ہے کہ کوئی ایسی حکمت عملی طے پائے جس سے اِن ماں بولیوں کے استحصال سے نجات کی کوئی صورت نکلے۔ مگر یہ اُس وقت تک ممکن نہیں کہ جب تک اِن زبانوں کے بولنے والے اپنے اِس تشخص کو کسی بھی قسم کی شرمندگی کے بغیر پھر سے اپنے قومی تشخص کا حصہ عملی طور تسلیم نہیں کر لیتے۔ قومی تشخص کی تشکیل میں ماں بولی کے کردار کی اہمیت کے بارے میں جاننا مطلوب ہو تو اِس کا اندازہ وسط ایشیاء سے صدیوں تک جتھوں کی صورت وادیءِ سندھ میں کے میدانوں میں اترنے والے آریائی باشندوں کے قومی تشخص کے صفحۂ ہستی سے مٹ جانے کے عمل سے لگایا جا سکتا ہے جو یہاں کی مقامی عورتوں سے شادی کرتے وقت اِس امر کو بھلا بیٹھے کہ اپنی رگوں میں آریائی خون کی آمیزش کے باوجود اُن کی آنے والی نسل نے زبان تو اپنی مقامی دراوڑی ماں ہی کی سیکھنی ہے۔ ماں بولی کی زندہ اثر انگیزی کا بظاہر دکھائی نہ دینے والا یہی وہ فیصلہ کن کردار تھا کہ جس نے صدیوں کی حملہ آوری کے باوجود ایک مفتوح قوم کے تشخص کو جہاں حیاتِ دوام بخش دی وہیں ایک حملہ آور تہذیب کا نہ صرف پنپنا ناممکن بنا

دیا بلکہ اُسے فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ قومی تشخص کی جانچ پرکھ کرتے ہوئے ہم عموماً چہرے مہرے، ناک نقشے، نشست و برخواست، لباس اور پہناوے کی تراش خراش کو کریدتے رہتے ہیں۔ جب کہ قومی تشخص کی رمز تو اُس ماں بولی میں پنہاں ہوتی ہے کہ جس میں اُس قوم کے افراد نے لوریاں سنی ہوتی ہیں، جس زبان کی نغمگی میں اُس قوم کے شاعروں نے شعر کہے ہوتے ہیں، جس زبان کے رنگوں میں اُس قوم کی دھرتی نے پھول کھلائے ہوتے ہیں یا جس زبان کے فکری لہجے میں اُس قوم کے دانشوروں نے اپنی آئندہ نسلوں کے لیے بقاء کی راہیں متعین کی ہوتی ہیں۔ دنیا کی اقوام میں کیا کسی قوم کا تشخص اُس کی ماں بولی سے ماورا، یا اُس سے گریز کیے بغیر ہو سکتا ہے...... ہرگز نہیں۔

O

(13رفروری 2008ء)

ماں بولی کے عالمی دن کے حوالے سے روزنامہ ''جنگ'' ملتان کے ایڈیشن میں شائع ہوا۔

سرائیکی قومیت

حفیظ خان

میرے نزدیک وسیبی مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ سرائیکی قومیت کی تفہیم نو کا ہے۔ کیونکہ علیحدہ صوبے سمیت جتنے بھی مسائل اِس وقت وسیب کو درپیش ہیں، وہ اِسی سے جڑے ہوئے ہیں۔ سرائیکی قومیت کی تعریف اگر چہ ہمارے قوم پرست دوستوں کے نزدیک محض لسانی تشخص پر استوار ہے۔ جب کہ قوم پرستی اپنے تاریخی تناظر میں کبھی بھی مستقل طور پر کسی ایک شناخت کی محتاج نہیں رہی۔ کیونکہ اپنا آپ ظاہر کرنے کے لیے کسی قومیت کا مختلف ادوار میں مذہب، جغرافیائی حدود، زبان اور نسلی امتیاز سمیت دیگر شناختوں کا اپناتے رہنا کچھ ایسا بھی خلاف عقل یا خلاف فطرت نہیں۔ کسی مخصوص شناخت کے حوالے سے پہچانے جانے والی قوم کا قوم پرستی کے واسطے اپنی عملی اساس کو بدل لینا، ہمیشہ سے اُس دور کے حالات کی معروضیت سے منسلک رہا ہے۔ قومیت کی تاریخ میں اِس فطری تقاضے کی عمل انگیزی اور بھی بڑھ جاتی ہے اگر وہ خطہ ماضی میں وسیع پیمانے پر مہاجرت اور اُس کے نتیجے میں ہونے والی آبادکاری کا شکار ہو کر کثیر اللسانی (multilingual) ہو چکا ہو۔ لہٰذا آج کے عہد میں کہ جب سرائیکی خطے میں آباد ہونے والے ہریانوی، پنجابی اور اردو سپیکنگ مہاجروں کی تیسری نسل جوان ہو کر زندگی کے ہر شعبے میں آبادی کے اہم تناسب (Demographic complexion) کے ساتھ موجود ہے، اُنہیں نظر انداز کرنے کی بجائے

اُن کا اعتبار حاصل کرنے کی ضرورت ہے، انہیں اعتبار دینے کی ضرورت ہے تا کہ وہ وسیب میں اپنے آپ کو محفوظ و مامون سمجھنے کے ساتھ ساتھ سرائیکی وسیب کی جغرافیائی شناخت کے حوالے سے بھی اپنے آپ کو سرائیکی قومیت کا حصہ سمجھ کر اُن مسائل سے نبرد آزما ہوں کہ جن سے اب تک وہ صرف اس وجہ سے اغماض برتتے رہے ہیں کہ وہ محض سرائیکی بولنے والی آبادی کا مقدر ہیں۔ حالانکہ انٹری ٹیسٹ کا عذاب ہو یا پسماندگی کے دیگر پھندے، وہ صرف سرائیکی بولنے والوں کے لیے نہیں بلکہ سرائیکی وسیب کے تمام باشندوں کے لیے ایک جیسے ہیں۔ میڈیکل ہو یا انجینئرنگ، انٹری ٹیسٹ کے نتائج پر میں نے صرف سرائیکی بولنے والے والدین کو آنسو بہاتے نہیں دیکھا بلکہ ہریانوی، پنجابی اور اردو بولنے والے بھی محض وسیب کے رہائشی ہونے کے سبب اِس عذاب کا شکار ہو کر سراپا احتجاج ہیں۔ تو ایسے میں جب یہاں کی تمام آبادی، چاہے وہ جو بھی زبان بولتی ہو، اُس کے دکھ سکھ اور مستقبل کے خدشات سانجھے ہیں، تو پھر زبان کی بجائے، وسیبی جغرافیے کی بنیاد پر نہ تو انہیں ''سرائیکی'' کہلائے جانے پر معترض ہونا چاہئے اور نہ ہی ہمیں انہیں ''سرائیکی''، تسلیم کر لینے میں کسی تامل کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ سرائیکی قومیت کی اِس تفہیم سے سرائیکی وسیب مضبوط ہوگا، کمزور نہیں۔ کیونکہ ہم جو آج کے سرائیکی ہیں، ہمارے اجداد کی اکثریت بھی اِسی پراسس (process) سے گذر کر سرائیکی قومیت اور اُس کے بطن سے جنم لینے والی قوم پرستی کا حصہ بنتی رہی ہے۔ ہمیں جان لینا چاہئے کہ معلومات کے سیلاب کے اِس عہد میں حقائق کا سامنا کرنے سے گریز اُن تاریخی غلطیوں کو جنم دیتا ہے کہ جن کا ازالہ ممکن نہیں ہوتا۔ اِسی لیے میرے نزدیک قوم پرستی کو حقائق پر استوار ہونا چاہئے، کسی ناسٹیلجیا یا جذباتیت پر نہیں۔ مذہبی قوم پرستی اور دوقومی نظریہ پر بننے والا مشرقی پاکستان محض 23 برس بعد لسانی قومیت کی بنیاد پر بنگلہ دیش بن سکتا ہے، مہاجرت کی شناخت پر ڈیڑھ اینٹ کی صورت بننے والی مہاجر قومی موومنٹ، اپنی اس شناخت سے جان چھڑوانے کے لیے متحدہ قومی موومنٹ بن کر main stream میں شامل ہو سکتی ہے تو پھر ہم سرائیکی قومیت کی تقویت اور وسعت کے لیے، اِس کی تفہیم نو سے کیوں گریزاں ہیں۔

O

(روزنامہ ''خبریں'' ملتان، 6/اکتوبر 2009ء)

دہشت گردی کی روک تھام میں وسیبی ثقافتی شعور کا کردار

حفیظ خان

انتہاپسندی کی انتہائی صورت کو دہشت گردی کہا جاتا ہے کہ جو دلیل اور منطق کے نہ ہونے یا اِن کی ناکامی سے وجود میں آتی ہے۔ سادہ لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب کوئی شخص یا کوئی اقلیتی گروہ اپنی رائے یا رضا کو کسی اکثریت پر دلیل سے منوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو وہ بربریت، کشت وخون، جبر اور خوف کے ذریعے مسلط کرنے اور تھوپنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس لیے اِس عمل یا کوشش کو دہشت گردی کہتے ہیں۔ جب کہ کسی بھی خطے کی ثقافت ایسے فطری توازن کا نام ہے کہ جو صدیوں کے ارتقاء کے نتیجے میں اُس خطے کے باسیوں کے عمومی مزاج، سماجی رویوں، باہمی میل جول و اختلاط، آب و ہوا اور موسموں کو منعکس کرتا ہے۔ دہشت گردی اوپر سے مسلط کی جاتی ہے جب کہ ثقافت خطے کی دھرتی سے پھوٹتی، اُس کے ہواؤں میں سانس لیتی، اُس کے موسموں سے اپنے آپ کو رنگتی اور اُس کے آسمانوں سے پیار کے بندھن باندھتی رہتی ہے۔ ثقافت نہ تو مانگے تانگے سے ملتی اور نہ ہی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے عطا ہوتی ہے۔ ثقافت کے اپنے ضابطے اور اپنے اصول ہوتے ہیں جو کہ کسی ایک انسان کی منشا سے نہیں بلکہ پورے خطے کے باسیوں کے اجتماعی آدرشوں اور اُن کی فطرت سے موزونیت (compatibility) کے سبب وجود میں آتے ہیں۔

لہٰذا کسی بھی خطے کی ثقافت نہ تو حکومتی ردو بدل اور سیاسی تبدیلیوں کو خاطر میں لاتی ہے اور نہ ہی جبر کے ذریعے نافذ کیے گئے ہمہ قسم سماجی نظام ہائے متشکلہ کو۔ کسی خطے کی ثقافت تو اُس کے باسیوں کے لہو میں دوڑتی اور اُن کے انگ انگ میں ناچتی ہے۔ ثقافت نہ صرف فنون لطیفہ کی صورت لوکائی کے دکھ سکھ کا بے ساختہ اظہاریہ ہے بلکہ وہاں کے چرند پرند، نباتات وحیوانات اور موسموں تک کا عملی اور موثر بیانیہ ہے۔ جب کہ دہشت گردی ساختہ جبر اور نافذہ بندشوں سے عبارت ہے۔ لیکن کیا کیجیے بدقسمتی سے ہمارے ہاں ثقافت کو کبھی مذہب اور کبھی ریاست سے متصادم قرار دے کر وسیبی معاشرت کو اُس فطری توازن سے محروم کر دیا گیا کہ جو رعیت اور حاکموں یا حاکم نما یک رخی سوچ رکھنے والے پریشر گروپوں کے مابین صدیوں سے شاک ابزاربر (Shock absorber) کا کام کرتا چلا آ رہا تھا۔ انسانوں کی آزادانہ سوچ جیسے بنیادی حق کی جکڑ بندی کے واسطے اختیار کیے گئے مختلف حربے دراصل غلامی کے ادارے کا تسلسل ہی ہیں کہ جہاں ثقافتی سرگرمیوں کی بندش کے نام پر حقیقت میں لوکائی کو اُن کے اظہاریے سے محروم کرنے کے بعد ایسے روبوٹس میں تبدیل کرنا ہے کہ جن کی زندگی محض اُن کے آقاؤں کی غلامی سے عبارت ہو۔

سرائیکی وسیب کو اُس کی شناخت سے محروم کرنے کے واسطے جہاں زمانہء قدیم میں مقامی علم وادب اور تہذیب وثقافت کی مسلسل بیخ کنی کی جاتی رہی وہیں پاکستان بننے کے بعد کے باسٹھ برس میں بھی اِس خطے کو اُس کی ثقافت سے محروم کرنے کے عمل کو کبھی خفی اور کبھی جلی انداز میں اِس طرح جاری رکھا گیا کہ جس نے آج وسیب کو دہشت گردی کی آگ کے دہانے پہ لا کھڑا کیا ہے۔ دیسی ثقافت کی شناخت کو کھرچ کھرچ کر مٹانے کے لیے تمام ثقافتی اجزاء کو نشانے پر رکھا گیا۔ یہاں کی زبان کو زبان ماننے سے انکار کیا گیا، یہاں کی تاریخ پر تاریکی کی کالک مَل دی گئی، اِس خطے کو اِس کی روایتی فصلات، نباتات اور حیوانات سے محروم کیا گیا، یہاں تک کہ وسیبی میلے ٹھیلے، رسوم ورواج، رہن سہن، پہناووں اور کھانے پکانے کو بھی غیر وسیبی تہذیبی برتری کے جھانسے میں لا کر قعر مذلت میں پھنکوانے یا بندشوں میں لانے کی کوشش کی گئی۔ اِس کی حالیہ مثال گذشتہ چوبیس برسوں سے ہر سال مہرے والے میں منعقد ہونے والے سرائیکی ثقافتی میلے کو دہشت گردی کے خوف کی آڑ میں روکنے کی

ناکام سعی ہے۔ میرے نزدیک کسی بھی خطے کے ثقافتی شعور کے اظہار کو غیر یقینی سے دوچار کرنا کسی طور بھی ملک عزیز سے خیر خواہی نہیں کہی جا سکتی۔ ہمارے مہربان سمجھتے نہیں یا سمجھنا ہی نہیں چاہتے کہ انتہا پسندی کا توڑ توازن میں، اور توازن صرف اور صرف ثقافتی شعور کی بیداری میں مضمر ہے۔ میں اپنے اطراف میں دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ہم کیسے لوگ ہیں جو کسی خطے کے لوکائی کو اُن کی ثقافتی روایات اور اِن کے شعوری اظہار سے محروم رکھ کر توقع رکھتے ہیں کہ وہاں دہشت گردی کا عفریت جنم نہیں لے گا۔ ہم کیسے لوگ ہیں کہ آ گ بھڑکا کر خواہش رکھتے ہیں کہ یہ جلائے گی نہیں۔

O

(روزنامہ ''خبریں'' ملتان، 23 نومبر 2009ء)

متفرقات

حفیظ خاں دے نانویں

شمیم عارف قریشی

شہر پناہ تے ڈُھک آئی ہے پورب توں کوئی لام
خلق اللہ دی آن کھڑی وت صور اللہ دا نام

اُجڑیے شہر دے باغیں تے جے ساون وس وی پووے
چنیے وچوں خفن ڈسن غلاب وچوں قلام

رات ہجر دی لِکھ لِکھ پنے دل دیوان کروں ہا
بندی خانے ٹِک پوندی جے ویندی رُت دی شام

شمس دی درگاہ تے وجے ڈاہویں دا وَت مارو
پھُل پتری گھن ہتھیں دے وچ قبراں کروں سلام

O

(''نیل کتھا'' ص:49)

قبضہ گیری کا مہابیانیہ اور حفیظ خان کی رد تشکیلیت

عامر حسینی

سرائیکی خطہ اپنی محرومیوں اور بے کسی کے حوالے سے شاید پاکستان کے تمام مظلوم خطوں میں سب سے بڑھ کر ہے۔اس خطے کے استحصال اور اس خطے کی محرومیوں کی کئی جہات ہیں۔ان جہات میں خطے کی آئینی، سیاسی شناخت کو تسلیم نہ کیا جانا، اس خطے کی الگ ثقافتی، قومیتی، حیثیت کا اعتراف نہ کیا جانا بہت اہم ہے۔اس امر کا ادراک کرنے میں مجھے کافی عرصہ لگا۔اس کی ایک بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ میں اس دھرتی پر نو وارد تھا۔ ہمارے آباء واجداد ہندوستان کی سرزمین سے اٹھ کر سندھ اور سرائیکی وسیب میں آباد ہوئے۔ ہماری مادری زبان اردو تھی اور یوپی اور دہلی کی تہذیبی ثقافتی روایت ہمارے ساتھ تھی۔اس وجہ سے مجھے اس دھرتی سے مانوس ہونے میں وقت لگا۔''سرائیکی قومی سوال'' سے آشنائی کی منزل تک پہنچنے کے لیے مجھے بہت سی ٹیڑھی میڑھی راہوں سے گزرنا پڑا۔اس سارے معاملے میں ہاں ایک بات میرے لیے باعث اطمینان تھی ۔ہندوستانی مارکسی روایت سے جڑے ہونے کے باعث قومی سوال پر بہت سے افق مجھ پر روشن تھے۔میرے لیے یہ بات کبھی الجھن کا باعث نہ بنی کہ پاکستان کثیر القومیت ملک ہے اس ملک میں سندھی، پشتون، بلوچ، پنجابی، سرائیکی آباد ہیں۔سرائیکی قومیت کے خدوخال سے میں اس خطے کے ایک سفر سے آشنا ہوا۔کسی بھی قوم کے

ہے مشترکہ زبان، خطے، ثقافت کا ہونا لازم ہے تو ایک قوم ہونے کا نفسیاتی احساس بھی پایا جانا ضروری ہے۔ سرائیکی ان تمام خواص سے مالا مال ہیں۔ سرائیکی قومی تحریک کے خواص میں سے ایک بہت ہی منفرد خواص مجھے یہ نظر آیا کہ یہ واحد تحریک ہے جس کو پروان چڑھانے والوں نے اس تحریک کو کبھی لسانی / نسلی تحریک قرار نہیں دیا۔ اور اس کو کبھی اس اعتبار سے منفی تحریک نہیں بنایا کہ جو سرائیکی نہیں بولتا وہ اس تحریک یا خطے کا بیٹا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس تحریک نے تقسیم سے قبل اور تقسیم سے بعد یہاں پر آباد ہوجانیوالوں کو اس دھرتی کے قدیم باشندوں کی طرح دھرتی کے بیٹے مان لیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریک آج تک لسانی یا نسلی بنیادوں پر کسی فساد کا باعث نہیں بنی۔ میرے لیے یہ بات باعث حیرت تھی کہ سرائیکی تحریک سے وابستہ بہت سارے دانشور، ادیب، شاعر "اردو" زبان کو اس خطے سے جوڑتے تھے اور اس زبان کی پرداخت میں سرائیکی وسیب کی حصہ داری سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔

میں سرائیکی زبان سے ناواقف تھا۔ اس کو سمجھنے اور اس زبان کو پڑھنے سے عاری تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ روزنامہ خبریں "وسیب سنگ" کے اس وقت کے انچارج محبی ومکرمی محبوب تابش نے ابتدائی طور پر سرائیکی زبان سے آشنائی کا سلسلہ قائم کروایا اور دو شاعروں سے متعارف کرایا۔ ان میں رفعت عباس اور اشولال شامل تھے۔ رفعت عباس کی کتاب "پروبھرے ہک شہر اچوں" اور اشولال کی کتاب "سندھ ساگر نال ہمیشاں" سے۔ سچی بات یہ ہے کہ دونوں کتابوں میں سے جو شعر محترم محبوب تابش نے پڑھ کر لفظی ترجمہ کر دیئے وہی ترجمہ میری سمجھ میں آیا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا اور میں اُس رمز کو نہ پاسکا جسے یہ محترم شاعر اپنی شاعری میں سرائیکی خطے کے حوالے سے واضح کرنا چارہے تھے۔

سرائیکی قومی تحریک کے سیاسی، آئینی مسائل میرے پیش نظر تھے۔ اور میں تقسیم ہند کے تناظر میں ریاست بہاولپور کے ختم ہونے سے لیکر اب تک سرائیکی خطے کے ساتھ ریاست کے سوتیلے پن کے سلوک کو سرائیکی صوبے کی تشکیل، سرائیکی خطے کی زرعی زمینوں کی اس کے حقیقی وارثوں کو واپسی، اس کے ملازمتوں میں، مالی فنڈز میں مساوی حصوں کی فراہمی کے حوالے تک محدود تھا۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں نے پانی کی تقسیم کے حوالے سے تنازعات کے تاریخی پس منظر

کی جانچ پڑتال شروع کی تو مجھے یہ احساس ہوا کہ اس خطے کے ساتھ اصل میں زیادتی کا سب سے بڑا آغاز اس وقت ہوا جب انگریزوں نے سکھوں کے ساتھ امرتسر معاہدہ کیا جو ۱۸۰۷ء میں ہوا تھا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں جو پنجاب سامنے آیا اس میں ریاست بہاولپور کو چھوڑ کر باقی ماندہ پنجاب کا سارا نظم و نسق سکھ، مسلم پنجابی اشرافیہ کے ہاتھ آ گیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دوران پنجاب حکومت نے انڈس ریور سسٹم پر جو نہری آبپاشی کا نظام بنایا اس میں سب سے زیادہ مفادات کا خیال بالائی پنجاب کا رکھا گیا تھا اور شرقی پنجاب کی طرف سے ستلج، راوی اور بیاس پر مسلسل ایسی منصوبہ بندی کی گئی کہ سرائیکی خطہ بالعموم اور ریاست بہاولپور بالخصوص اس سے متاثر ہونے لگی۔ اس خطے کی یہ بدقسمتی تھی کہ اول تو اس خطے کی اشرافیہ میں جدید تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی اور سرائیکیوں کی مڈل کلاس ناپید تھی جو قوم پرستانہ رویوں کا اظہار کرتی: پھر یہاں کی جو جاگیردار کلاس تھی اس نے کبھی اس خطے کے مفادات کی پرواہ ہی نہ کی۔

سرائیکی خطے میں جو نئی کالونیاں تھیں اس میں زیادہ تر بسنے والے پنجابی ہندو، سکھ اور مسلمان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے وقت بھی اس خطے کے جو مفادات تھے ان کا ٹھیک طرح سے اندازہ نہ کیا جا سکا اور نہ ہی اس پر کوئی آواز بلند کی گئی۔ پانی کی تقسیم پر لیاقت علی خان سے لے کر سکندر مرزا تک جو کمیشن بنے ان میں اگرچہ ریاست بہاولپور کا نمائندہ موجود تھا۔ لیکن ان میں بھی اس خطے کے لیے زندگی اور موت کا باعث بننے والے پانی کے مسئلے پر کوئی آواز بلند نہیں کی گئی۔ ون یونٹ کے قیام نے تو اس معاملے میں سرائیکی خطے کو ویسے ہی محرومی کی دلدل میں دھکیل دیا اور مرکزی حکومت نے اس خطے سے پوچھے بغیر ستلج، بیاس اور راوی ہندوستان کے حوالے کر دیے۔ اس سے قبل تقسیم کے وقت ریڈکلف نے جو دو ہیڈ ورکس مشرقی پنجاب کو دیے تھے۔ ان میں سے ایک سے ریاست بہاولپور کی تمام نہریں منسلک تھیں جس کا پانی بھارت نے ایک عرصے تک بند رکھا۔ سندھ طاس معاہدہ کسی اور خطے کے لیے اتنی بڑی تباہی کا باعث نہیں بنا تھا جتنا ریاست بہاولپور کے لیے بنا۔ آج بھارت نے چناب کا پانی بھی روکنا شروع کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے باقی ماندہ سرائیکی خطہ بھی بنجر ہونے جا رہا ہے۔

یہ بات میرے لیے حیرانگی کا باعث تھی کہ جب پنجاب میں نیا آبپاشی کا نظام بنا تو سندھ نے اس پر اعتراضات وارد کیے اور ۱۹۳۵ء میں اینڈرسن کمیٹی اور ۱۹۴۱ء میں راؤ کمیشن نے سندھ کے ازالے کے لیے زیریں اور بالائی سندھ میں دو بیراجوں کی تعمیر کا فیصلہ دیا لیکن سندھ طاس جیسا ظالمانہ معاہدہ کرنے کے بعد بھی اور پورے سرائیکی خطے کو پانی سے محروم کرنے جیسا فیصلہ لینے کے باوجود اس خطے کے لیے کسی متبادل ڈیم یا آبی ذخیرے کے تعمیر کیے جانے کا منصوبہ نہ دیا گیا۔ تمام منصوبے ایسے مقامات پر بنائے گئے جن کا سب سے زیادہ فائدہ بالائی پنجاب کو ہوا اور پانی کی تقسیم کا تمام تر معاملہ بالائی پنجاب، سندھ، بلوچستان و سرحد کے درمیان ہی گھومتا رہا۔ اس خطے کی محرومی کا فوری اور عبوری ازالے کا کوئی منصوبہ نہ تو پنجاب نے پیش کیا اور نہ ہی اس پر کبھی سندھ کی طرف سے مطالبہ ہوا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ "رسول بخش پلیجو" نے اس حوالے سے ایک کتاب تحریر کی جس کا نام انھوں نے "سندھ، پنجاب واٹر ڈسپیوٹ" رکھا۔ اس حوالے سے ان کی یہ کتاب خاصے تضادات کا شکار ہے۔ ان کی کتاب میں دلائل کا زور زیادہ تر اس بات پر ہے کہ دریائے سندھ پر کلیتاً حق سندھیوں کا ہے۔ اور مغربی پنجاب کے مقابلے میں خود کو لوئر رائپیرین تو مانتے ہیں لیکن جس اصول کے تحت وہ خود کو لوئر رائپیرین کہتے ہیں اسی اصول کے تحت وہ سرائیکی خطے کو لوئر رائپیرین ماننے کا اشارہ تک نہیں دیتے۔

لوٹ مار، استحصال کی اس ساری کہانی میں وہ سرائیکیوں کی مظلومیت اور ان کی لوٹ کھسوٹ کا ذکر تک نہیں کرتے۔ سرائیکی لکھت کاروں کو برٹش پنجاب میں کالونائزیشن کے نتیجے میں زمیندار اشرافیہ کے طبقاتی کردار، ان کے انگریزی سامراج سے سمبندھ اور اس کالونائزڈ سول وملٹری بیوروکریسی کے کردار کا از سر نو جائزہ لینے کی اشد ضرورت ہے۔ اور یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ پانی جیسے اہم مسئلے پر انھی کے خطے کے ایک اہم جاگیردار خانوادے دولتانہ کے فرزند ممتاز دولتانہ نے کس طرح سے سرائیکیوں کے مفادات کا سودا کر دیا اور اصولی طور پر پہلے دن سے نہرو اور مشرقی پنجاب کی سیاسی اشرافیہ مسلم لیگ کے پنجابی سیاسی خانوادوں پر زور دے رہی تھی کہ وہ پانی کی تقسیم کے کسی بھی نئے فارمولے کی تشکیل کے لیے ستلج، راوی اور بیاس سے دستبردار ہو جائیں جیسا کہ بعد از

خان ہو گیا۔

سرائیکی خطے کو اگر اپنی زرعی حیات بچانی ہے تو اسے ''سندھ طاس معاہدہ'' سے بغاوت کرنے کا اعلان کرنا ہوگا اور خود پاکستانی ریاست سے اپنے جائز حق کی وصول یابی کا مطالبہ کرنا ہوگا۔ پاکستان کے حکمران طبقات جس میں قومیتی اعتبار سے سندھ، سرحد، بلوچستان اور پنجاب شامل ہیں لیکن سرائیکی نہیں ہیں، وہ قومیتوں کے حکمران طبقات کی باہمی لڑائی میں کہیں بھی مستقل فریق کی حیثیت سے نظر نہیں آتے۔ وہ سندھی اور پنجابی حکمران اشرافیہ کے باہمی جھگڑوں میں کسی ایک کا فریق اور طفیلی نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے سیاسی مطالبات کا وزن کہیں بھی نظر نہیں آتا۔

اس خطے میں بسنے والے پنجابی، ہریانوی اور اردو بولنے والے مہاجر جن کی اکثریت شہری علاقوں میں اور ایک معتد بہ تعداد متوسط طبقے کی زمینداری سے وابستہ ہے نہ جانے کیوں اس خطے کی محرومی اور اس خطے کے پانی جیسے مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھ نہیں پا رہی۔ وہ اس خطے کی قومی تحریک کو اب بھی صرف لسانی و مقامی و غیر مقامی تناظر میں دیکھ رہی ہے اور تاریخ کا جبر بھی یہی ہے کہ اس خطے کے کاروباری، پروفیشنل، صنعتی طبقات کی اکثریت کا تعلق بھی انہی گروہوں سے ہے اور یہ شہری اور دیہی بورژوا و پیٹی بورژوا طبقہ جدید قوم پرستانہ تحریک کا ہراول دستہ بننے سے تاحال گریزاں ہے اور اپنی سیاست کا وزن شعوری یا لاشعوری طور پر بالائی پنجاب کی حکمران اشرافیہ کے پلڑے میں ڈالے ہوئے ہے۔ حالانکہ بنجر ہوتی زرعی زمینیں اور اس خطے کی معاشی بربادی خود ان کی ترقی کے امکانات بھی معدوم کر دے گی۔

میرا یہ فہم، مشاہدہ کس حد تک ٹھیک ہے اس کا فیصلہ تو اس تحریک سے وابستہ لوگ ٹھیک ٹھیک طور پر کر سکتے ہیں میں نہیں۔ بحر حال گفتگو کا محور کسی اور طرف مڑ گیا۔ میں سرائیکی ادب وثقافت سے، سرائیکی ادبی منطق سے اپنے فہم میں کارفرما عناصر کے حوالے سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ اس فہم کی پہلی بنیاد سیاست اور سیاسی مسائل تھے۔ شعر و ادب اور ثقافت اس میں بعد میں آئے اور یہ کس طرح سے آئے اس کو واضع کرنے کے لیے میں جب اپنے ذہن پر زور ڈالتا ہوں تو اس میں بنیادی اور مرکزی کردار حفیظ خان کا نظر آتا ہے۔ حفیظ خان کا کردار میری زندگی میں کیسے آیا۔ یہ ایک بہت دلچسپ

ہے۔ کتاب بینی ہمیشہ سے میرا شوق رہا ہے اور اسی شوق کی تسکین کے لیے میں ملتان صدر میں
من آرکیڈ میں واقع کتاب نگر آیا ہوا تھا اور کتابیں دیکھ رہا تھا تو نظر ایک کتاب پر پڑی۔ کتاب کا نام
تھا ''رفعت عباس کی سرائیکی شاعری...... نوآبادیاتی خطوں کا نیا مکالمہ'' یہ جو اصطلاح تھی ''نوآبادیاتی
خطوں کا نیا مکالمہ'' اس نے مجھے کچھ چونکایا۔ کتاب ملتان انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ نے شائع
کی تھی۔ خود یہ نام بھی میرے لیے دلچسپی کا باعث تھا۔ انتساب بھی بہت دلچسپ تھا۔

''ان زمیں زادوں کے نام تاریخ جن کے لیے مدفن نہیں کوکھ ہے''

حفیظ خان کون تھے۔ کیا کرتے تھے، کہاں رہتے تھے یہ مجھے معلوم نہ تھا لیکن تحریر بڑی
جاندار تھی۔ حوالے ان کی وسعت علمی کے آئینہ دار تھے اور مجھے سرائیکی شاعری کے ایک نئے جہان
سے آگاہ کرانے کا باعث بن رہے تھے۔

نوآبادیاتی خطوں میں ابھی تک میری نظر سے چند معروف قوم پرست ترقی پسند شاعروں
، ادیبوں اور لکھاریوں کا کام ہی گزرا تھا۔ افریقی، لاطینی، عرب، کرد، فلسطینی، ریڈ انڈین اپنی تہذیبی
بازیافت کے جس سفر سے گزرے تھے سچی بات ہے کہ میں نے اُس حوالے سے ہندوستان میں بسنے
والی اقوام کے تہذیبی بازیافت کی واردات بارے کم ہی پڑھا اور سنا تھا۔ سندھی، بنگالی، پشتون اور
بلوچ قوم پرستانہ تحریکوں کے سیاسی رخ سے آشنائی بہت تھی۔ کسی حد تک ان کی تہذیبی ٹریجڈی سے
بھی آگاہی تھی اور جیسے ایاز سندھی نے سندھ کو دیکھا تھا اس کی دیگر مثالیں مجھے کم ہی نظر آئی تھیں۔ حفیظ
خان کی اس کتاب نے مجھے اس بات سے روشناس کرایا کہ تہذیبی بازیافت کا ایک اعلیٰ ترین سفر
سرائیکی قوم کے ہاں بھی ہو رہا ہے۔ اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے یہاں بھی اتنا ہی بڑا کام ہو رہا ہے
جتنا بڑا کام افریقہ، لاطینی امریکہ میں ہو رہا ہے۔ اسی کتاب نے مجھے ''دراوڑی'' فلسفہ سے آگاہی دی
اور سچ پوچھیے تو اسی کتاب نے مجھے رفعت کی شاعری کے رموز، بھید کو پانے کا راستہ دکھایا۔ اور مجھے فخر
ہے کہ میں رفعت، اشو لال، شمیم عارف قریشی، مظفر بخاری، سلمان سہو وغیرہ کی شاعری میں چھپے
تہذیبی بازیافت کے اس خزانے تک اس خطے کے بہت سارے قدیم دھرتی ماں کے بیٹوں سے پہلے
اور نہایت کم عرصے میں پہنچ گیا جہاں کئی صاحبان جبہ و دستار ۲۵، ۲۵ سال کی رفاقتوں کے باوجود پہنچ

نہیں پائے۔ حفیظ خان کا شکریہ کہ رفعت کی'' بھوندی بھوئیں تے''، ''پروبھرے اک شہر اچوں''، ''سنگت وید'' ہی نہیں بلکہ ''چھیڑ وہتھ نہ مرلی''، ''سندھ ساگر نال ہمیشاں''، ''نیل کتھا'' اور خود خواجہ فرید کی شاعری کے کئی بھید مجھے معلوم ہوئے۔

''حفیظ خان'' کی زیارت مجھے ایک دو تقریبات میں ہو ہی گئی اور اسی دوران ان کے دیگر رفقا رفعت عباس، شمیم عارف قریشی، مظفر بخاری، جاوید اختر بھٹی سے بھی قربتیں بڑھنے لگیں۔ اس کتاب کو پڑھنے کے دوران ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ حفیظ خان نے کس عرق ریزی سے یہ کتاب تیار کی ہے۔ ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ اس کتاب کو مکمل کرنے میں دو سال لگے تھے اور انھوں نے یہ کام نہایت خاموشی سے کیا تھا۔ خود رفعت عباس کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ یہ کام کر رہے ہیں۔

آج جب سرائیکی خطے کے اس اہم دانشور، محقق کے بارے میں، میں اپنے مطالعاتی کمرے میں کرسی پر بیٹھا میز پر دھرے کاغذوں پر اپنے خیالات رقم کر رہا ہوں تو یقین مانیے مجھے ایک مرتبہ بھی یہ خیال نہیں آیا کہ ''حفیظ خان'' پیٹی بورژوا طبقے کا ہی ایک فرد ہے جس کے موقعہ پرست کردار کی میں ہمیشہ مذمت کرتا آیا ہوں۔ وہ زمیندار اشرافیہ کا چشم و چراغ ہے جس کے کردار پر میں ہجویہ نثر لکھتے ہوئے صفحوں کے صفحے سیاہ کرتا رہا ہوں۔ وہ اس عدالتی نظام کا ایک حصہ ہے جس نظام کے نوآبادیاتی استحصالی ڈریکولائی پہلوؤں پر میرا قلم نشتر کی طرح چلتا رہا ہے۔ پھر میں کیوں قلم اٹھا کر ''حفیظ خان'' کے لیے مدح سرا ہو گیا ہوں۔ اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ یہ شخص اسی کردار کا حامل ہے جیسا کردار اعلیٰ طبقے کے کئی لوگوں کا رہا ہے کہ جنھوں نے زمین زادوں کے لیے اپنے ''عرش زادوں'' کے خلاف اعلان بغاوت بلند کر ڈالا۔ سچ کہا تھا کارل مارکس نے کہ طبقات اپنے مفادات سے کبھی پھر انہیں کرتے ہاں افراد ضرور بغاوت کر جاتے ہیں۔

ملتان میں مجھے ''سورج میانی'' بہت پسند ہے۔ میری کیفیت ہی اس علاقے میں آ کر اور ہو جاتی ہے اور سورج میانی ہی کی ایک آبادی سخی سلطان کالونی میں حفیظ خان رہتے ہیں۔ ایک دفعہ ان سے ملنے گیا تو میرے ہمراہ رفعت عباس، شمیم عارف قریشی، عبداللطیف بھٹی بھی تھے۔ اس ملاقات میں حفیظ خان نے مجھے اپنی تازہ تصنیف ''خرم بہاولپوری...... شخصیت، فن اور منتخب سرائیکی کلام'' پیش

کی۔سرائیکی ادبی مجلس بہاولپور نے اسے شائع کیا۔حفیظ خان نے سرائیکی خطے کے اس گمنام شاعر کو
جیسے دریافت کیا۔اس کی مظلومیت کا جیسے مقدمہ پیش کیا اس کا بیان میں چند حروف میں کسی بھی طرح
نہیں کرسکتا۔اس کے لیے میں اپنے قاری سے کہوں گا کہ وہ اس پر حفیظ خان کی تحقیق پڑھے۔حفیظ
خان نے جیسے ''خرم بہاولپوری'' کا نقشہ کھینچا ہے گویا واقعات کو تصویر کردیا ہے۔اس خطے سے روا رکھی
جانے والی زیادتی کی ایک جھلک ہمیں اس کتاب مین خوب نظر آتی ہے۔حفیظ خان اپنی گونا گوں
مصروفیات کے باوجود جن کی طرح کام کرتے ہیں۔وہ تحقیق وتنقید کے ہی آدمی نہیں ہیں ایک زمانے
میں انھوں بطور ریڈیو پروڈیوسر کے کام کا آغاز کیا تھا۔سرائیکی ٹیلی ڈراموں کی تصنیف کی۔وہ کہانی
کار بھی ہیں۔تحقیق وتنقید کے میدان میں ابھی ان کا ملتان کی قدامت،ثقافت اور تاریخ پر ایک کام
آنے والا ہے جس کا نام ''ملتان سدآباد'' ہے جو گزشتہ کئی سالوں سے وہ مکمل کررہے ہیں۔ملتان کی
تاریخ پر یہ کام اپنے انداز کا منفرد کام ہوگا جو انھوں نے بغیر کسی یونیورسٹی سے ریسرچ پروجیکٹ حاصل
کیے اور بغیر اپنی سرکاری مصروفیات اور وہ بھی ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی مصروفیات ترک کیے
مکمل (تقریباً) کرلیا ہے۔

وہ احمد پور شرقیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ریاست بہاولپور کی ریاستی تہذیب کا مرقع ہیں۔
اس ریاست کے ثقافتی در و دیوار سے انہیں بہت محبت ہے اور یہاں کی بو باس ان میں خوب رچی بسی
ہے۔میں ریاست بہاولپور میں کوٹ سبزل سے منڈی صادق گنج تک گیا ہوں۔میں نے ریاست
بہاولپور کے ان علاقوں میں اڑتی دھول،ریت اور خاک کا خوب نظارہ کیا ہے جہاں کبھی لہلہاتے
کھیت تھے۔میں نے وہ اجڑے قصبات اور شہر دیکھے ہیں جو کبھی چاول،گڑ،گندم کی منڈی ہوا کرتے
تھے۔میں ریاست میں فاضل کے بنگلے تک گئے اس ریلوے ٹریک کو اور اجاڑ اسٹیشن کی کھنڈر عمارتوں کو
بھی دیکھا ہے جو کبھی رونق سے بھرپور تھے اور پورے ہندوستان کے تجارتی راستے کا اہم پڑاؤ تھے۔
آج وہاں خاک اڑتی ہے اور ہر ریاستی کے دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے اور جب بھی اس بربادی
سے آشنا کسی صاحب درد سے میری ملاقات ہوتی ہے تو وہ صاحب کتنا ہی ہنس مکھ ہو،حس ظرافت رکھتا
ہو اس ٹریجڈی کے اثر میں عجب سی اداسی اور قلب رقیق لیے پھرتا ہے۔یہ قلب کی نرمی اور طبیعت کی

اداسی حفیظ خان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔اس کی تحریروں میں بھی یہ چھپائے نہیں چھپتی۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے اور یہ اعتراف رفعت کو بھی ہوگا۔خود حفیظ خان بھی اس کے قائل ہیں کہ ہمارے اندر اتنی بڑی جرأت شاید نہیں ہے کہ شمیم عارف کی بذلہ سنجی کے ذریعے اس ٹریجڈی سے پیدا ہونے والی رقت قلبی پر پردہ ڈالے رکھیں۔

حفیظ خان بتا رہے تھے کہ وہ کافی کے صنفی محاکے پر بھی کام کر رہے ہیں اور اس کے لیے انھوں نے سندھ اور پنجاب کے کتب خانوں میں جو سر کھپایا ہے،جس طرح جا کر چیزیں تلاش کیں وہ انہی کا کارنامہ ہے۔میں ان کی محنت کا موازنہ کسی دوسری قوم کے کسی محقق،دانشور،ادیب سے کرنا نہیں چاہتا اور نہ ان میں کوئی درجاتی مساوات تلاش کرنے کا خواہش مند ہوں۔لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ حفیظ خان سرائیکی قوم کے لیے وہی کام کرنے جارہے ہیں جو ایک دور میں ''ایاز سندھی'' نے اپنی سندھی قوم کے لیے کیا تھا۔سرائیکی قوم کو وہ تحقیق وتنقید کی ایک مضبوط بنیاد فراہم کرنا چاہتے ہیں جو نہایت خوش آئند اقدام ہے۔

حفیظ خان خوبصورت کہانی کی کرافٹ کا فن بھی جانتا ہے۔۲۰۰۸ء میں دو جنوری کو حفیظ خان نے اپنے گھر مجھے اپنی سرائیکی میں لکھی کہانیوں کے ایک اردو ترجمے کا انتخاب دیا۔ان کہانیوں میں سرائیکی خطے کی عورت،مرد،بچے اور پھر انسانوں کے مختلف طبقات اور ان کے مخصوص سماجی،طبقاتی کرداروں کا صحیح صحیح نقشہ انھوں نے کمال مہارت سے کھینچا ہے اور وہ اس کہانی کہنے کے عمل میں اپنے تمام تر تجربات،مشاہدات،علم،مطالعہ کام لائے ہیں۔اور پھر سرائیکی خطے کی زندگی کو جیسے انھوں نے نقش کیا ہے اس پر وہ مبارکباد کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ان کا ایک سرائیکی ٹیلی ڈرامہ کوئی ''شہریں جنگل کوکدا'' مجھے افسوس ہے کہ میں محض آدھا ہی پڑھ پایا ہوں۔کیونکہ اسی دوران مجھے کار کا حادثہ پیش آیا اور میں اپنے کاندھے اور ایک پسلی کی ہڈی تڑوا بیٹھا اور صاحب فراش ہوگیا۔

ان کی کالم نگاری کی ایک کتاب ''اس شہر خرابی میں'' مجھے بذریعہ ڈاک موصول ہوئی تھی اس پر میں نے الگ سے ایک مضمون قلم بند کیا ہے۔حفیظ خان کی کہانی نگاری ان کی ہر تحریر میں چھپکے سے در آتی ہے۔کئی جگہوں پر تو ان کے بیانیے کو کہانی،افسانہ،کالم،ڈرامہ،انشائیہ جیسی اصناف کا ملغوبہ

کہا جا سکتا ہے۔

حفیظ خان نے اگر چہ با قاعدگی سے شعر تو نہیں کہے لیکن ایک زمانے تک وہ نظمیں ضرور کہتے رہے۔ان کی یہ نظمیں غالباً اس زمانے کی تحریر کردہ ہیں جب فراق وہجر کے موسم کو شروع ہوئے اور وصل ونشاط کو رخصت ہوئے کافی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ویسے ان نظموں کا عنوان ''پہلی شب بیت جانے کے بعد'' بھی میرے شک نما قیاس کو تقویت پہنچاتا ہے۔ان نظموں میں نوخیز نوجوانی کی لاابالیت اور نوجوانی کے رومانس کی اولین اختتام پذیری سے جنم لینے والے کرب کے احساس کی جھلکیاں بھی جا بجا جھلکتی ہیں۔''روہی'' چولستان کا ذکر ان نظموں میں بھی ہے اور اس کے علاوہ ایڈز، ٹرسٹیشن،سیکنڈ ہینڈ،لاشعور،توازن،لاحاصل،آب گزیدہ،پیراسائٹس،آسیب،حبس،استفادہ،کولڈ سٹوریج،عاق نامہ+پلس ایسے عنوانات ہیں جو منفرد بھی ہیں اور 75ء سے 85ء کے دوران خاصے نئے بھی تھے اور ان کی اہمیت آج بھی قائم ہے۔

حفیظ خان ذاتی زندگی میں بھی بہت کھرے اور نفیس شخصیت کے مالک ہیں۔وہ حق گوئی اور بے باکی میں بہت آگے ہیں۔میں سوچتا ہوں کہ راقم اپنی بے باکی اور سچ گوئی پر بڑا نازاں رہتا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرے پیروں میں کبھی سرکاری زنجیر نہیں رہی اور نہ ہی میں اتنے مال ومتاع یا زمین کا مالک رہا ہوں کہ میرے سچ کو روکنے میں کوئی انکم ٹیکس افسر،کوئی پٹواری آڑے آسکے۔لیکن ایسا شخص جس کے سچ سے ناراض ہو کر سرکار اس کا بہت سا نقصان کر سکتی ہو وہ پھر بھی سچ بولے اور پورا سچ بولے اور وہ اس سچائی کے بیان میں کسی کا لحاظ بھی نہ کرے وہ یقیناً بہت بڑا آدمی ہے۔

حفیظ خان اپنے سماجی مقام ومرتبے کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ وہ حکمران طبقات سے گٹھ جوڑ کر کے بے تحاشہ مالی منفعت حاصل کر سکتا۔اس کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اپنی مظلوم قوم کے لیے وقف کرنے کی بجائے پنجابی متعصب اور نام نہاد بڑے بڑے ناموں کی تقریب کے لیے وقف کر دیتا اور اپنی زبان کے بطور کامل زبان ہونے،اپنی قوم کے قوم ہونے سے دست بردار ہو جاتا۔اپنی سرائیکی تحریروں کو پنجابی قرار دیتا تو شاید لاہور کے اہلِ اقتدار اسے سرکاری میڈیا پر جگمگاتا ستارہ بنا لیتے اور مان لیتے۔اور وہ بھی بعض سرائیکی دانشوروں کی طرح

سرائیکی قوم کے روایتی تاریخی موقف سے دستبردار ہوکر اصلاح پسندی کا راستہ اختیار کر لیتا اس نے ایسا نہیں کیا۔اس بے داغ کردار پر ہر صاحب کردار حق گو انہیں سلام پیش کرتا ہے۔حفیظ خان، شمیم عارف قریشی ،رفعت عباس ،مظفر بخاری ، ملک فرید ،عبداللطیف بھٹی ،عاشق بزدار ،اشولال فقیر، سلمان سہوسمیت بہت سارے لوگ ہیں جو سرائیکی قومی تحریک کو ترقی پسندانہ انقلابی رنگ روپ دینے کی تگ ودود کرر ہے ہیں ۔رفعت عباس نے اپنی شاعری کے ذریعے اس خطے میں حملہ آوروں کی تہذیب،ثقافت،تاریخ،شاعری،مذہب کی ایسی ردتشکیل (Deconstruction) کی ہے کہ اس سے نئے جہانِ معنی دریافت ہونے جارہے ہیں۔شمیم عارف اور حفیظ خان نے اپنی تحریروں کے ذریعے اسی ردتشکیل کو نثری شکل دی ہے۔یہ سب لوگ اس ''مہابیانیے'' کو توڑنے کی کامیاب کوشش کررہے ہیں جس کی اڑائی ہوئی دھول میں خطے کے ''افتادگان خاک'' نظروں سے اوجھل ہوگئے تھے۔اب ایک ایک کرکے انہیں دوبارہ ''شہود'' کیا جارہا ہے۔اسی تہذیبی شہود کے اندر سے سرائیکی قوم کا سیاسی شعور برآمد ہوگا۔

میں سرائیکی اہل دانش کے اس حصے سے گزارش کروں گا جو ان صاحبان کی کاوشوں کو نام نہاد روایتی مذہبی یا روایتی ترقی پسندانہ تناظر میں دیکھنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں جو ان کی مابعد الطبیعات سے نبرد آزمائی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔وہ کبھی تو غلطی سے ان کا رشتہ کبھی روایتی رسمیت پسند تصوف سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو کبھی ہندوصنمیات سے تو کبھی رجعت پسندانہ متعصب قوم پرستی سے۔وہ سطحی مشاہدے کی بجائے گہرائی سے کام لیں۔دیکھیں سرائیکی خطے کی اس نئی تہذیبی بازیافت کے معنی ومفہوم کیا ہیں۔انھوں نے بہت سے روایتی علائم کے معنی بدل ڈالے ہیں۔بہت سے کردار الٹ پلٹ کر رکھ دیئے ہیں۔

بالائی پنجاب کے دانشوروں،شاعروں،ادیبوں سے بھی گزارش ہے کہ وہ اپنے حکمران طبقے کی توسیع پسندانہ سوچ کی پیروی ترک کریں اور زبردستی ''سرائیکی قوم'' کو پنجابی قرار دینے اور سرائیکیوں کے قومی ،سیاسی ،ثقافتی حقوق کا انکار کرنے کی روش ترک کردیں ۔وہ سندھی بلوچی، پشتونوں کے سامنے زبردستی سرائیکی شاعروں کو پنجابی شاعر کہنا بند کردیں اور اس خطے کا جو بائیکاٹ یا

علیہ بگاڑنے کا جو کام انھوں نے اپنی تحریروں میں شروع کر رکھا ہے اسے بند کر دیں۔ جس طرح سے وہ سندھیوں، بلوچوں اور پختونوں پر پنجابی حکمران اشرافیہ کے مظالم کی مذمت کرتے ہیں ویسے ہی مذمت انہیں سرائیکیوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی زیادتیوں پر بھی کرنی چاہیے۔ رنجیت سنگھ کے مظالم کی پردہ پوشی اور بعد ازاں انگریزوں سے مل کر اس وقت کی پنجابی اشرافیہ کی امرتسر معاہدے کے ذریعے سرائیکی خطے کو غصب کرنے کی حرکت کی انہیں کھلے عام مذمت کرنی چاہیے۔

تحقیق کے میدان میں حفیظ خان اور شمیم عارف نے پہلی مرتبہ سرائیکی دانش کے امتیازی اوصاف کو ابھارا ہے۔ رفعت عباس نے اپنی شاعری میں سرائیکی خطے کے عام باشندے کی جو بازیافت کی تھی اور جیسے اس باشندے کے گرد ترتیب پانے والی معاشرت اور اس معاشرت پر اسرنے والی تہذیب کے خدوخال بیان کرنے کی سعی کی تھی۔ اشولال نے جیسے ”کاوسوں دا پکھی اے“ میں دھرتی کے اصلی باشندے کی پہچان کرانے کی سعی کی تھی اور جیسے اپنی شاعری میں احیائے نسائیت کے بنیادی ضابطوں کو واضح کیا تھا اور عام آدمی کا رب، رب کے نمائندہ صوفی، اٹھے دریاؤں، گلی محلوں میں پھرنے والے عام آدمی، عورت، بچے، بوڑھے، سپاہی سے ربط دکھایا تھا اور تصوف کی اصل جھلک لوک تصوف میں دکھائی تھی اور اس سارے طلسم، جادو کو توڑا تھا جو آریاؤں نے اپنی تاریخ، جمالیات، متھالوجی میں جس طرح مقامی باشندے کو راخس کہا تھا۔ انھوں نے راخس کے ہیرو ہونے کو دریافت کیا۔ کرشن کو جیسے مسخ کیا گیا تھا اس کو پھر سے پلٹایا۔ اس کام کو اس بازیافت کو نثر کے میدان میں حفیظ خان نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ کھول کر بیان کیا ہے۔ انھوں نے خطے میں سرائیکی زبان وادب، شاعری فکشن میں ترقی پسند تحریک کی تاریخ اور اس کے اہم کرداروں کی طرف بھی اپنی کئی تحریروں میں توجہ مبذول کرائی ہے۔ وہ ایک سچے ترقی پسند، روشن خیال ادیب ہیں۔ انہیں اپنی ہمسایہ اقوام سے نفرت نہیں ہے لیکن ”قبضہ گیری“ کے تناظر میں رواج پانے والے مہابیانیہ کے خلاف انھوں نے ہمیشہ جدوجہد روا رکھی ہے۔ وہ پاکستانی ریاست میں اسلام، دوقومی نظریے اور قومیت بر بنائے مذہب جیسے مہابیانیوں کے خلاف ہمیشہ جدوجہد کرتے آئے ہیں لیکن سرائیکی ترقی پسندوں کو اس مہابیانہ سے زیادہ پنجابی قبضہ گیری کے مہابیانیے کا سامنا رہا ہے۔ قبضہ گیری کا یہ مہابیانہ مذہب، پاکستانیت اور

پنجابیت کے نام پر سرائیکیوں ، سندھیوں ، بلوچوں ، پشتونوں کے آڑے آتا رہا ہے۔ پنجابیت کا مہابیانیہ اتنا مہیب اور خطرناک ہے کہ اس نے ان دانشوروں ، شاعروں ، ادیبوں ، صحافیوں ، سیاسی وسماجی ورکروں کی بھی آنکھیں بند کر رکھی ہیں جو بالائی پنجاب میں مذہب ، پاکستانیت ، دوقومی نظریے جیسے مہابیانیوں کے خلاف ماضی میں جدوجہد کرتے رہے ہیں۔

O

(18 مارچ 2009ء)

حفیظ خان: خانِ زمیں زادگان

الیاس میراں پوری

کوئی چار سال ہوتے ہیں ۔ جناب جاوید اختر بھٹی اور استادِ گرامی پروفیسر رفعت عباس اپنے ایک دوست سے ملنے اُن کے گھر واقع گلشن سخی سلطان (ملتان) گئے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔راستے میں انھوں نے مجھے اُن کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔وہاں پہنچے تو گھر کے دروازے پر ایک ایسی شخصیت سے ملاقات ہوئی جس کا سراپا کچھ اس قسم کا تھا۔دراز قد، سرخ وسفید رنگ، خوش لباس، خوش اطوار، خوش مزاج، وجیہہ چہرے پر وجہِ مُردانگی خوبصورت مونچھیں، چال ڈھال میں تمکنت، چال میں بھی ڈھال غالب۔تبسم زیرلب اگر زبر ہوتا تو مونچھوں میں چھپ جاتا۔

موصوف مخلص، ملنسار اور خوش اخلاق واقع ہوئے ۔ بڑی گرم جوشی سے بھرپور مصافحہ کیا۔ان کے مصافحہ میں بھی معانقہ کا لطف ہے۔لباس اور وضع قطع میں صفائی پسند ہیں۔ یہ جب بھی کوئی تصویر بنواتے ہیں تو ہر تصویر میں ''جب آتش جواں تھا'' والی کیفیت ہوتی ہے۔شاید ایسی ہی تصویریں ہوتی ہیں جو تکیوں کے نیچے رکھی جاتی ہیں؟ گہری اور شوخ آنکھیں بقول شورش کاشمیری'' آہوانِ صحرا دیکھ لیں تو چوکڑیں بھول جائیں'' بالفاظِ دیگر

ساری مستی شراب کی سی ہے

بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں:

اٹھے تو بجلی پناہ مانگے
گرے تو خانہ خراب کر دے

کے صحیح مصداق۔ آنکھوں پر خوبصورت چشمہ بھی لگائے ہوئے اور جب لگاتے ہیں تو یہ چشمہ ظلمات کئی ''مہ جبینوں'' کے لیے آبِ حیات کا کام دیتا ہے۔ کیوں یہ کہ چشمہ لگا کر ''طوطا چشمی'' نہیں کرتے۔ باوجود پوری کوشش اور تگ ودو کے میں یہ نہیں جان سکا کہ یہ خوبصورتی میں اضافے کے لیے چشمہ لگاتے ہیں یا پھر خوبصورت چیزیں دیکھنے کے لیے......لیکن یہ نظر کا چشمہ لگاتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ انھیں مل کر جوشؔ کا یہ شعر تھوڑے سے تصرف سے یاد آ گیا:

بہت جی خوش ہوا کل ''حفیظ'' سے اے ہم نشیں مل کر
ابھی اگلے شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

وہ بڑی گرم جوشی اور تپاک سے ملے۔ رفعت عباس صاحب نے بتایا کہ یہ ہیں حفیظ خان صاحب۔ میں اُن کا نام پہلے سن بھی چکا تھا اور اُن کی کچھ تحریریں بھی پڑھ چکا تھا۔ ملنے کا اشتیاق تھا جو پورا ہو گیا۔ رفعت صاحب نے میرا تعارف کرایا تو بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے میں ایسے نوجوانوں کی دل سے قدر کرتا ہوں جنھیں ادب سے تھوڑا بہت لگاؤ ہوتا ہے۔ یہ میری حفیظ خان سے پہلی ملاقات تھی۔ انھوں نے پہلی ملاقات میں ہی مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اپنی محبت، شفقت، خلوص......کی بنا پر۔

حفیظ خان علم دوست شخصیت ہیں۔ وہ ہر وقت اپنے آپ کو علمی مصروفیات میں مشغول رکھتے ہیں۔ میری جب بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی علمی کام میں مصروف ہوتے ہیں۔ کبھی کسی کتاب کا پروف پڑھ رہے ہیں، کبھی مسودہ ترتیب دے رہے ہیں، کبھی پیش لفظ لکھ رہے ہیں۔

میں اکثر حیران ہوتا ہوں جو شخص بیک وقت افسانے، ڈرامے، کالم لکھ رہا ہو، عدالتی فیصلوں کو مکمل کر رہا ہو۔ دوستوں کے ساتھ محفلیں برپا کر رہا ہو، یہ افرادِ خانہ کو کیسے وقت دیتا ہوگا۔ میں یہ سن کر انگشت بدنداں رہ گیا کہ انھوں نے تو دو شادیاں کی ہوئی ہیں۔ حفیظ خان چونکہ منصف ہیں اس لیے انھوں نے یہاں بھی انصاف سے کام لیا ہے۔ صبح ایک گھر میں ہوتے ہیں تو شام کو دوسرے گھر میں۔ جب یہ تیار ہو کر دوسرے گھر جاتے ہیں تو کیفیت یہ ہوتی ہے:

دامن پہ کوئی داغ نہ خنجر پہ کوئی چھینٹ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

میں اکثر سوچتا ہوں کہ تخلیق کار تو بنیادی طور پر رحم دل اور حساس ہوتا ہے۔حفیظ خان ان دنوں منصفی کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔جب مجرم اپنی ''روایتی بے گناہی'' ثابت کرنے کے لیے ان کے سامنے پیش ہوتے ہوں گے تو ان کے تاثرات کیا ہوں گے۔کیا ان کا دل پسیج جاتا ہوگا لیکن یہ دوراندیش واقع ہوئے ہیں۔یہ پہچانتے ہوں گے کہ کون بے گناہ ہے اور کون گناہ گار؟ اتنے بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود ان میں افسروں والا غرور وتکبر نام کو نہیں۔ورنہ اس منصب پر پہنچ کر تو اکثر لوگوں کی گردنوں میں دو دو انچ موٹا سریا آجاتا ہے اور وہ کسی سے مصافحہ کرنا تو درکنار سلام کرنے کے لیے گردن کو ہلکا سا خم اس طرح دیتے ہیں کہ جیسے بہت بڑا احسان کر رہے ہوں۔ایسے لوگ اپنے دفتری ملازمین سے سیدھے منہ بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں۔حفیظ خان صاحب ایسے قبیح صفت لوگوں سے یکسر مختلف ہیں۔عاجزی وانکساری کے خمیر میں گندھے ہوئے اس پیکر کو میں نے کبھی اپنے کسی گھریلو ملازم اور ڈرائیور سے بھی الجھتے یا افسری کا رعب جھاڑتے نہیں دیکھا۔بلکہ انھیں گھر کے افراد کی طرح رکھا ہوا ہے۔اس کی وجہ یقیناً یہی ہے کہ خلوص وانکساری کا یہ پیکر بنیادی طور پر افسانہ نگار ہے اور افسانہ نگار کے سینے میں ایک حساس انسان کا دل دھڑکتا ہے۔جو کبھی بھی کسی دوسرے شخص کو دکھی اور اداس نہیں دیکھ سکتا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ماتحت ہر وقت ان کے گن گاتے ہیں۔جمال کا یہ پیکر کبھی جلال میں ہو تو ملنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے روبرو ہو۔لیکن اس ''اکبر اعظم'' نے کسی ''انارکلی'' کو دیوار میں زندہ نہیں چنوایا۔

حفیظ خان بڑے مہمان نواز اور سلیقہ شعار ہیں۔ان کی پوری زندگی ایک ترتیب، تہذیب اور توازن سے عبارت ہے۔انھوں نے کبھی اس میں بگاڑ پیدا نہیں کیا۔اصول پرست ہیں اس لیے اصولوں پر کبھی سودے بازی نہیں کی، سودے بازی کے'' اناڑی پن'' نے انھیں کئی نقصانات بھی پہنچائے ہیں۔خان صاحب دل فطرت شناس کے مالک ہیں۔اس لیے ان کا دل سخی کے دروازے کی طرح کھلا ہے۔یہ مہمان کی تواضع کیے بغیر اُسے جانے نہیں دیتے۔خان صاحب ایسے شگفتہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہ جی چاہتا ہے'' وہ کہیں اور سنا کرے کوئی''۔وہ دقیق علمی مباحث کو شگفتہ انداز میں حل کرتے

ہیں۔لطیفہ،واقعہ یا ضرب المثل سنا کر اس مشکل کا حل بیان کر دیتے ہیں اور مشکل واقعی حل ہو جاتی ہے۔

حفیظ خان سے دوستی نبھاتے رہنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔کیونکہ یہ بہت حساس ہیں لیکن ان کی حساسیت بھی بذلہ سنجی سے عبارت ہے۔یہ کسی سے خفا نہیں ہوتے۔اگر ہو بھی جائے تو دل سے خفا نہیں ہوتے۔کیونکہ ان کا دل مخالف کے لیے بھی آئینے کی طرح شفاف ہوتا ہے۔میں نے سنا ہے کہ ان کی عدالت میں تو مجرموں کا خوف کے مارے برا حال ہوتا ہے لیکن دوستوں کی محفل میں یہ بالکل مختلف انسان نظر آتے ہیں۔ان کے دوستوں میں عابد و زاہد بھی ہیں اور زندگی کو لبرل معنوں میں دیکھنے کے خواہاں بھی۔ویسے جاوید اختر بھٹی، شمیم عارف قریشی اور رفعت عباس ان کے ''مقربین'' میں شمار ہوتے ہیں۔یہ تینوں (بلکہ چاروں بشمول حفیظ خان صاحب) ''مبینہ نوجوان'' شاید ایک دوسرے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔یہ یک جان و چہار قالب کی سچی اور اُجلی تصویر ہیں۔انھیں ایک دوسرے کی عادات و خصائل اس طرح یاد ہیں جس طرح تبلیغی جماعت کے کارکن کو چھ نمبر یاد ہوتے ہیں۔ان کی دوستی پاکستان اور چین کی دوستی کی طرح مضبوط بنیادوں پر استوار ہے۔ان کے گھر اگرچہ الگ الگ ہیں لیکن حقیقت میں یہ چاروں ایک دوسرے کے دل میں رہتے ہیں۔

حفیظ خان کا ذکر ہو رہا ہو اور ان کے ''مقربین'' کا ذکر نہ ہو تو بات بنتی ہوئی نظر نہیں آتی۔
جاوید اختر بھٹی کا شمار ان کے قریبی دوستوں میں ہوتا ہے۔بھٹی صاحب فراخ دل اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔اپنے افسانوں کی طرح انسانیت سے محبت ان کی کتابِ زندگی کا منشور ہے۔اور وہ اس سے کسی طور دست بردار نہیں ہوتے۔دل کے کھرے ہیں۔مخالفین سے بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں۔یہ کسی کو چھیڑتے نہیں اور اگر کوئی انھیں چھیڑ بیٹھے تو پھر یہ اُسے چھوڑتے نہیں۔انھوں نے بڑے بڑے ''ادبی معرکے'' سرانجام دیے۔ہر معرکے میں مخالف کو چاروں شانے چت کیا۔ جب مخالفین سے کچھ نہ بن پڑا تو انھوں نے بھٹی صاحب پر مختلف النوع بے سروپا الزامات کا پہاڑ کھڑا کر دیا۔انھیں ذہنی کوفت سے دوچار کیا لیکن بھٹی صاحب نے ہمت نہ ہاری۔نتیجتاً مخالفین کو یہاں بھی منہ کی کھانا پڑی۔جاوید اختر بھٹی چونکہ کتاب دوست آدمی ہیں۔ہر وقت کتابوں میں گھرے رہتے ہیں۔اس لیے ان کا محبوب مشغلہ قدیم کتب کو جدید انداز میں ترتیب دینا ہے۔

رفعت عباس کا شمار بھی حفیظ خان صاحب کے بزمِ خوش نفساں میں ہوتا ہے۔ان کا سراپا کچھ

اس انم کا ہے۔ چہرہ کتابی، رنگ گندمی، ناک مناسب، آنکھیں کچھ بولتی ہوئیں، کچھ کہتی ہوئیں اور کچھ سوچتی ہوئیں۔ یہ کالج جاتے تو ہیں لیکن اس طرح کہ جیسے پرائمری کلاس کا بچہ اپنے والد کے ڈر سے سکول آتا ہے۔ یہ وسیع المطالعہ، وسیع الفکر، وسیع النظر اور وسیع الظرف ہیں۔ لفظوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر موتیوں جیسے معنی تلاش کر لیتے ہیں۔ تہذیب وارضیات سے ان کی محبت بے پایاں ہے۔ اور اس محبت میں کبھی بھی ذرہ بھر بھی فرق نہیں آیا۔

شمیم عارف قریشی، خان صاحب کے تیسرے بڑے ''مقرب'' ہیں۔ بلکہ ''مقرب المقربین''۔ سرائیکی کافی میں ان کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آواز گرجدار ہے اور اس میں مزید گرج ان کا قہقہہ پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی محفل میں بیٹھنے والا بوریت یا تکان کا شکار نہیں ہوتا بلکہ دوبارہ بیٹھنے کی خواہش ضرور کرتا ہے۔ یہ بلا کے بذلہ سنج ہیں۔ خوش رہنا اور خوش رکھنا ان کا نصب العین ہے۔ اور وہ اس میں سرتاپا سرگرم عمل ہیں۔ طبیعت بھی شگفتہ، مزاج بھی شگفتہ، ذوق میں تھوڑی سی رندی جس کی آرائش شاعروں کی فکر میں پائی جاتی ہے۔ آنکھیں متحرک بھی اور روشن بھی بلکہ ''ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں'' کی صحیح مصداق۔ آپ ان سے بات کیجیے ادب وانشاء اور فلسفہ وتاریخ کے عنوانوں پر۔ آپ حیران ہوں گے کہ آپ کس پائے کے ذہین انسان سے ہم کلام ہیں۔ ان سے کسی نے فون پر بات کرنی ہو تو اُسے چاہیے کہ وہ اُن کے گھر پہنچنے سے پہلے پہلے بات کر لے کیونکہ وہ گھر میں کسی کا فون نہیں سنتے۔ کچھ ستم ظریف تو یہاں تک کہتے ہیں کہ شمیم صاحب اپنے گھر میں مہمان کی طرح جاتے ہیں۔ قریشی صاحب انگریزی میں سوچتے، اردو میں تولتے اور سرائیکی میں بولتے ہیں۔

حفیظ خان کسی لابی کا حصہ بنے بغیر ادب کی ترویج میں سرگرم عمل ہیں۔ وہ ادب میں کسی گروہ بندی کے قائل نہیں۔ اُن کا نقطہ نظر صرف یہ ہے کہ ادب تخلیق کرنا ایک مقصدِ عظیم ہے۔ تخلیق کار کو ان چیزوں سے دور رہنا چاہیے۔ ادیب کا مقصد یہ ہے کہ وہ کسی قسم کی مصلحت اختیار نہ کرے اور نہ ہی منافقت سے کام لے۔ بلکہ صدق دل کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے۔ حفیظ خان اس پژمردہ معاشرے میں نہ صرف روشنی اور خوشبو پھیلا رہا ہے۔ بلکہ گھٹن زدہ ماحول میں ہوا کا جھونکا بھی ہے۔

O

(روزنامہ ''جنگ'' ملتان، مڈویک میگزین۔9/دسمبر 2009ء)

محنتوں اور ذہانتوں کا نشان: حفیظ خان

جبار مفتی

بعض لوگ چومکھی لڑنے کے عادی ہوتے ہیں، بیک وقت کئی محاذ کھول لیتے ہیں۔قسمت یاوری کرے تو ہر محاذ پر کامران ہوتے ہیں البتہ حفیظ خان نے یہ چومکھی اپنی محنت اور ذہانت سے جیتی ہے۔وہ ریڈیو پر اناؤنسمنٹ بھی کرتا رہا ہے۔ڈرامہ نگاری میں بھی نام پیدا کیا۔مختلف ماہناموں میں شاہکار افسانے بھی چھپوائے۔یونیورسٹی لاء کالج ملتان کے مجلّہ ''العدل'' کی ادارت بھی سنبھالے رکھی اور ایل ایل بی کا نتیجہ نکلا تو ریگولر طلبہ میں سب سے ممتاز نظر آیا۔آج اسی ممتاز ذہانت کے پیکر سے آپ کی ملاقات کرائی جارہی ہے۔حفیظ خان احمد پور شرقیہ میں 1956ء میں پیدا ہوا۔اس کے والد ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر ہیں۔میٹرک تو بھولپنے میں گزر گیا اس نے کوئی شرارت نہیں کی۔صرف فرسٹ ڈویژن لے کر بیٹھ گیا۔البتہ جب وہ بہاولپور انٹر کالج میں ایف ایس سی کا طالب علم تھا اس نے پر پُرزے نکالنا شروع کیے اور بی ایس سی میں پہنچتے ہی وہ اچھے خاصے کاغذ قلم ''خراب'' کرنے لگ گیا لیکن قلم کاغذ نے بھی اسے معاف نہیں کیا اور اسے سائنس کی دنیا سے نکال کر دم لیا چنانچہ وہ بی ایس سی کے بعد ڈاکٹر بننے کے خواب جھٹک کر قانون کی دنیا میں داخل ہو گیا اور یوں اس سے ہماری ہیلو ہیلو شروع ہوئی۔میں نے اکثر محسوس کیا کہ وہ بولتا کم اور لکھتا زیادہ ہے۔اس نے ریڈیو ملتان کے لیے سرائیکی میں بے شمار طویل

ڈرامے لکھے۔کامیاب ڈرامے..... بچوں اور عورتوں کے پروگراموں میں تو اس نے اس قدر فیچر لکھے ہیں کہ خود اُسے اُن کی تعداد یاد نہیں اور ملک کے مختلف بڑے بڑے اور نامور ماہناموں میں اس کے ان گنت افسانے چھپے ہیں جن پر تبصرہ بذات خود ایک مقالے کا متقاضی ہے۔پھر وہ لاء کالج کے مجلے "العدل" کا ایڈیٹر بنادیا گیا تو ہمیں پتہ چلا کہ وہ اچھا ہی نہیں بہت اچھا شاعر بھی ہے۔اس نے دن رات محنت کرکے کالج کا شاہکار العدل چھاپا اور یوں کالج کی تاریخ میں انمنٹ ہو گیا۔تب امتحان سر پر آئے تو وہ کم کم دکھائی دینے لگا تاہم اس کی آواز ریڈیائی لہروں کے ذریعے ہم تک پہنچتی رہی پھر وہ بہاولپور چلا گیا.....اپنے گھر کے پاس، جہاں اس کی بیوی اور پیارا سا بچہ اس کے منتظر تھے۔گو فاصلہ بڑھ گیا مگر ریڈیو بہاولپور ایک واسطہ بنا رہا ہم اس کی آواز سنتے رہے۔پھر ایل ایل بی کا نتیجہ نکلا تو معلوم ہوا کہ ڈپٹی کمشنر ملتان مہر جیون خان اول آئے اور حفیظ خان دوم، مہر جیون خان پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے امتحان میں شامل ہوئے تھے۔یوں ریگولر (باقاعدہ) طلباء میں حفیظ خان سب سے آگے تھا۔وہ واحد ریگولر سٹوڈنٹ ہے جس نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ہاں یاد آیا اس نے ایک عدد ایم اے بھی کر رکھا ہے تاریخ میں، اس نے بڑے اچھے نمبر لیے تھے۔وہ بیڈمنٹن کا بھی بہت اچھا کھلاڑی ہے۔

قارئین آپ سمجھتے ہوں گے گو حفیظ خان بہت خوش قسمت ہے ہر میدان میں کامیاب ہے کامران ہے، ہاں اپنی محنتوں کی حد تک وہ واقعی بہت کامران ہے مگر وہ باوجود کوشش کے تحصیلدار نہیں بن سکا۔اگرچہ اس نے محنت کی اور ذہانت کی حد تک تمام مراحل طے کر لیے تھے لیکن جب کامیابی کی نوید دوسروں کے ہاتھ میں ہو تو وہ ہاتھ دکھانے سے نہیں چوکتے۔اب بھی بیچارہ حفیظ خان فرسٹ ڈویژن اور سیکنڈ پوزیشن کی ڈگری لیے یونیورسٹی گھوم رہا ہے شاید کہیں اسے نوکری مل جائے۔

O

(روزنامہ "نوائے وقت" ملتان، 10 ستمبر 1979ء)

ہم سب کا حفیظ خان

قاسم سیال

وہ ایک لمبا تڑنگا، ڈیل ڈول اور شباہت والا آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر لگی عینک کے پیچھے چھپی ہوئی آنکھوں کو دیکھا جاتا تو ان سے ذہانت ٹپکتی نظر آتی تھی جبکہ چہرے پر اُ گی مونچھوں نے اس کی شخصیت کو بارعب بنا دیا تھا۔ خواتین کو اس میں کشش محسوس ہوتی تھی جو شاید اب بھی ہوتی ہے۔ جبکہ جوان لڑکے اور بوڑھے انہیں رشک اور حسد کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھتے تھے مگر وہ بہت ہی محبت کرنیوالا لڑکا تھا اور لگتا تھا قائداعظم اپنے پیچھے کام کام اور صرف کام کرنے کے لیے صرف اسے چھوڑ گئے ہوں۔ اس کے اندر ہمیشہ ایک بیقراری اور بے کلی سی رہی۔ اگرچہ وہ اپنے کام کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا مگر اسے خود کو قرار نہ تھا۔ حضرات! آپ سمجھ رہے ہیں شاید میں جاوید چودھری کا کوئی کالم پڑھ کر سنا رہا ہوں، نہیں ایسی بات نہیں۔ کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ عینک کے پیچھے چھپی ہوئی آنکھوں میں جو ذہانت کی چمک ہے اور بھاری بھر کم مونچھیں جو اُن کی شخصیت کو بارعب بنا رہی ہیں، یہ کسی کہانی کا حصہ ہے جو حفیظ خان نے لکھی ہے۔ نہیں ایسی بات بھی نہیں۔ بلکہ یہ باتیں ان دو کہانی کاروں کے بارے میں ہیں جنھوں نے لوگوں کو اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے۔ مگر اس وقت ان کی پوزیشن دیدنی ہے۔ سٹیج پر بیٹھے ہوئے یہ صاحبان نہ اب اٹھ کر باہر جا سکتے ہیں اور نہ ہی بول سکتے ہیں۔ آپ چاہے تعریف کریں یا تنقید، یہ سننے پر مجبور ہیں۔ یہ صاحبان جتنی سنجیدگی اختیار کر لیں۔ جتنا چاہے مونچھیں رکھ لیں

اور اپنی ذہانت کو موٹے شیشوں کے پیچھے چھپا لیں، لوگ ان کی اصلیت سے واقف ہیں ۔آپ پریشان نہ ہوں، وہ والی اصلیت نہیں۔ ''زیرِ پوائنٹ'' ہو کہ ''بے ساختہ'' دونوں پبلک میں اپنے اپنے حلقے میں ایک امیج رکھتے ہیں ۔میرا ان سنجیدہ نوجوانوں سے سوال ہے کہ اپنے اوپر سنجیدگی طاری کر کے دور بھاگنے کی جو کوشش کرتے ہو تو پھر اپنی کہانیوں، کالموں کی معرفت اتنا نزدیک کیوں آجاتے ہو کہ کبھی تو لگتا ہے کہ ہمارے اندر سے بول رہے ہو، کبھی لگتا ہے ہمارے آس پاس ہو، کبھی خودنہارہ کے بھی ہمیں تنہا نہیں چھوڑتے ۔کبھی شہ رگ سے بھی قریب سے بولتے ہو، وہاں تو خدا بولتا ہے کیا تم بھی خدائی کے دعویدار ہو۔ اگر نہیں تو ایسی باتیں کیوں لکھتے ہو کہ تم اتنے اپنے اپنے سے لگنے لگتے ہو اور دور رہ کر بھی پاس ہوتے ہو۔ تم درِاحساس پہ یوں دستک دیتے ہو کہ کسی کو نصیحت بھی محسوس نہیں ہوتی اور پیغام بھی پہنچ جاتا ہے اور تمہارا مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

آج ہم نے باتیں کرنی تھیں حفیظ خان کے بارے میں، جاوید چودھری ایسے ہی لپیٹ میں آگیا ہے۔ اس لیے سیانے کہتے ہیں کہ بری صحبت سے بچنا چاہیے۔ ویسے عرض ہے جاوید چودھری کی تو مونچھیں رکھنا ایک مجبوری ہے کہ انہیں اپنے آپ کو اپنے قلم کے نتیجے میں نکلے ہوئے الفاظ کا پاس رکھنے کی خاطر بڑا بوڑھا بننے کے لیے ان کی ضرورت ہے۔ جبکہ حفیظ خان کی منصفی تو بغیر مونچھوں کے بھی چل سکتی ہے بلکہ معذرت کے ساتھ (آج کل ملک بھر میں منصفی چل بھی بغیر مونچھوں کے رہی ہے) اور ان میں حفیظ خان ایک بارعب جج جو اکیلے بیٹھا انصاف ہوتے دیکھ رہا ہے کیا یہی انصاف ہے؟ خیر افسران ان کے پاس آنے سے اس لیے بھی گھبراتے ہیں کہ ہر وقت ان کے پاس ریٹائرنگ روم ہو کہ ڈرائنگ روم، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا ہجوم لگا رہتا ہے جنھیں یہ اپنی جیب خاص سے کھلاتا بھی رہتا ہے اور ناز بھی اٹھاتا رہتا ہے۔ جج اسے ادیب سمجھتے ہیں۔ مگر ادیب اسے جج نہیں سمجھتے۔ مگر یہ اپنے آپ میں اتنا سمایا ہوا ہے کہ اسے ڈھونڈنا بہت مشکل ہے۔ جب ان کے کولیگ انہیں کہتے ہیں یار خان صاحب میں نے ڈیفنس میں ایک پلاٹ خریدا ہے تو یہ کہتا ہے مبارک ہو، میں نے بھی احمد پور شرقیہ میں اپنا آبائی پلاٹ بیچا ہے۔ ہاں ۔میری ایک بڑی کتاب رفعت عباس کی شاعری پر آئی ہے اور ایک ضخیم کتاب خرم بہاولپوری عنقریب آنے والی ہے۔ جب وہ کہتا ہے یہ رفعت عباس کون ہے؟ تو اسے اس کی کم علمی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یار تم اسے نہیں جانتے۔ سرائیکی

شاعری کا بہت بڑا نام ہے۔ کالج میں پڑھاتا ہے اور خرم بہاولپوری کیا کرتا ہے، جج صاحب۔ میں انہیں مرحوم کہنا بھول گیا تھا۔ سوال ہوتا ہے پھر اس سے فائدہ؟ یار۔ لوگ خرم صاحب کو اس کتاب کے آنے کے بعد مرحوم نہیں کہہ سکیں گے۔ میں اس کا کام لوگوں کے سامنے لا کر اسے زندہ کر دوں گا۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ وہ تو زندہ ہو جائیں گے مگر تم خود کو زندہ رکھنے کے لیے کیا کر رہے ہو۔ جواب آتا ہے، میری باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ اچھا، ہاں۔ میری افسانوں اور کہانیوں پر کئی کتابیں ہیں تو وہ کورس میں شامل ہیں۔ نہیں کورس میں تو میری ڈراموں کی کتابیں شامل ہیں اور اس لمحے میں مداخلت کرتا ہوں، افسانے اس لیے کورس میں شامل نہیں کہ خدا چاہتا ہے ترا نام افسانوں اور کہانی کے حوالے سے زندہ رہے اور لوگ تمہیں پڑھیں۔

وہ بندہ جو بنیادی طور پر کہانی کار تھا اور کمپیئرنگ کے لیے پیدا ہوا تھا۔ اسے ریڈیو نے ڈرامہ لکھنے پر لگا دیا۔ وہ یونیورسٹی میں پڑھاتا رہا۔ پھر ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن افسر بنا۔ ریڈیو پروڈیوسر بنا۔ سی ایس ایس کیا اور پھر اس سے ہٹ کے جج بن گیا۔ مگر اس کے اندر سے نہ کہانی نکلی نہ افسانہ، یہ ڈرامے لکھتا بھی رہا اور کرتا بھی رہا۔ یہ ریڈیو کا بندہ چاہے جتنا بڑا جج بن جائے، اس کے اندر ہمیشہ ریڈیو بولتا رہا ہے یہ ریڈیو کم بخت ایسا ہے جس کے اندر گھس جائے پھر نکلتا ہی نہیں۔

''نوائے وقت'' ملتان میں ''بے ساختہ'' کے نام سے کالم لکھنا شروع کیا تو ایڈیٹر نے کہا تم سب لکھنے والوں سے یہ اچھا لکھتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں مسکراتے ہوئے یہ کام کی بات کر جاتا ہے۔ جو تم روتے ہوئے بھی نہیں کر سکتے۔ میں اس کا کالم اس لیے بھی پڑھتا ہوں کہ......اس کی تعریف اور دوسرے قلم کاروں کے ساتھ مل کر تنقید کر سکوں مگر مجھے ہمیشہ اس میں ناکامی ہوتی ہے اور میں چاہتے ہوئے بھی دشمنی نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی میں اس سے جیلس بھی ہوتا ہوں۔ کبھی سوچتا ہوں جنات سے جیلسی کیسی؟ یہ انسان نہیں۔ کیا روپے کی وجہ سے؟ کیا شکل کی وجہ سے؟ نہیں بلکہ گھنٹوں، بلکہ سارا سارا دن اور رات متواتر کام کرنے کی وجہ سے یہ مجھے جن لگتا ہے۔

اس کی ذات کی اتنی جہتیں ہیں، کس کس کو بیان کیا جائے جبکہ کئی پرتیں ابھی کھلی نہیں۔ جنوبی پنجاب سے پہلا انگلش میگزین The Competitor نکالا تو اسے عروج تک پہنچا دیا۔ اس مردم بیزار شخص کے پاس ہر وقت دوستوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ سوچتا ہوں یہ جب کسی کے پاس نہیں

جاتا تو ہم کیوں اس کے پاس جاتے ہیں ۔مگر پھر قدم خود بخود اس کے پاس اٹھنے کو چل پڑتے ہیں ۔
میری ذات میں جتنا اعتماد اس نے دیا ہے ۔شاید اتنا مجھ میں کبھی نہ تھا ۔پی ٹی ورلڈ پر الیکشن کی لائیو نشریات، وسیب چینل کا مذہبی پروگرام یا ریڈیو ملتان کا دیہاتی بھائیوں کا پروگرام جمہور دی آواز ۔ جہاں سے بھی بلاوا آیا ۔میں نے کہا یار میں گھبرا رہا ہوں کہیں سکی نہ ہو کوئی معقول بہانہ کر لیتا ہوں، مگر اس نے کہا نہیں تم بہت اچھی طرح کر لو گے اور ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی ۔میرا کالم چھپنے پہ پہلا فون ان کا ہوتا ہے کہنا صرف اتنا ہے اس کی ڈراموں کی کتاب "کچ دیاں ماڑیاں" اور افسانوں کی کتاب "وبندی رُت دی شام" پر اکادمی ادبیات سے ایوارڈ کا ملنا یا پی ٹی وی 2003ء میں بیسٹ ڈرامہ رائٹر کا ایوارڈ جیتنا اسے اس کے کام کی وجہ سے ملا ہے اس کی پی آر کی وجہ سے نہیں ۔میں بار بار حفیظ خان کے لیے اس کا لفظ استعمال کر رہا ہوں ۔پتہ نہیں کب جج جاگ اٹھے اور Contempt of court لگ جائے ۔آخر میں اتنی بات، جب اس کی تخلیقات کو پڑھا جائے تو بڑا تخلیق کار نظر آتا ہے اور جب اس کی ذات کو پرکھا جائے ۔تو بڑا انسان، یہ تخلیق کار بڑا ہے کہ انسان ۔اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں میری نظر میں دونوں بڑائیاں اس میں ہیں ۔حیرت ہے یہ پھر بھی بڑائی نہیں کرتا ۔

اور اتنا اچھا دوست دینے پر میں پروفیسر ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز کا شکر گزار ہوں اور آپ سب پڑھے لکھے ادیبوں، شاعروں میں، میں شریف آدمی پھنس گیا ہوں جس میں نہ لکھنے کا سلیقہ نہ بولنے کا ڈھنگ ۔میری کچی پکی باتیں برداشت کرنے کا شکریہ ۔

میں خالد وکیل کی مردم شناسی اور قلم کاری سے انکی محبت کا ثبوت دیکھ کر قائل ہو گیا ہوں کہ ایسی خوبصورت تقریب منعقد کر ڈالی ۔جاوید چودھری بڑے شہروں کی تقریبات میں تو اکثر جاتے رہتے ہوں گے ۔اب چھوٹے شہر کی اس بڑی تقریب کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے ۔

O

(حفیظ خان کے اعزاز میں منعقدہ مظفر گڑھ کی تقریب میں پڑھا گیا، فروری 2007ء)

اپنے ماضی سے جڑا ہوا آدمی

قاسم سیال

ابا سائیں کیا فوت ہوئے مجھ پر دنیا اندھیر ہوگئی۔ ہر وقت جی حضوری کرنے والے مدمقابل آ گئے۔ ہمارے مزارع ہماری زمینوں پر قابض ہو گئے جو کام شروع کیا، اس میں ناکامی اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ سونے کو ہاتھ لگاتا تو مٹی میں بدل جاتا۔ دوست انجان اور رشتہ دار صرف تماشائی بن کر رہ گئے۔ زمانہ یوں آنکھیں بدلے گا یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ہر بندہ اس چکر میں تھا کہ وراثت میں سے کچھ حصہ پر قابض ہو جائے۔ جو گھرانہ پوری برادری کا سرپنچ تھا، سربراہ تھا، دکھ سکھ میں ہر ایک کے کام آنے والا تھا، سربراہ کیا فوت ہوا وہی لوگ سکھ کم کرنے اور دکھ بڑھانے آ گئے۔ طوطا چشمی کیا ہوتی ہے، اس کی عملی تصویر اس وقت دیکھنے میں آئی۔ لوگوں کا سلوک دیکھ کر طوطا بھی وفادار لگتا تھا۔ لگتا تھا ایک چھوٹا بچہ جنات کے قبضے میں آ گیا ہو۔ گھر کا بڑا ہونے کے ناتے باپ کی پگ سر پر باندھنے کی وجہ سے میری ذمہ داریاں بڑھ چکی تھیں مگر میں ابھی پگ کا بوجھ سہنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔

جب برادری نے قل خوانی پہ میرے سر پہ پگڑی رکھی تو میں اسے ایک رسم سمجھا تھا۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ اس کی اہمیت مجھ پر آشکارا ہوتی گئی اور میں احساس ذمہ داری کے بوجھ تلے دبتا چلا گیا۔ مجھے لگتا شاید ابھی میں اتنی بڑی ذمہ داری اٹھانے کا اہل نہیں تھا اور مجھے میری اوقات سے زیادہ

زیر بار کر دیا گیا ہو۔ ابا سائیں نے نصابی تعلیم دلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جبکہ دیگر علوم
اسلامیات و ادبی کتب نانا جان کو جب پڑھ کر سناتا تو شاید کچھ حروف میرے اندر بھی گھر کر جاتے۔
بچپن میں اتنی کتابیں پڑھنا پڑیں کہ شاید جوانی میں بھی نہ پڑھی ہوں اور کتابوں سے عشق میرے
لاشعور میں اتر گیا۔

میں نے تو یونہی اخلاقاً اسے حضرت بہاء الحق ملتانی کے مزار پہ زیارت کے لیے جانے کی دعوت
دی تھی۔ میرا خیال تھا وہ اس آفر کو کوئی معقول بہانہ بنا کے ٹال دے گا۔ مگر مجھے حیرت اس وقت ہوئی
جب اس نے چلنے کے لیے نہ صرف حامی بھر لی۔ بلکہ رات کے پچھلے پہر جانے کا مشورہ دیا اور کہا کہ
میں تو بزرگانِ دین کے مزارات پر آدھی رات بیت جانے کے بعد جاتا ہوں۔ اس نے اپنی بات
جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ابا سائیں کے ساتھ میں نے بیسیوں مرتبہ اُچ سید جلالؒ کے ہاں حاضری دی
ہے کہ وہاں کا چپہ چپہ میری عقیدت و محبت کی گواہی دینے کو تیار ہوگا۔ ابا سائیں بچپن میں ہمیں کندھوں
پہ بٹھا کے یہاں زیارات کے لیے لایا کرتے تھے۔ اب بھی جب کبھی ادھر سے گزر ہوتا ہے۔ یا جب
کبھی سکون کے لمحے نصیب سے میسر آتے ہیں اور میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو اپنے آپ کو ابا سائیں
کے کندھوں پر اُچ کی تنگ گلیوں میں گھومتا پھرتا نظر آتا ہوں۔ کاش وہ لمحے رک جاتے، امر ہو جاتے
کہ تصور میں جن انمول لمحوں کا میں اسیر ہو چکا ہوں۔

میں اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا اور نوکری کی تلاش میں تھا۔ جہاں جاتا ناکامی میرا استقبال کرتی اور
نامرادی میرے قدم چومتی۔ انہی دنوں اخبار میں میرے نام کے ساتھ ایک زوردار مضمون
چھپا۔ ''محنتوں اور ذہانتوں کا نشان'' جو افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، کمپیئر، براڈ کاسٹر چوکھی لڑائی لڑنے والا
بندہ جس نے لاء کالج میں ٹاپ کیا، وہ فٹ پاتھ پر فرسٹ کلاس کی ڈگری لیے اور اپنی تمام محنتیں اور
ذہانتیں ہاتھ پر دھرے گھوم رہا ہے کہ شاید اُسے کہیں نوکری مل جائے۔ ادھر بے روزگاری کا عالم اور
سونے پر سہاگا یوں ہوا کہ میرے چھوٹے بھائی پر جو کہ پولیس میں تھا، اس پر قتل کے الزام میں مقدمہ
بن گیا جبکہ ہم صریحاً جانتے تھے کہ مقتول زندہ ہے مگر ثبوت نہ تھا۔ اماں کی حالت دیدنی تھی۔ ایک ابا
سائیں کی جدائی دوسرے بیٹوں پر پے در پے مصائب۔ مجھے سے ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی

میں جس در پر بھی اپنی مدد حاصل کرنے پہنچا اسے اپنے لیے بند پایا۔ آخر جگہ سے مایوس ہو کر ایک شب لیٹا ہوا تھا، پریشانی سے نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رات کے پچھلے پہر گھر میں کسی کو بتائے بغیر میں اٹھا سیدھا قبرستان ابا سائیں کی قبر پر پہنچا اور انھیں دکھوں اور پریشانیوں سے آگاہ کیا۔ میں نے کہا: ''ابا سائیں آپ اپنے سارے بخت تخت اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔ ابا سائیں میں کیا کروں کوئی میری اس مصیبت کی گھڑی میں انگلی پکڑنے والا بھی نہیں۔ میں اکیلا ہو گیا ہوں۔'' میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا اور ابا سائیں، ابا سائیں کہتے کہتے میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ شاید ہی اس سے پہلے یا اس کے بعد میں اتنا رویا ہوں۔ میرے آنسو رکنے میں نہیں آ رہے تھے۔ میں جی بھر کے رویا پھر مجھے یاد نہیں کب میری آنکھ لگی۔ بس اتنا یاد ہے مؤذن فجر کی نماز کے لیے اذان دے رہا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ابا سائیں کی قبر کے ساتھ لپٹے اور لیٹے ہوئے پایا۔ اس آخر دسمبر کی سرد اور ٹھٹھرتی ہوئی رات میں میرا وجود سُن ہو چکا تھا۔ وہ سردی اب بھی کبھی کبھار میرے وجود میں در آتی ہے اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے۔ جب ابا سائیں کی یاد میرے پورے وجود میں گھر کر لیتی ہے اور میں ان کو سانسوں سے بھی قریب پاتا ہوں۔ خیر جب میں بیدار ہوا تو قبر کو اپنے ہاتھوں اور بانھوں سے آزاد کیا۔ مجھے ایسا لگا صاحبِ قبر نے میرے اندر کے سارے دکھ درد سمیٹ لیے ہیں اور میرا سینہ ایک نور سے بھر گیا ہے۔ میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

اگلی صبح میرے لیے کامیابیوں اور کامرانیوں کی نوید لے کر آئی اور پھر ہر صبح مجھ پر مہربان ہوتی چلی گئی۔ کامیابی کے دروازے مجھ پر خود بخود کھلتے گئے۔ میرے لیے نوکریاں حاصل کرنا اور چھوڑنا ایک مشغلہ بن گیا۔ جہاں جاتا ایسے لگتا انٹرویو کی گیم صرف مجھے منتخب کرنے کے لیے سجائی گئی ہو اور پھر وہ زندہ مقتول بھی برآمد ہو گیا۔ لوگوں کے رویے حیرت انگیز طور پر تبدیل ہوتے گئے اور کامیابی میرے قدم چومنے کو ہر لمحہ بے قرار رہنے لگی اور میں نے یہ سب کچھ اس کی قبر سے پایا جو خود زندگی بھر بزرگوں کے مزاروں کی گلیاں چھانتا رہا تھا۔ اس نے کہا میں تو تمہارے ساتھ ضرور جاؤں گا مگر رات کے پچھلے پہر دن کو وہاں جانے میں مجھے اپنے آپ سے ریاکاری کی بو آتی ہے۔ میں جب بھی کسی مزار پر جاتا ہوں مجھے لگتا ہے میں نے ابا سائیں کی انگلی پکڑی ہوئی ہے۔ مجھے صاحب مزار کے ساتھ ساتھ

اپنے آس پاس ابا سائیں کا سایہ بھی محسوس ہوتا ہے۔

حفیظ خان مسلسل بول رہا تھا۔اب اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔اس کی آنکھوں کے کونے گیلے ہو چکے تھے۔وہ جب ابا سائیں کہتا اس کی آواز رندھ جاتی۔وہ اب بھی اپنے ابا سائیں کی کوئی بات مجھے بتانا چاہتا تھا۔انصاف کی مسند پر بیٹھنے والا یہ بڑا آدمی مجھے ایک معصوم بچہ لگا۔اس کی آواز پہلے لرزی۔اس نے اپنی پوری طاقت صرف کی کہ اپنی لرزتی آواز پر قابو پالے مگر شاید ناکام ہوگیا۔ اس کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔میں اسے کسی بھی کوشش میں ناکام ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔اس لیے اس سے پہلے کہ اس کی ہچکیاں بندھ جاتیں میں نے اس کے ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں کو دیکھا جو شاید اس کے لیے کسی اور کامیابی کا پیش خیمہ بننے والے تھے اور چپکے سے بغیر بتائے وہاں سے اٹھا اور اپنی ناکامی کی کہانی اپنے بابا سائیں کو سنانے اپنے آبائی قبرستان چل پڑا جہاں جا کے میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔اپنے کسی پیارے سے گلے لگ کر اپنا دکھ درد بانٹ کر درد دور ہو جاتے ہیں۔جب میں آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر کے اپنے بابا سائیں سے مل کر واپس آرہا تھا تو سوچ رہا تھا والدین زندگی بھر دیتے رہتے ہیں اور بعد از وصال بھی جب سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو ان کا در کھلا رہتا ہے۔وہ اولاد کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے اطمینان اور سکون کی دولت ہمیشہ کسی نہ کسی بابے سے، ہی ملتی ہے۔چاہے وہ ابا سائیں کے روپ میں ہو یا کسی بزرگ بابا سائیں کے روپ میں۔

O

(''ابابیل محوِ حیرت ہے''ص: 72 تا 75)

حفیظ خان: دھوپ میں چھاؤں جیسا

شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی

بدن مہتاب جیسا ، قدوقامت کہکشاں جیسا
ہمارے شہر میں اک آدمی ہے آسماں جیسا

میری چوتھی کتاب ''خاکہ کہانی'' شائع ہوئی تو میں جناب حفیظ خان کو پیش کرنے کے لیے اُن کی رہائش گاہ واقع سخی سلطان حاضر ہوا۔ اُن کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے خوبصورت فلیپ لکھ کر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ کہنے لگے:

''یوں تو ہم بڑے بڑے لکھاریوں کی تحریروں کا تیاپانچا کرنے پر آئیں تو اُن کی مٹی پلید کر کے رکھ دیں مگر حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔''

پہلی ملاقات میں اُن کی عظمت کا ایک نشان دل میں لے کر میں واپس آیا کہ:

رکھتے ہیں جو اوروں کے لیے پیار کا جذبہ
وہ لوگ کبھی ٹوٹ کر بکھرا نہیں کرتے

دہرے بدن کے سادہ طبیعت انسان، عہدے کے لحاظ سے عدالت کے پردھان مگر غرور نہیں، آدمیت اُن کی پہچان، خوش اخلاق، خوش گفتار، دل بھی شگفتہ، طبیعت بھی شگفتہ، گھنی پلکیں،

گورا رنگ، مسکراتا ہوا چہرہ، خوش لباس اور خوش مزاج، آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک لگاتے ہیں جن میں سے شرافت اور بصیرت جھانکتی ہے۔ خوش لہجہ و خوش کام ایسے کہ زبان سے الفاظ نہیں گویا شاخوں سے کلیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ ادبی دنیا میں ایک متحرک، ایک مستعد کردار جو اپنے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ قلم و قرطاس کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔ صحافت اور ادب ایسے لوگوں کے دم سے زندہ اور قائم و دائم ہے۔ اردو، انگریزی اور سرائیکی میں ترت پھرت لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی کئی شاہکار تخلیقات منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ تحریر میں روانی اور طغیانی اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔ ادبی حلقوں میں اُن کا ایک شہرہ ہے۔ قدرت نے انھیں ذہنی لطافت و پاکیزگی کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ وہ انسان کو ڈسنے والے سماج میں رہ کر بھی انسان سے پیار کے آرزومند ہیں۔

رکے تو چاند ، چلے تو ہواؤں جیسا ہے
وہ شخص دھوپ میں دیکھو تو چھاؤں جیسا ہے

O

(فروری 2009ء)

حفیظ خان کی تخلیقات

وسیب کی تہذیبی وتاریخی بازیافت کا عندیہ ہیں

معروف سرائیکی محقق ونقاد حفیظ خان کے اعزاز میں ڈسٹرکٹ ہال مظفرگڑھ میں تقریب

محبوب تابش

کسی بھی معاشرے میں فنون لطیفہ کو پیداواری عمل کے قریب تر سمجھا جاتا ہے کیونکہ تخلیق کا عمل نئے انسان کی بازیافت اور بعض اوقات تھک کر پیچھے رہنے والے لوگوں کو حوصلے اور امید کی توانائی فراہم کر کے زندگی کے رواں قافلے میں شامل کرنا ہوتا ہے۔اس بات کا اظہار ہمارے مختلف تہذیبی وثقافتی اور قومی تہواروں میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

اس روایت کو آگے لے کر چلنے والے لوگ اپنی قوم کے زندہ باشعور افراد میں گردانے جاتے ہیں۔گزشتہ دنوں سرائیکی وسیب کے معروف ادیب، ڈرامہ نگار، کہانی کار، شاعر اور کالم نگار حفیظ خان کے اعزاز میں ایک تقریب ڈسٹرکٹ ہال مظفرگڑھ میں منعقد کی گئی جس میں عمومی شرکاء کے علاوہ وسیب کے ممتاز ادیبوں شاعروں اور دانشوروں نے شرکت کی۔تقریب کی صدارت معروف کالم نگار جاوید چوہدری نے کی اور مہمان خصوصی کی مسند پر پروفیسر جاوید چانڈیو اور ظہور احمد دھریجہ موجود تھے۔نظامت کے فرائض قاسم سیال نے سرانجام دیئے۔تقریب میں حفیظ خان کی شخصیت اور فن پر

مقالات مضامین پڑھے گئے۔اس موقع پر قاسم سیال نے اپنی گفتگو میں کہا'' حفیظ خان ہمارے خطہ کا ایسا تخلیق کار ہے جسے جج ،ادیب سمجھتے ہیں اور ادیب جج۔یوں ان کی شخصیت ایک دہرے مسئلے کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے لیکن انہیں اپنے ادیب ہونے پر یقین ہے۔''سویل'' کے رکن سید مظفر بخاری نے کہا ''حفیظ خان اپنے فن کے اعتبار سے عہد در عہد ہم پر کھلتا رہے گا۔اس تقریب کے منتظم و میزبان خالد ڈیل نے کہا حفیظ خان محنتی قلم کار ہے ان کی تحریریں عالم حیوانات میں انسان کو ملنے والے امتیاز کی گواہی کے طور پر سامنے آئی ہیں۔محبوب تابش نے حفیظ خان کی شخصیت و فن پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ حفیظ خان اپنی تمام تر تخلیقات میں دھرتی کے ساتھ جڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔چاہے ان کی کہانی ہو یا ڈرامہ شاعری ہو یا تنقید ،ان کا تنقیدی شعور بھی قومیتی بیداری اور وطن پرستی پر منتج ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی تنقید کے ذریعے اس خطے کے قومی لاشعور کو دریافت کر کے تاریخ کی تفہیم کا ایک نیا در وا کیا ہے۔اس کے بعد پروفیسر ریاض سنڈھر نے اپنے مقالے میں کہا'' حفیظ خان نے سرائیکی نثر کو توانائی فراہم کی ہے۔انھوں نے کہانی اور ڈرامے کی زبانی تھیٹر کی بصری روایت کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔ان کا یہ حوالہ سرائیکی ادب میں انہیں معتبر کرتا ہے۔معروف سرائیکی سکالر سجاد حیدر پرویز نے کہا حفیظ خان کی شخصیت کے بے شمار پہلو ہیں ۔ان کی شخصیت پرت در پرت موضوعات کی حامل ہے۔ہر دفعہ انہیں مل کے یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ کی ملاقات ایک نئے حفیظ خان سے ہوئی۔سرائیکی وسیب کی نمائندہ ادبی ثقافتی و تحقیقی تنظیم ''سویل'' کے مرکزی عہدیدار پروفیسر رفعت عباس نے اپنی گفتگو میں کہا کہ حفیظ خان کے ساتھ کلام کرنا یہاں کے لاکھوں لوگوں کے ساتھ کلام کرنے کے مترادف ہے۔سرائیکی خطے میں حفیظ خان اپنی فکر کے اعتبار سے ایک نئی علامت کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ہم نے اس معاشرے میں عورت کو جو مقام دیا ہے حفیظ خان کی کہانی میں عورت کو وہ جگہ قبول نہیں۔ان کی کہانی کی عورت مضبوط آزاد اور خود مختار ہے جو ان نام نہاد سماج کو قبول نہیں۔اگر حفیظ خان کی کہانی یہاں کے تعلیمی نظام کا حصہ ہو تو مختار مائی جیسے مقدمات کے ذریعے پاکستان کو ساری دنیا میں اس طرح نہیں دکھایا جائے گا۔ہم اپنی نسل کو 1906ء سے پہلے کی تاریخ پڑھانا نہیں چاہتے اور دوسری طرف محمد بن قاسم سے پیچھے نہیں جاتے۔جبکہ اپنی تہذیبی تاریخ کے

ہزاروں سال سے بھی زیادہ قدیم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ۔حفیظ خان کے تنقیدی شعور نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ ہم پہلی مرتبہ اس دھرتی کے وارث پن کے حقیقی احساس سے گزر رہے ہیں۔

سپین پر آٹھ صدیاں حکومت کرنے کے باوجود عربوں کو اپنے وطن لوٹنا پڑا۔اسی طرح برصغیر پر اڑھائی صدیاں حکومت کرنے والے انگریز بھی بالآخر برطانیہ واپس پہنچے۔اسی طرح ہمیں بھی اس دھرتی پر مسلمان قبضہ گیر کے طور پر نہیں بلکہ دھرتی کا بیٹا بن کر رہنے کی صورت میں بقاء مل سکتی ہے۔اگر مصر کے لوگ مسلمان ہونے کے باوجود اہرام اور ان سے ملنے والی ممی کے وارث ہیں تو سرائیکی قوم اپنے تہذیبی، تاریخی اور ثقافتی ورثے کی کیونکر مالک نہیں ہوسکتی۔ہماری شاعری میں نظریہ پاکستان سے زیادہ خوبصورت پاکستان موجود ہے۔اقبال کے نظریہ وطن پرستی نے ہمیں نقصان پہنچایا۔اب سرائیکی بیداری ان تاریخی اور فکری مغالطوں کی متحمل نہیں ہوسکتی۔سرائیکی دانشور اور معروف صحافی ظہور احمد دھریجہ نے اپنے مخصوص انداز میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہر فنکار کا کامیاب حوالہ اس کی دھرتی اور مٹی سے محبت اور لگاؤ کی صورت میں سامنے آتا ہے اور مجھے یہی بات حفیظ خان کی تخلیقات میں نظر آئی ہیں۔انھوں نے کہا کہ مجھے حفیظ خان کی کہانیوں میں علامتی جبر کا اظہار آج مظفر خان شہید کے نام پر آباد مظفرگڑھ کی پسماندگی کی صورت میں نظر آرہا ہے۔انھوں نے کہا کہ سرکاری نظام تعلیم میں شامل لوگ ہمارے قومی ہیرو نہیں بلکہ لٹیرے ہیں ہمارا ہیرو سردار کوڑے خان ہے جس نے ہزاروں ایکڑ اراضی اس دھرتی کے لوگوں کے لیے وقف کی۔ہمارا ہیرو سردار قیوم خان جتوئی ہے جو آج پنجاب حکومت کے گلے میں کانٹے کی طرح اٹکا ہوا ہے۔

''سویل'' کے چیف کو آرڈینیٹر شمیم عارف قریشی نے کہا کہ حفیظ خان کا تخلیقی عمل ہم سے تاریخی شعور کا تقاضا کرتا ہے اور ان کی تنقید اس وسیب کی تہذیبی بازگشت کو ساتھ لے کر چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔حفیظ خان کے ہاں یہ احساس اپنے پورے چہرے کے ساتھ ملتا ہے کہ ہم نے ان تمام زبانوں کا احترام کیا جنھیں فقیر، صوفیاء، بادشاہ اور حملہ آور یہاں لے کر آئے لیکن اس سارے تناظر میں ہم نے اپنی ماء بولی سے رشتہ منقطع نہیں کیا۔کیونکہ ایک باشعور آدمی تمام حوالے چھوڑ کر دھرتی کے حوالے کو

تھامے رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ہم ابھی تک منتظر ہیں کہ ہم نے آخری زبان کے طور پر کس زبان کو بولنا ہے۔

ہمارا آشوب سانحہ کربلا سے بھی بڑا ہے کیونکہ میدان کربلا میں ایک عورت بھی شہید نہیں ہوئی جبکہ سقوط ملتان میں نواب مظفر خان اپنے چھ بیٹوں اور ساتویں بیٹی سمیت شہید ہوا۔حفیظ خان کے فن پارے اسی تاثر کو لے کر اپنے لوگوں سے ہم کلام ہوئے ہیں کہ جو لوگ اپنی تاریخ سے انکار کرتے ہیں اور اپنی ماء بولی کو بھلا دیتے ہیں وہ خود دائمی غلامی کو اپنے لیے منتخب کر لیتے ہیں۔ان کے بعد تقریب کے مہمان خصوصی پروفیسر جاوید چانڈیو نے منفرد انداز میں حفیظ خان کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ حفیظ خان بنیادی طور پر افسانہ نگار ہے جس سے اس کا ڈرامہ نگار، شاعر، کالم نگار اور نقاد توانائی حاصل کرتا ہے۔ان کی کہانیاں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ سماجی حیثیت کھونے والی عورت پھر سے زندہ ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔یہ سماج جس کے تاریخی حوالے میں موہنجوداڑو اور ہڑپہ جیسے شہر موجود ہیں جہاں کبھی عورت کو بالادستی حاصل تھی۔آج اسی دھرتی خاص طور پر مظفر گڑھ میں مختار مائی کے حوالہ سے عورت کا ایک عجب حوالہ سامنے آیا ہے۔وہی سماج جس میں عورت سب سے معزز تھی اور آج سب سے بدتر۔اگر اس حقیقت کو تاریخی پس منظر میں دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ترکوں، افغانوں، مغلوں، منگولوں اور دیگر حملہ آوروں نے کس طرح ہماری شکلیں بگاڑی ہیں۔اپنے اسی مسخ شدہ چہرے سے حقیقی چہرے کی بازیافت حفیظ خان کی کہانی میں موجود عورت کی صورت میں نظر آتی ہے۔

تقریب کے ''گھوٹ'' حفیظ خان نے تمام احباب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ سٹیج پر مسلسل بیٹھنا اور اپنے بارے میں سننا نہ صرف مشکل ہے بلکہ جاں کش بھی۔انھوں نے کہا کہ میری تمام تخلیقات مقامی بندے کو یہ باور کرانے کی کوشش ہے کہ اسے اپنے آپ پر بہت زیادہ اعتماد کی ضرورت ہے۔

آخر میں صاحب صدر معروف کالم نگار جاوید چودھری نے کہا ہزاروں سال پہلے جو زبانیں مضبوط تھیں آج کمزور ہو رہی ہیں۔سرائیکی قوم خوش قسمت ہے کہ اسے حفیظ خان جیسے دانشور اور ادیب نصیب ہوئے ہیں۔انھوں نے کہا کہ جو قومیں یونیورسٹیوں، کتابوں اور تہذیبوں کو محفوظ

رکھتی ہیں انہی کا کلچر مضبوط ہوتا ہے اور وہی دائمی بقا کی طرف گامزن رہتی ہیں۔انہوں نے کہا کہ سرائیکی پاکستان کی سب سے میٹھی زبان ہے۔میری خواہش ہے کہ یہ تہذیب وثقافت قائم رہے۔ سرائیکیوں کو اپنے خطے کی خوشحالی اور اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے جدوجہد کرنا ہوگی۔کوئی بھی آسمان سے یا کسی اور جانب سے آ کر آپ کے دکھڑے دور کرنے والا نہیں۔

O

(روزنامہ ''خبریں'' ملتان، 2/مارچ 2007ء)

ذاتی کوائف

تصانیف:

کچ دیاں ماڑیاں	سرائیکی میں ڈراموں کی پہلی کتاب (اکادمی ادبیات پاکستان سے ایوارڈ یافتہ)	1989ء
ویندی رُت دی شام	سرائیکی افسانے (اکادمی ادبیات پاکستان سے ایوارڈ یافتہ)	1990ء
ماماں جمال خان	سرائیکی میں بچوں کے ڈراموں کی پہلی کتاب	1990ء
اتفاق سے نفاق تک	پاکستان کی آئینی تاریخ کا ایک فسوں خیز باب	1993ء
یہ جو عورت ہے	اردو افسانے (اشاعت دوم: ۲۰۰۴ء، سوم: زیرِطبع)	1997ء
پہلی شب تیرے جانے کے بعد	اردو نظمیں	1999ء
خواب گلاب	بچوں کے سرائیکی ڈرامے	2003ء
اندر لیکھ دا سیک	سرائیکی افسانے	2004ء
رُٹھڑے پَندھ	سرائیکی ڈرامے	2005ء
رفعت عباس کی سرائیکی شاعری	تحقیق و تنقید	2006ء
خرم بہاولپوری: شخصیت، فن اور منتخب سرائیکی کلام	تحقیق و تنقید	2007ء
حفیظ خان کی کہانیاں	منتخب سرائیکی کہانیوں کا اردو روپ	2007ء
کوئی شہر یں جنگل ٹوکدا	سرائیکی ٹیلی ڈراما سیریل	2008ء
اس شہرِ خرابی میں	کالموں کا مجموعہ	2008ء
سرائیکی ادب: افکار و جہات	تنقید	2009ء

زیرِ طبع کتب

پٹھانے خان کی گائیکی اور سرائیکی لوک ثقافت کا ارتقاء	تحقیق وتنقید
ہِک رات دا سجھ	سرائیکی ٹیلی ڈراما سیریل
ملتان، سدا آباد	ملتان کی تاریخ کا بےلاگ تجزیہ
دیوانِ خرم بہاول پوری	خطے کے ایک عظیم شاعر کے کلام کی تدوین

اعزازات:

(الف)	رول آف آنر	(یونیورسٹی لاء کالج ملتان)	1978ء
(ب)	ہجرہ صدارتی ایوارڈ	(اکادمی ادبیات پاکستان)	1989ء
(ج)	ہجرہ صدارتی ایوارڈ	(اکادمی ادبیات پاکستان)	1990ء
(د)	جشنِ تمثیل ایوارڈ	(ریڈیو پاکستان ملتان)	1991ء
(ر)	بہترین سرائیکی ڈراما ایوارڈ (پی ٹی وی ایوارڈ)		2003ء

Shabbir Hasan Akhtar (Maloohia-Sada Suhagan) have not been understood in real perspective by the Seraiki literary circles. There he is right, and one hopes that this well-written book will be widely welcomed by the concerned literary quarters. Had the original text been included, purpose would have been served better.

(Daily DAWN, May 23, 2006)

differently. One group was led by Ashiq Buzdar, the author of Asan Qaidi Takht Lahore Dey, Mahr Abdul Haq, Aslam Rasulpuri, who concentrated on anti-Punjabi themes, while the other more mature group included Ashu Lal Faqir,

Riffat Abbas and Irshad Taunsvi who worked with special reference to the past political and cultural aspects of the region with Multan as its centre.

The former group in its writings did its best to prove that Multani or Seraiki or Riyasati was altogether a different language from the language first known as Hindvi and then Punjabi. They used the most archaic vocabulary to prove their point of view. But their most appreciable effort was the glorification of a vibrant past in their verse. Ashu Lal Faqir has had four collections of verse to his credit. It is not just a versification of history but also an artistic evaluation and interpre tation of the past. Riffat Abbas has so far contributed six collections of verse of high merit. His only weakness is the use of difficult vocabulary and a new system of symbols to which even the well-read Seraikis are not familiar.

Prof Abid Ameeq, another poet and intellectual of Seraiki, has a different point of view. He believes that all the dialects spoken in the west and the east Punjab have common roots without which no dialect, not even Seraiki, can flourish. Any deliberate attempt to earn a separate linguistic identity will be unnatural and disastrous for the great literary heritage of Punjab. Whether this realisation is there in the south or not, Ilaleez Khan is conscious of the fact that the message of Riffat Abbas should reach and be understood by the people of the region. He has written the book in Urdu, with many quotations from his poetry culled from all his collections, particularly from Probharey Hik Shahr Ichon, in which he identifies the people with the Das of (or Darawarrs) of theVedas.

Hafeez Khan again and again insists that Riffat, Asu Lal and

the local population was mainly nomad and not inclined towards farming. Almost the same story was repeated when the Sutlej valley project in Bahawalpur was implemented and finally, after partition, Muslim agrarian population of the whole of East Punjab and states like Patiala, Jindh and Loharu, was forced to replace the non-Muslim agriculturists in the whole of the colonised areas - upto Thai and Sargodha in the north and Rahim Yar Khan and Dera Ghazi Khan in the south.

This exchange of population brought some minor cultural and linguistic differences among the local people, the settlers and the Mohajir sections. But there was another big difference in the local and Mohajir communities. The latter belonged to lower-middle and middle classes while the former were under the control of big feudal and tribal chiefs who are in the habit of keeping their people under their strict economic and social control. This class of feudals was gravely threatened by the lower classes , of upper Punjab in the 1970 elections. Though ZA Bhutto's PPP had opened its gates to the threatened local feudals and tribal chiefs, fear persisted among them. It was the question of political survival of the ruling classes of southern Punjab and the interior of Sindh which turned into a conflict at sub-cultural and linguistic level and the first Seraiki Conference was held in Multan.

The conflict was deliberately aggravated by General Ziaul Haq who indirectly created a wedge between the Karachi Mohajirs and the local Sindhis on the one hand, and between south Punjab and central Punjab on the other. The only object was to deprive Bhutto of his immense popularity among poor sections of the central and the northern Punjab, and the settlers. It was also meant to create different centres of loyalties for the settlers - Mohajirs and the locals of south Punjab on the basis of the different dialects of the same language.

In this background local writes and intellectuals of the South behaved

Sharing the Past

RIFFAT ABBAS KI SERAIKI SHA'ERY

IN Chadmama written before 750AD Multan was one of the provinces of Sindh and its northern borders touched the bound-varies of Kashmir. After some 600 years, in 1327, Ibn Batuta says: "Multan is the capital of Sindh and Amirul Umara of the province lives there."

When Alexander invaded India in 325-26 BC, the area between the Chenab and Jhelum was ruled by the Poros, while the southern part was under the command of the Malloi tribe, but its ruler's name has not been mentioned anywhere. The most important episode of Multan or Tulumba is that Alexander was hit by an arrow while scaling the walls of the Multan Fort.

During the Muslim and Mongol invasions, Multan was either a sovereign state or a province of the Delhi empire. During the regime of Muhammad Shah, Multan came under the control of Lahore's governor Abdus Samad Khan and when the writ of Delhi government was non-existent, it became part of Kabul and Pathans were the rulers, succeeded by Sikhs. Ran jit Singh made it a part of the Lahore Darbar. It remained a province till the British invasion when it was made a part of the Punjab province, with Lahore as its capital.

It was colonisation under the British which necessitated the bringing in of skilled agricultural man power from other areas of Punjab, including the Lehnda and Potohar areas, the central and the eastern regions of Haryana, the Doaba and the Majha. The main reason was that

KHA'B GULAB

Radio plays for children by Hafeez Khan

HAFEEZ Khan has so far contributed six books of dramas and short stories to Seraiki and Urdu and the last one is a collection of his radio dramas broadcast from the Multan and Bahawalpur radio stations where Hafeez also served as a programme producer. Now a senior member of the Punjab judiciary, Hafeez still feels concerned child about education and training. These scene plays were broadcasted from Multan and Bahawalpur stations in the seventies and were much liked by the listeners. They would certainly be liked by Seraiki readers.

****

(Daily DAWN, January 18, 2005)

and their ŋaya (subjects), and one comes to know that feudals are still the masters of the body .and soul of tenants, village workers and domestic servants of these tyrants. It is clear that nothing has changed in the domain of I he feudals who allegedly had to face many so-called agrarian reforms. Hafeez Khan knows the art of story telling.

***

(Daily DAWN, April 21, 2005)

These weie also penned for broadcasting, and it was a popular series.

For the next five years, Hafeez Khan continued writing but no book could be published. He is not only a prose writer but also a poet. His poetic collection of Urdu verse was published in 1999, and the year before that a collection of Urdu short stories, Yeh Jo Aurat Hey, was published. Three years thereafter, another collection of children's plays, Khwab Gulab, appeared followed by another book of short stories Andar Lekh Da Saik...Seraiki Afsaney, as the writer puts it.

The book under review is thus the seventh book by the author who writes pure dialect, welcomed both by the Bahawalpur Islamia University and the Bahauddin Zakariya University, Multan. One hopes that it will also get the favour of the Punjabi department of the Punjab University.

The book under review is a collection of nine stories, all except two, in rural perspective. This story is about the after effects of partition of Punjab. The main character is a photographer, Nafees Ahmad, who lost his fiancee during the riots of August, 1947. The family of his would-be in laws first suffered at the hands of non-Muslim miscre ants in their home towns and later at the hands of the people of the God-gifted land of the pure. A poet had said on partition:

Chalo achlia hua woh bach kay
aaey kufr kay ghar say,
Khuda kay ghar mein laikin
sokhtu janon pc kia guzri?

The photographer's fiancee and his sister were forced by circumstances to become prostitutes. When after 30 years he comes to know of the death of his fiancee, he commits suicide after donating his shop and flat to a mosque.

The other stories are about the political and social village chiefs

Stories from the feudal belt

ANDAR LEKH DA SAIK by Hafeez Khan; pp!144; Price RS:150 Publishers: Al-Hamd Publications, Rana Chambers, Lake Road, Chowk Purani Anarkah', Lahore.

HAFEEZ Khan is associated with the judiciary but before 'that he was writing dramas for Bahawalpur and Mnltan radio stations. It was also at the radio, where he worked as transmission officer and producer. Being an all-rounder he also documented many official and non-official programmes. He started taking part in literary activities from his college days at Bahawalpur.

He comes from a learned family. His father was a keen reader of world history, Islamic world affairs and comparative religion. There was a good collection of books on these subjects, and Hafeez somehow had to read these books out to his maternal grandfather who had lost his eyesight. That is how he was thrown into the sea of knowledge. That was not his option, but it interested him and, thus, he learnt how to write what he observed.

He had started writing in Urdu, and his first short story appeared in a national literary magazine in 1973. It was the Bahawalpur radio which attracted him more, and Hafeez Khan started writing plays in Seraiki. His first book was a collection of these plays and was published in 1989, titled, Kach Dian Maarrian. The next year he was credited with the first collection of Seraiki short stories, Vaindi Rut Di Sham. His plays for children, Mama Jamal Khan were published the following year 1991.

came back home, asked her wife to cook a meal for Allah Wasaee, took a bath with warm water and lay down in his bed, waiting. He called his wife and told her that he had taken a bath and there would be no need to give him another ghusl, recited the Kalma and said goodbye to the world. Lahore, Thursday, April 21, 2005

****

(DAWN Lahore, FRIDAY, APRIL 13, 2007)

Africa; but his father did not allow him to go.

Khurram enjoyed the company of some well-placed officials like Sheikh Abdul Qadir, education minister Maj Shamsuddin, Brig Nazeer Ah' Shah, military secretary to the nawab, and Faqir Sirajuddin, chief judge of the Bahawalpur, but never accepted their patronage in service matters. He was also invited by Usman Ali Khan, the nawab of Hayderabad Deccan, where he was treated as a VIP but returned to his ancestral city where Haider Bandi Multani, a beautiful singing girl, always welcomed him. Khurram paid tribute to Bandi in following lines:

واہ مکھڑا حیدر باندی دا
جیویں چندر چڑھیا ہے چاندی دا
ایہہ ڈوجہاں دا مل کائی نی
ہک رات دی بانہہ سر ہاندی دا

....

بہوں شخصا آکھدن
کوئی خرم اج ہے مر گیا

(Bandi's face is beautiful like the silver moon. One night's stay with her is more valuable than the two worlds put together)

But once he turned against Haider Bandi, he wrote a satirical poem about her which forced her to retire to the city of her origins, Multan. Khurram was a regular visitor to Gri Ganj Bazaar, the Heera Mandi of Bahawalpur, where Allah Wasaee, a singer, was the focus of the elite of the city. She sang a kafi by Khurram on Delhi radio before partition. Khurram was himself a connoisseur of classical and folk music and composed the tunes of many of the songs sung by Ganj Bazaar girls.

According to Haieez Khan, on the last day of his life, Khurram wenf to Ganj Bazaar, bought some meat and vegetables, met Allah Wasaee, kissed her and invited her over for a dinner at his home. He

They may be Bahawalpuri, Multani or Lahori, but actually they have all ignored Khurram who was hailed as Ghalib-o-Khusro Sard by Maulana Zafar Ali Khan and as Malikul Shua'ra and Firdausi-i-Waqt by Sir Sheikh Abdul Qadir who had served the state of Bahawalpur for some time. With reference to Lahore and other parts of Punjab, Khurram came in the limelight in the early 1950s when, most probably on the suggestion of Zahoor Nazar, he presided over a musha'ira of the Progressive Writers Association in their first conference since the creation of Pakistan. The event upset the pro-West government. Khurram left Lahore after the poetic recital, and the next day the police were there at his house to interrogate him. His well-wishers in Multan immediately prepared an apology on his behalf — saying he did not subscribe to the ideology of the progressives and had been forced by some friends to preside over the function — and got it published in some Lahore newspapers. According to Hafeez Khan this was not the truth, and to the contrary, Khurram used to praise the progressive writers' works and did not oppose their ideology-, Khurram started his literary career as a Persian poet which was once the official language of the state of Bahawalpur. Persian was replaced by Urdu under the instruction of the British rulers who had introduced Urdu as the second official language in Punjab.

The family's fortunes fell after the death of Khurram's grandfather Haji Ali Ahmad Khan, the qazi of Bahawalpur City. Now Khurram had to fend for himself. He first served as an octroi clerk at a monthly salary of RslS. Because of his mercurial nature he left the job before long to teach prisoners at the local jail. From there he went to Abbasia school, Ahmadpur Sharqia, as a teacher at a monthly salary of Rs50, came back to Bahawalpur to serve at theTausha Khana and then served at the Chief Court. He was offered a teaching job for RsSOO a month in South

Rediscovering Khurram Bahawalpuri

KHURRAM BAHAWALPURIby Hafeez Khan; pp 400; price Rs375 (hb); Publishers Seraiki Adabi Majlis, Bahawalpur.

NASEERUDDIN Khan Khurram Bahawalpuri is a famous name in the literary history of Bahawalpur. He was ten years junior to great Khwaja Farid. This book refers to no meeting between the two giants. Khurram lived for another 50 years after the death of Khwaja Farid.

Khurram was the son of Maulvi Muhammad Hasan, a scholar and teacher of Persian and Arabic. Maulvi Hasan's father Ali Ahmad Khan Rind Baloch did not accept his son's income from teaching, saying knowledge was a commodity and could not be sold under any circumstances. Ali Ahmad himself was a carpet merchant at Dera Ghazi Khan but shifted to Ahmadpur Sharqia, a settlement close to Dera Nawab Sahib — the headquarters of the then nawabs of the state of Bahawalpur. In time, the nawab appointed him as qazi (judge) of Bahawalpur City.

Khurram was born in Ahmadpur, as incidentally was the compiler of this book, Hafeez Khan, who accuses the Seraiki scholars of criminally ignoring the great Bahawalpuri poet and his literary legacy. It is said that two Bahawalpuri poets, Maulvi Lutf Ali Bahawalpuri and Khurram have been constantly ignored by the Multan-based organisations and scholars. Hafeez's complaint perhaps has its basis in these attitudes.

Lughat and Farid Fehmi ka Mud'aa). Hafeez has raised some pinching questions. Why was it that Farid's Diwan or poetry could not attract the attention of the Seriaki's men of letters and political and cultur-al leaders form 1901 till 1944 when his poetry was for the first time published under the order of the Nawab of Bahawalpur? A journalist from Hafizabad, Diwan Singh Maftoon - editor of weekly 'Riasat' - had asked the Nawab to publish Farid's poetry hitherto ignored by the writers and the intellectuals of the area.

The political reason could be that the area was infested with the pre-British chiefs, pirs and biradari heads and Farid had openly advised the Nawab to get rid of the British ruling in his area and re-arrange the system along pro-people lines.

اپنے ملک کوں آپ وساتوں
پٹ انگریزی تھانے

Hafeez Khan further says that Farid had owned the tradition of the Chishti and Qadri mystics like Baba Farid, Shah Husain, Bulleh Shah, Shah Latif Bhitai and Sachal Sarmast who were all rebels of their times. They were deadly against the ruling elite and their way of governance. When Farid says, Apney mulk koon aap ~wasa toon... .that means he was not happy with the system prevailing that time. Therefore, there was no need for the f eudals of the area to pay attention to Farid and his poetry and thoughts.

Hafeez says that Farid's thoughts were forgotten because they demanded a radical change which did not suit the ruling families of that period, who had sided with the British till 1940. But wherever the meanings of Farid's poetry could be used to perpetuate the status quo, the vested interests exploited Farid. Hafeez has rightly pointed out that Farid's revolutionary thinking should not be forgotten.

****

(Daily DAWN. September 7, 2008)

The publication aims to give representation to those genuine writers who live far away from the literary centres and are not properly accommodated in the publications issued from the big cities. Thus verse and prose writings of more than 270 writers from all over the country have been accommodated in this anthology which somehow proves that we have no writer of Kashmiri language in Azad Kashmir or Pakistan. The northern areas also go unrepresented.

Anyhow it is a good effort to satisfy those who claim with pain that they are not being given due place in literary magazines published from major cities. But they themselves and the "academy must not forget to mention that most of the major poets and fiction writers and intellectuals settled in big cities came from the suburbs and all the great Punjabi poets (and also Sindhi, Balochi and Pushto) did not belong to big cities.

For instance, Lahore before and after partition was the place where great writers of that peri-/ od emerged from the suburbs.) Krishan Chandar (Wazirabad), Rajinder Singh Bedi (Daska),| Saadat Hasan Manto (Amritsar), j Yousuf Zafar (Gujranwala),!

Amrita Pritam (Gujranwala), Dr Faqir Muhammad (Gujranwala), Qateel Shifai (Haripur Hazara), Sahir Ludhianvi (Ludhiana), Prof Mohan Singh Mahir and Dr Mohan Singh Diwana (Rawalpindi). None of them was Lahori. Iqbal was from Sialkot, Ahmad Nadeem Qasmi from Khushab and Faiz Ahmad Faiz from Sialkot. Most of the Zinda Dilan-i-Lahore happened to be outsiders. So it is this aspect which should not be forgotten by

Punjabi those who from suburbs exaggerate their claims or grievances. Same is the case of prominent journalists of that period^ / The anthology includes criticle essays also of which one is about Khwaja Farid by Hafeez Khan (Bahawalpur-Multan). The title is Dictionary of Vested Interests and the Purpose of Comprehending Farid' (Mufadaat ki

Farid and vested interests

ADABIYAT ... Quarterly magazine of the Pakistan Academy of Letters; pp 606; price Rs50 (pb); editors Dr Rashed Hameed and Muhammad Asim Butt; published from H-8-1, Islamabad.

THIS is a special issue in which writers from the rural and small urban areas other than the major cities like Lahore, Karachi and Islamabad have been accommodated. They represent dialects and languages, including Sindhi, Pushto, Balochi and Punjabi plus its dialects Potshard, Seraiki, Hindko and Gojri. Punjab could be further divided into Lehnda, Jhangoohi, Pahari etc. That would mean that Punjabi is very rich with so many dialects while other regional languages have no dialects etc. But the fact is that Balochi spoken in the western parts of Balochistan is not immediately understood by the Baloch from the east.

Strange are the tactics of the linguists with vested interests." Punjab is the only province which has single classical language with many dialects while all the other provinces have at least two or more than two languages. For instance, the NWFP which would and should be named in near future as the Pakhtoonkhwa has Pushto, Hindko, Seraiki, Chitrali and Gojri. Gojri, Seraiki and Hindko belong to the same family and the best proof is the TV channels of the Seraiki and Punjabi. There one finds immense com-monalities between languages. The academy should try to find and promote the commonalities of the dialects and languages as was done by the Urdu Science Board which had published a seven-language dictionary in the good old days.

ENGLISH ARTICLES

بیسویں صدی کے وسطِ ثانی کے جن عشروں میں وادیءِ سندھ کی تہذیبی، تاریخی، ثقافتی و ادبی شعور اور تحریک نے نمو پائی وہیں سے حفیظ خان کے فن و شخصیت کے مزاج کا خمیر اٹھا ہے۔ اسی وادی کے مرکزی سرائیکی خطے کی ارضِ مادر سے یکجہتی اُسے علمی و ادبی صنفی ہمہ جہتی کی طویل مسافت کی جانب لیتی چلی گئی۔ اپنی زمین ہی سے حفیظ خان نے زمینی رنگ و آہنگ کشید کرنے کا ہنر حاصل کیا اور سرائیکی اصنافِ ادب، ڈرامے، کہانی، نثر، تنقید و تحقیق اور اب تاریخ میں بھی وہی ہے جو زمین زاد کو اس کی اپنی سانولی دنیا میں واپس گھر آتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ ہزاروں برس کی یہ بیرونی و اندرونی حملہ آوروں کے گھوڑوں کے سُموں تلے مسلسل کچلی اور پٹی ہوئی مگر تا حال زندہ وادی کا نوحہ جاں خلقِ بے زور کے لبوں سے لفظ اور کلام کی صورت اس کے افسانہ، ڈرامے کے کرداروں سے عیاں تو تھا ہی اب اس کی تنقید، تحقیق اور تاریخ سے بھی ہویدا ہے۔ اسے امید ہے کہ اس کے ادبی، نسوانی کردار ایک روز عدالتِ عالم میں ماضی اور حال کا نامہءِ الم ہاتھوں میں لئے شہادتِ استقبال ثابت ہوں گے۔ اور اس کے علمی تحقیقی اور تاریخی انکشافات شاہ زادوں سے فزوں تر زمین زادوں کو ملکیت ایمان و ایقان حاصل کرنے میں ممد بھی ثابت ہوں گے۔ حفیظ خان کے ظاہر میں فن اور تحقیق بظاہر جدا گانہ مگر بباطن یگانہ و یکجان کیوں اور کیسے ہیں؟ اس کا اندازہ شاید اقوامِ محروم و محکوم ہی کے افراد کر سکتے ہیں کہ عدل و منصفیِ حشر کی متقاضی نہیں ہوا کرتی۔ فن و تحقیق فی الاصل دل اور دنیا کے باہم کلام کرتا ہے۔ فن کہیں اہل دل اور تحقیق کہیں اہل دنیا کے درِ انصاف پر دستک کا منصب بھی ہے۔ حفیظ خان یقیناً اپنے سپہ گر آباء کی طرز پر ہر دو محاذ و مقام پر موجود رہنا چاہتا ہے۔ اُسے خبر ہے کہ صدیوں پہلے اسکے اجداد سرزمین ملتان کے دفاع میں بصورتِ مظفر خان شہید ہوئے اور باقی ماندگان نواحِ اُوچ جا بسے۔ اب کی بار وہ اپنے لفظ و حکمت سے لیس واپس ملتان آ چکا ہے۔ مگر اس دولتِ ایمان کے ساتھ کہ تاریخ ہمیشہ تو اپنے آپ کو نہیں دہراتی۔

شمیم عارف قریشی

ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ

62/B سخی سلطان کالونی، سورج میانی روڈ ملتان

E-mail:drawar_1@yahoo.com